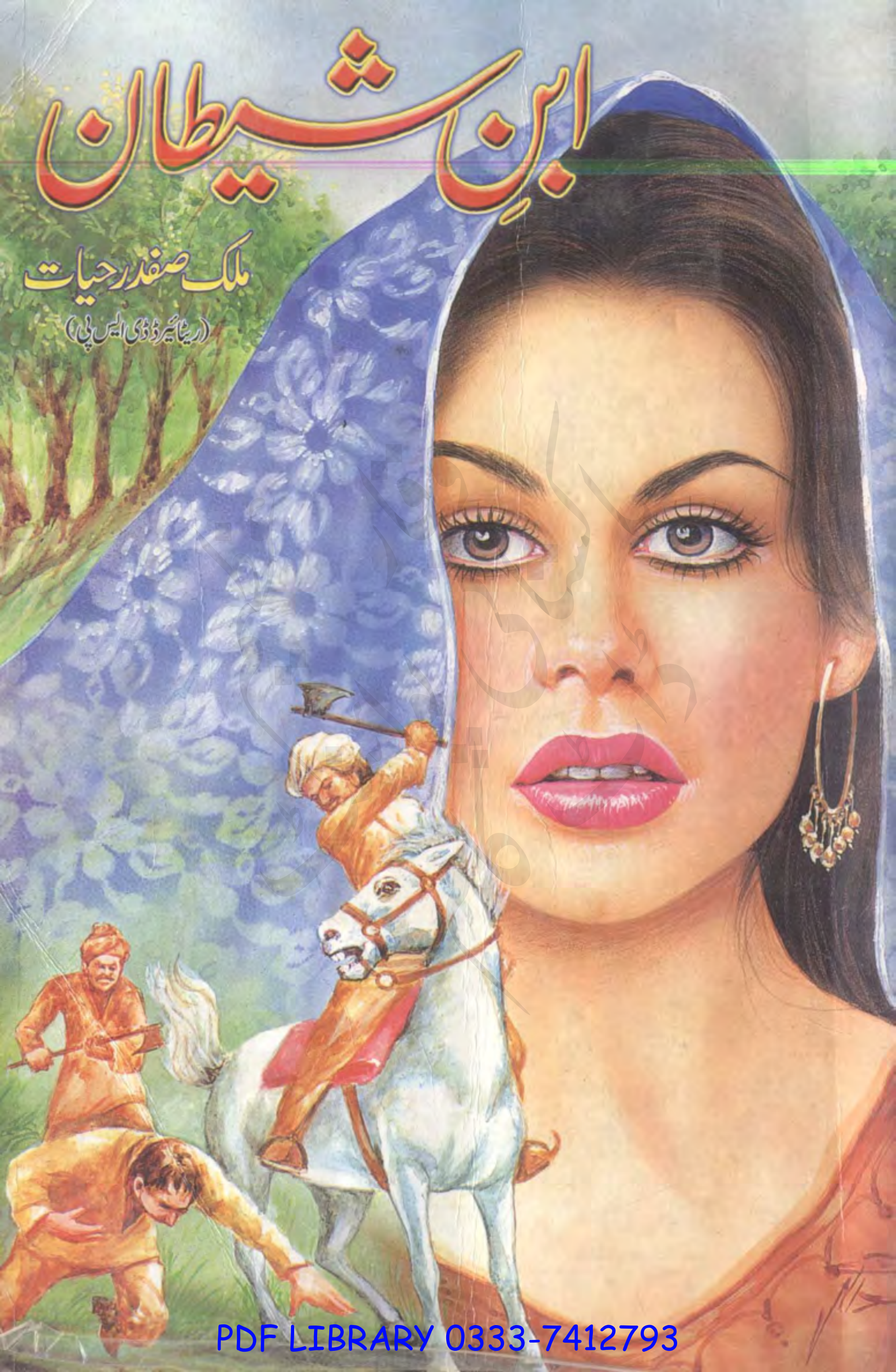

PDF LIBRARY 0333-7412793

ترتیب

دیا سلائی ______ 5

ابنِ شیطان ______ 69

ٹیڑھی اینٹ ______ 126

میٹھی چھری ______ 188

PDF LIBRARY 0333-7412793

دیا سلائی

ان دنوں این جی اوز وغیرہ کا ذکر دور دور تک سننے کو نہیں ملتا تھا۔ البتہ مختلف سماجی ادارے انفرادی یا اجتماعی طور پر معاشرتی فلاح و بہبود کی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ ان کے مقاصد کا تعلق زیادہ تر صحت و تعلیم سے ہوتا۔ ماہرین کی چھوٹی بڑی ٹیمز نگر نگر گھوم کر عوام میں شعور اور آگاہی کو اجاگر کرتیں۔ عموماً ان لوگوں کی توجہ کے مراکز دور دراز کے گاؤں دیہات اور چھوٹے قصبات ہوتے کہ ایسی جگہوں پر تعلیم اور صحت سے متعلق آگاہی بڑھانے کی زیادہ ضرورت ہوتی تھی ...... اور آج تک یہی صورتِ حال ہے۔

یہ ساٹھ کی دہائی کے ابتدائی سالوں کا ذکر ہے۔ میں ضلع شیخوپورہ کے ایک قصبے میں تعینات تھا۔ مذکورہ قصبے کے مین بازار میں کچھ عرصہ پہلے کسی لیڈی ڈاکٹر نے اپنا کلینک کھولا تھا۔ کلینک کھولنا یا کلینک کھل جانا کوئی عجیب یا غیر معمولی بات نہیں تھی تاہم اس کلینک سے متعلق گاہے بہ گاہے مجھ تک جو خبریں پہنچ رہی تھیں وہ قابل غور بلکہ قابل کارروائی تھیں۔ اس کلینک کی مالک کا نام ڈاکٹر عطیہ چوہان تھا اور کلینک کی پیشانی پر ''عطیہ فلاحی کلینک'' کا بورڈ آویزاں تھا۔ دو چار مرتبہ مجھے اس کلینک کے سامنے سے گزرنے کا اتفاق ہوا تھا اور مذکورہ بورڈ پر بھی میری نگاہ پڑی تھی۔ ڈاکٹر نے لفظ ''فلاحی'' کو خاصا جلی اور بریکٹ میں لکھوا رکھا تھا جیسے وہ ڈاکٹر کے بینر تلے سماجی فلاح کا ایک عظیم الشان مرکز قائم کئے بیٹھی ہو۔

ڈاکٹر عطیہ چوہان اور اس کے کلینک سے متعلق پہلی شکایت کلینک کھلنے کے تین ماہ بعد مجھ تک پہنچی۔ شاکی عورت اسی علاقے کی ایک دائی تھی۔ اس کا نام بشیراں تھا۔ دائی بشیراں ایک ہٹی کٹی اور سانولی عورت تھی۔ اس کی عمر پینتالیس کے قریب رہی گی۔

میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلا لیا اور اس کی آمد کی غرض و غایت دریافت کی۔

''ہاں بھئی بشیراں! تمہارا کیا مسئلہ ہے؟''

PDF LIBRARY 0333-7412793

"مسئلہ میرا نہیں، اس پورے قصبے کا ہے ...... بلکہ قصبے کی عورتوں کا ہے۔" وہ بڑے پراسرار اور سنجیدہ لہجے میں گویا ہوئی۔ "اگر آپ نے اس کا کوئی توڑ نہ کیا تو بڑی تباہی مچے گی تھانے دار صاحب! رب دی سوں (قسم) میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔"

اس کی بات ذرا میرے پلے نہ پڑی مگر اس کی سنجیدگی اور تشویش کو دیکھتے ہوئے میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور دائی بشیراں سے پوچھا۔

"میں کس کا توڑ کروں ...... کون تباہی مچانے والا ہے؟"

"نہ، آپ کو کچھ پتہ نہیں؟" اس نے متعجب نظر سے مجھے دیکھا۔

وہ بے یقینی سے میری صورت کو تکتے ہوئے بولی۔ "میں اس پر کٹی چھمک چھلو لیڈی ڈاکٹر کی بات کر رہی ہوں ...... وہ جس نے ادھر مین بازار میں اپنا کلنک کھول رکھا ہے، کیا نام ہے اس منحوس کا ......" اس نے سوچنے والے انداز میں اپنی پیشانی کو مسلا اور بولی۔

"ڈاکٹر عطیہ چوہان!"

دائی بشیراں نے ڈاکٹر عطیہ کو پر کٹی شاید اس لئے کہا تھا کہ مذکورہ ڈاکٹر نے سر کے بال بوائے کٹ بنوا رکھے تھے۔ اس زمانے میں عورتوں کے بال کٹوانے کا رواج عام نہیں ہوا تھا اور گاؤں دیہات میں تو اس فعل کو گناہ تصور کیا جاتا تھا۔ خیر میں نے دائی بشیراں کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"بشیراں! ڈاکٹر عطیہ نے کلنک نہیں کھولا بلکہ کلینک کھولا ہے۔" اس نے تلفظ کے حوالے سے بھی "کلنک" ہی بولا تھا اس لئے میں نے وضاحت ضروری سمجھی۔ کلنک اور کلینک کا فرق اس پر واضح ہوا تو وہ جوش بھرے لہجے میں بولی۔

"دیکھیں تھانے دار جی! اللہ توکل اور خود بہ خود زبان سے جو نکل جائے وہی درست ہوتا ہے۔ آپ سمجھیں کہ اس ڈاکٹرنی نے کلنک ہی کھولا ہے۔ بڑا گند پھیلا رہی ہے وہ جی!"

بات کے اختتام پر اس نے ایسا منہ بنایا جیسے اچانک اور بے خبری میں اس نے کوئی کڑوی شے چبا لی ہو۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"تمہیں ڈاکٹر عطیہ سے کیا شکایت ہے؟"

اس نے خاصا گھماؤ دار جواب دیا۔ "تھانے دار جی! مجھے کیا شکایت ہو گی۔ میں تو اس علاقے کی بے خبر عورتوں کا کیس لے کر آپ کے پاس پہنچی ہوں۔ یہ جو ڈاکٹر عطیہ ہے نا! یہ پیدائش کے پردے میں ان سے بڑی زیاستی (زیادتی) کر رہی ہے۔ یہ بڑا خطرناک

منصوبہ لے کر ہمارے قصبے میں آئی ہے۔ مجھے تو یہ انگریزوں کی ایجنٹ لگتی ہے۔"

بشیراں دائی کی باتیں خاصی الجھی ہوئی تھیں۔ شاید اسے مدعا بیان کرنے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا۔ میں ابھی تک اس کے مطمعٔ نظر تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اس کو راہِ راست پر لانے کے لئے میں نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

"بشیراں! ذرا وضاحت سے مجھے بتاؤ کہ لیڈی ڈاکٹر اس قصبے کی عورتوں کے ساتھ کس قسم کی زیادتی کر رہی ہے؟ تم نے پیدائش کا حوالہ کیوں دیا ہے؟"

وہ افسوس ناک نظر سے مجھے دیکھنے لگی، پھر ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولی۔ "اب مجھے یقین ہو گیا کہ آپ ڈاکٹر عطیہ اور اس کے کرتوتوں کے بارے میں واقعی کچھ نہیں جانتے۔"

میں خاموشی سے اس کے مزید بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ "تھانیدار جی! ڈاکٹر عطیہ بچوں اور عورتوں کا علاج کرتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ پیدائش کے کیس بھی لیتی ہے۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا؟"

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں اس کا اشارہ واضح طور پر سمجھ گیا تھا۔ پیدائش کے کیس سے اس کی مراد ڈیلیوری کیس تھی۔ میں نے اثبات میں گردن ہلائی تو اس نے کہا۔

"تھانے دار جی! بچوں اور عورتوں کا عام علاج تو ایک بہانہ ہے، اس آڑ میں وہ اپنے منصوبے پر عمل کر رہی ہے۔ آپ نے اگر اسے روکا نہیں تو بہت غلط ہو جائے گا۔"

میں نے پوچھا۔ "تم نے عورتوں کے پیدائش والے معاملے پر خاصا زور دیا ہے لیکن ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ ڈاکٹر عطیہ اس سلسلے میں کیا گڑبڑ پھیلا رہی ہے؟" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے ڈاکٹر کو انگریزوں کی ایجنٹ کہا ہے۔ یہ کیا قصہ ہے؟"

اس نے تھوڑا تامل کیا پھر سمجھانے والے انداز میں بولی۔ "آپ نے شاید اس ڈاکٹر کو دیکھا نہیں، بالکل مردوں والا حلیہ بنا رکھا ہے۔ کبھی تو پتلون بھی پہن لیتی ہے۔ بال بھی مردوں کی طرح کٹوا رکھے ہیں۔ میں نے دیکھا تو نہیں، سن رکھا ہے کہ انگریز عورتیں اسی حلیے میں رہتی ہیں......"

"انگریزوں جیسا حلیہ بنانے سے انسان انگریزوں کا ایجنٹ کیسے ہو جاتا ہے؟" میں نے اس کی بات کاٹ کر استفسار کیا۔

PDF LIBRARY 0333-7412793

"آپ مجھے بتانے تو دیں۔ میں اسی طرف آ رہی تھی۔" وہ اپنے ہاتھ کو مخصوص انداز میں حرکت دیتے ہوئے بولی۔ "آپ جانتے ہیں انگریز مسلمانوں کے پرانے دشمن ہیں۔ وہ انہیں بڑھتا اور پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتے۔ ایک گہری سازش کے تحت وہ مسلمانوں کی نسل کو آہستہ آہستہ گھٹا کر بالکل ہی ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹرنی کو میں نے انگریزوں کی ایجنٹ اس لئے کہا ہے کہ یہ اس منصوبے میں ان کا ہاتھ بٹا رہی ہے۔"

وہ چند لمحات کے لئے متوقف ہوئی اور تائید طلب نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ جب میں خاموش رہا تو دائی بشیراں نے آگے بتانا شروع کیا۔

"تھانے دار جی! یہ ڈاکٹرنی جن عورتوں کے بچے پیدا کروا رہی ہے ان کے ساتھ کچھ ایسا کر دیتی ہے کہ آئندہ وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ رہیں ...... یہ قصبے کی عورتوں کو بانجھ بنا رہی ہے۔"

دائی بشیراں ایک عجیب وغریب انکشاف کر رہی تھی۔ اس کے بیان سے میری دلچسپی لامحالہ بڑھ گئی۔ وہ ایک نیا آئیڈیا بیان کر رہی تھی۔ اس زمانے میں "فیملی پلاننگ سسٹم" ابھی متعارف نہیں ہوا تھا۔ خاندانی منصوبہ بندی کا شہرہ ستر کی دہائی میں سننے میں آیا تھا۔ دائی بشیراں قبل از وقت ایک منفرد سوچ پیش کر رہی تھی۔

میں نے فکر انگیز لہجے میں کہا۔ "یہ تو بڑی تشویش ناک بات ہے۔ اگر ڈاکٹر عطیہ چوہان ایسا کر رہی ہے تو پھر اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنا پڑے گی۔"

"یہی نہیں۔" وہ جزبز ہوتے ہوئے بولی۔ "یہ ڈاکٹرنی اس سے آگے بڑھ کر بھی بہت کچھ کر رہی ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

اس کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے وہ ہچکچا رہی ہو، شرما رہی ہو۔ میں نے اپنا سوال دہرایا۔ وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔

"تھانے دار جی! شرع میں کیا شرم اور پھر آپ تو اس علاقے کے تھانے دار ہیں، اگر میں آپ کو پوری بات نہیں بتاؤں گی تو آپ انصاف کیسے کریں گے۔"

"کیا اب تم کوئی شرعی مسئلہ بیان کرنے والی ہو؟"

"بس جی، کچھ ایسی ہی بات ہے۔"

"تو پھر شرم کو بالائے طاق رکھو اور مجھے مسئلہ بتاؤ۔" میں نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔

چند لمحات کی سوچ بچار کے بعد اس نے نہایت ہی محتاط الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ لیڈی ڈاکٹر عطیہ چوہان مانع حمل یعنی ابارشن وغیرہ کے کیس بھی لے رہی تھی۔ ساٹھ کے ابتدائی سالوں میں ابارشن، اسقاط اور فیملی پلاننگ کا کم از کم پاکستان میں، خصوصاً دیہاتوں میں کوئی تصور نہیں تھا۔ دائی بشیراں جو کچھ بتا رہی تھی وہ حیرت انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ تشویش ناک بھی تھا۔ میرے لئے یہ ایک طرح سے نئی معلومات تھیں۔

میں نے پوری توجہ سے دائی بشیراں کی بات سنی اور گہری سنجیدگی سے کہا۔ "تم نے جو کچھ بتایا ہے وہ بہت ہی خطرناک اور قابل دخل اندازی پولیس ہے۔ مگر کسی قسم کی قانونی کارروائی کرنے کے لئے مجھے کچھ ثبوت چاہئے ہوں گے اور اس سلسلے میں تم میری مدد کرو گی۔"

"آپ کو کیسے ثبوت چاہئیں تھانے دار جی؟" وہ اُلجھی ہوئی نظر سے مجھے تکنے لگی۔

میں نے رسانیت سے کہا۔ "کیا تم ان عورتوں میں سے ایک دو کو گواہی دینے پر آمادہ کر سکتی ہو جن کے ساتھ بہ قول تمہارے ڈاکٹر عطیہ نے کوئی اونچ نیچ کر دی ہے؟"

وہ تذبذب کا شکار دکھائی دینے لگی۔ میں نے اضافہ کرتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "دیکھو بشیراں! قانون کو کام کرنے کے لئے عوام کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم اس وقت تک کسی بھی جرم کی بیخ کنی نہیں کر سکتے جب تک عوام ہمارا ساتھ نہ دے۔ عدالت بھی ٹھوس ثبوت کے بغیر کسی ملزم کو سزا نہیں سناتی۔ تم میرا مطلب سمجھ رہی ہو نا؟"

وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ "جی تھانے دار صاحب! میں کوشش کرتی ہوں۔"

پھر وہ مجھے سلام کر کے تھانے سے رخصت ہو گئی۔

※☆※

اس واقعے کے پندرہ بیس روز بعد میں ایک صبح تھانے پہنچا تو میں نے برآمدے میں دائی بشیراں کو دو عورتوں کے ساتھ محوِ انتظار پایا۔ میں یہی سمجھا وہ اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لئے دو گواہ پکڑ لائی ہے۔ مجھے لیڈی ڈاکٹر کے معاملے سے دلچسپی پیدا ہو چکی تھی لہٰذا میں نے انہیں فوراً اپنے کمرے میں بلا لیا۔

انہوں نے باری باری مجھے سلام کیا اور میرے اشارے پر میز کے سامنے بچھی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ میں بشیراں کے ساتھ آنے والی عورتوں کا جائزہ لینے لگا۔ ان میں سے ایک دبلی پتلی اور گندمی رنگت والی تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے تیس کے اریب قریب لگایا۔

PDF LIBRARY 0333-7412793

دوسری عورت متناسب بدن کی مالک سیاہ رو تھی۔ اس کی عمر پچاس سے متجاوز نظر آتی تھی۔

میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ بشیراں ان عورتوں کو ساتھ لے کر آئی ہے جو ڈاکٹر عطیہ کے ہاتھوں کسی بھی طور متاثر ہوئی ہیں۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بشیراں سے پوچھا۔ ''کیا ثبوت کے طور پر تم انہیں اپنے ساتھ لائی ہو؟''

''یہ دونوں پکی گواہ ہیں جی۔'' وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولی۔

میں نے باری باری ان دونوں عورتوں کو دیکھا اور استفسار کیا۔ ''تمہارے ساتھ ڈاکٹر عطیہ نے کون سا برا سلوک کیا ہے؟''

میرا سوال سن کر وہ چونک اٹھیں اور ہچکچاہٹ بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ پھر ان کی معنی خیز نگاہیں دائی بشیراں کی سمت اٹھ گئیں۔

بشیراں نے کہا۔ ''تھانے دار جی! آپ کو ان کے بارے میں غلط فہمی ہو رہی ہے۔ ٹھہریں، میں ان دونوں کا تعارف کروا دیتی ہوں۔''

میں خاموشی سے یکے بعد دیگرے ان تینوں کی صورتیں دیکھنے لگا۔ پتہ نہیں بشیراں کون سی غلط فہمی کا ذکر کر رہی تھی۔ اس کی وضاحت کے بعد ہی کوئی بات سامنے آ سکتی تھی!

دائی بشیراں نے دھان پان گندمی رنگت والی عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''یہ دائی کبوتری ہے۔ اس کو خود بھی پتہ نہیں کہ اس کا اصلی نام کیا ہے۔ بس کبوتری دائی کے نام سے مشہور ہے۔ اس مشہوری کی وجہ یہ ہے کہ کبوتری اپنے کام میں بہت پھرتیلی ہے، یہ بڑی سہولت سے کیس کر لیتی ہے۔ کہتے ہیں ادھر کبوتری نے زچہ کو ہاتھ لگایا، ادھر بچہ دنیا میں آیا۔ بچے پیدا کروانے کا بیس سالہ تجربہ ہے اس کے پاس......''

''ایک منٹ۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ دائی کبوتری کم عمری ہی سے اس پیشے میں آ گئی تھی؟ اس کی عمر تیس سے زیادہ تو نہیں لگتی۔''

''یہی تو کمال ہے تھانے دار جی!'' دائی بشیراں ہاتھ لہراتے ہوئے بولی۔ ''کبوتری اپنی پھرتی اور کاٹھی کی وجہ سے تیس سے زیادہ کی نظر نہیں آتی جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ اللہ کی بندی چالیس سے اوپر کی ہے۔ اکثر لوگوں کو اس کے بارے میں دھوکا ہو جاتا ہے!''

واقعی بشیراں بالکل درست کہہ رہی تھی۔ اس دھوکے کی ایک مثال تو میں خود ہی تھا۔ کبوتری کی عمر کا اندازہ لگانے میں مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔

بشیراں نے دوسری عورت کا نام حنیفاں بتایا۔ پیشے کے اعتبار سے وہ بھی ایک دائی ہی تھی۔ سیاہ رو حنیفاں کی عمر واقعی پچاس کے لگ بھگ تھی۔ ایک بات کا اور بھی پتہ چلا کہ حنیفاں کی بینائی خاصی کمزور تھی تاہم وہ اپنے طویل تجربے کی بنا پر ڈیلیوری کیس بہت آسانی سے کر لیتی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دائی بشیراں اپنی ہی قبیل کی دو عورتوں کو میرے پاس کیوں لائی تھی۔ میں نے اس سے سوال کرنا ضروری سمجھا۔

''بشیراں! یہ کبوتری اور حنیفاں کس سلسلے میں یہاں آئی ہیں؟ میں نے تو تمہیں لیڈی ڈاکٹر عطیہ کے خلاف گواہ لانے کو کہا تھا؟''

''یہ دونوں اس ڈاکٹرنی کے خلاف گواہی دینے کو تیار ہیں۔'' بشیراں سنجیدگی سے بولی۔ ''میری طرح یہ بھی ڈاکٹرنی کے کرتوتوں سے پوری طرح واقف ہیں۔''

بادی النظر میں مجھے وہ معاملہ دائیوں کا گٹھ جوڑ لگا۔ میں نے بڑے کھلے الفاظ میں ان پر واضح کرنے کی کوشش کی۔

''آپ لوگ جو کچھ بھی کہہ رہے ہو وہ قانون کی زبان میں ڈاکٹر عطیہ پر عائد کردہ ایک الزام ہے یا متعدد الزامات ہیں۔عدالت کسی ملزم کو سزا دینے کے لئے ٹھوس ثبوت مانگتی ہے ...... اس کے جرم کی شہادت پیش کرنا پڑتی ہے عدالت میں۔ تب کہیں جا کر کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ ان خالی خولی باتوں سے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔''

''ہم خالی خولی باتیں نہیں کر رہے تھانے دار جی!'' کبوتری نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں ایسی تین عورتوں کو جانتی ہوں ...... میں کیا، یہ دونوں بھی ان عورتوں سے واقف ہیں جو ڈاکٹرنی کی زیادتی کا شکار ہوئی ہیں۔'' ذرا توقف کر کے کبوتری نے بشیراں اور حنیفاں کو دیکھا پھر میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔

''ان تین بدنصیب عورتوں کے نام صغراں، بلقیس اور زرینہ ہیں اور وہ اسی قصبے کی رہنے والی ہیں۔''

کبوتری کے بیان نے میری دلچسپی کو اور بڑھا دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''ڈاکٹر عطیہ چوہان نے ان عورتوں کے ساتھ کیا، کیا ہے؟''

وہ ایک طویل سانس خارج کرنے کے بعد تفصیل بتاتے ہوئے بولی۔ ''تین ماہ پہلے صغراں نے ڈاکٹرنی کے کلنک پر ایک بچے کو جنم دیا تھا۔ چند دن کے وقفے سے بلقیس کی بچی بھی اسی ڈاکٹرنی کے ہاتھوں پیدا ہوئی۔ وہ دن اور آج کا دن ...... ابھی تک ان دونوں کی دوبارہ گود بھرنے کے امکانات پیدا نہیں ہوئے۔ مجھے یقین ہے، اس شیطان ڈاکٹرنی

PDF LIBRARY 0333-7412793

نے پیدائش کے عمل کے دوران میں ان دونوں کے ساتھ کوئی ہاتھ کر دیا ہے۔''

وہ چند لمحے کو رکی پھر اس کی زبان جاری ہوگئی۔ مگر اب بتانے کا انداز خاصا رازدارانہ تھا۔ ''یہ جو زرینہ ہے نا ...... اس کے بارے میں مجھے پتہ چلا ہے، حمل ختم کروانے ڈاکٹرنی کے کلنک گئی تھی۔ تھانے دار جی! یہ تو سیدھا سیدھا قتل ہوا نا؟''

بات کے اختتام پر اس نے مجھ سے سوال کر ڈالا تھا۔ میں اس کے سوال کا کیا جواب دیتا! اس کا تو پورا بیان ہی مجھے مبنی بر حماقت نظر آ رہا تھا۔ صغراں اور بلقیس تین ماہ پہلے ڈاکٹر عطیہ کے کلینک پر زچگی کے عمل سے گزری تھیں۔ اگر دوبارہ ان کے ماں بننے کے آثار نمودار نہیں ہوئے تھے تو اس میں بے چاری ڈاکٹر عطیہ کا کیا قصور تھا؟ اور جہاں تک زرینہ کے اسقاط کا تعلق تھا تو اگر واقعی اس میں کوئی حقیقت تھی تو پھر ڈاکٹر عطیہ کو مورد الزام ٹھہرانا درست نہیں تھا۔ ڈاکٹر عطیہ نے زبردستی پکڑ کر زرینہ کو اس عمل سے تو نہیں گزارا ہوگا۔ وہ اپنی کسی مجبوری یا ضرورت کے تحت ہی اس کے کلینک تک گئی ہوگی!

اب مجھے واقعی یقین ہونے لگا کہ ان تین دائیوں نے باہمی گٹھ جوڑ سے لیڈی ڈاکٹر عطیہ کے خلاف محاذ بنا لیا تھا۔ ''عطیہ (فلاحی) کلینک'' نے روایتی دائیوں کا دھندا متاثر کیا تھا اور یہ بات بعید القیاس نہیں تھی کہ وہ تینوں ڈاکٹر عطیہ سے دشمنی پر اتر آئی ہوں!

یہ تمام اندازے اور حالات اپنی جگہ، وہ تینوں اس وقت ایک فریاد لے کر میرے پاس آئی ہوئی تھیں لہٰذا مناسب طریقے سے ان کی بات سننا اور ہر ممکنہ تسلی تشفی فراہم کرنا میرا فرض بنتا تھا۔ میں نے کبوتری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، تھوڑی دیر کے لئے میں مان لیتا ہوں کہ تم تینوں ڈاکٹر عطیہ کے خلاف بالکل ٹھیک شکایت کر رہی ہو۔ مجھے بتاؤ تم مجھ سے اس سلسلے میں کیا چاہتی ہو؟''

بشیراں نے ان کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا۔ ''ظاہر ہے ہم تو یہی چاہیں گے آپ ڈاکٹرنی کے خلاف قانونی کارروائی کریں۔ یہ شریفوں کا قصبہ ہے، یہاں اس قسم کے بے ہودہ اور آوارہ کلنک کی ضرورت نہیں۔ آپ فوری طور پر اس ڈاکٹرنی کا کلنک بند کروائیں۔''

بشیراں کے لب و لہجے میں ڈاکٹر عطیہ کے لئے نفرت ہی نفرت تھی۔ آخر اس کے دل کی بات زبان پر آ ہی گئی تھی۔ وہ لوگ پہلی فرصت میں ڈاکٹر عطیہ کو وہاں سے چلتا کر دینا چاہتے تھے۔

کبوتری نے بشیراں کے موقف میں زور بھرتے ہوئے کہا۔ ''آپ ہی بتائیں ملک صاحب! ڈاکٹرنی کے آنے سے پہلے کیا اس قصبے کی عورتیں بچے پیدا نہیں کرتی رہیں؟''

''ہم نے درجنوں، سینکڑوں بچے پیدا کروا دیئے۔'' حنیفاں نے ناراضگی سے کہا۔ ''میرے ہاتھوں سے ان گنت بچے اس دنیا میں آئے ہیں۔ بعض تو اب خود بچوں والے ہو گئے ہیں۔ میں دو نسلوں کی دائی ہوں۔ یہ آنکھیں ایسے ہی اندھی نہیں ہو رہیں!''

بشیراں نے تلخی سے کہا۔ ''اور وہ ڈاکٹرنی جمعہ جمعہ آٹھ دن سے اس قصبے میں آئی ہے اور یہاں کی چودھرائن بن بیٹھی ہے، ہم اسے ہرگز برداشت نہیں کر سکتے۔''

ان تینوں کے حتمی اور ٹھوس الفاظ نے ان کے عزائم مجھ پر واضح کر دیئے۔ انہوں نے واقعی ڈاکٹر عطیہ کے خلاف ایک مضبوط محاذ بنا لیا تھا۔ میں نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

''اس کلینک کے کھلنے سے آپ لوگوں کا روزگار تو متاثر ہوا ہوگا؟''

''بہت بری طرح۔'' وہ بہ یک زبان بولیں۔

میں نے تشفی بھرے انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے ...... میں ڈاکٹر عطیہ کے خلاف قانونی اقدام کرتا ہوں۔ تم تینوں ایک کام کرو۔''

وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگیں۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم کسی طرح صغراں، بلقیس اور زرینہ کو راضی کر کے میرے پاس لے آؤ۔ باقی کے معاملات میں سنبھال لوں گا۔''

وہ الجھن زدہ نگاہوں سے ایک دوسرے کو تکنے لگیں۔ بشیراں نے کہا۔ ''تھانے دار جی! یہ تو بہت مشکل ہے۔ وہ ہماری بات نہیں مانیں گی، ہمارے ساتھ تھانے آنے کو تیار نہیں ہوں گی۔ آپ خود سوچیں وہ اس قسم کی جرأت کیسے کر سکتی ہیں؟''

''میں نے خود سوچ لیا۔'' میں نے اسی کے الفاظ لوٹاتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ سمجھ میں آیا کہ جب مدعی سست ہے تو پھر گواہ کو چست ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ لوگ بھی ٹھنڈی ٹھنڈی اپنے گھروں میں بیٹھیں۔''

''جناب! یہ پورے قصبے کی عورتوں کے مستقبل کا سوال ہے۔'' کبوتری نے کہا۔

مجھے غصہ آ گیا تاہم میں نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے متحمل لہجے میں کہا۔ ''آپ تینوں نے کیا قصبے بھر کی عورتوں کے مستقبل کا ٹھیکہ لے رکھا ہے؟''

''نہ جی ......'' حنیفاں خفگی آمیز انداز میں بولی۔ ''ہم نے یہ کب کہا ہے؟''

میں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''اگر ایسا نہیں کہا تو پھر جائیں اپنا کام کریں ...... اور مجھے بھی اپنا کام کرنے دیں۔ لیڈی ڈاکٹر عطیہ چوہان اپنے سیاہ و سفید کی خود ذمے دار ہے۔ اگر اس کی کوئی غیر قانونی حرکت میری نظر میں آ گئی تو میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔

PDF LIBRARY 0333-7412793

ورنہ مجھے خواہ مخواہ کسی کو تھانے اور کچہری کے چکر لگوانے کا شوق نہیں۔''

میرا اٹل جواب سن کر ان کے منہ لٹک گئے۔ اب اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ وہ تینوں ڈاکٹر عطیہ سے کاروباری حسد میں مبتلا تھیں اور ان کے اس حسد کا فی الحال میرے پاس کوئی علاج نہیں تھا...... شاید وہم اور حسد کا علاج تو ہر دور میں ناپید ہی رہا ہے۔ حاسد اور وہمی شخص اپنے مرض کی آگ میں جل جل کر راکھ ہو جاتا ہے!

وہ رخصت ہونے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں تو کبوتری نے ایک عجیب بات کہہ دی۔

''تھانے دار جی! لگتا ہے آپ بھی ڈاکٹرنی کے ساتھ مل گئے ہیں!''

اس کے لہجے میں موجود طنز نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا، بے ساختہ میں پوچھ بیٹھا۔

''کیا کوئی اور بھی ڈاکٹر عطیہ سے ملا ہوا ہے؟''

بشیراں نے بڑے معنی خیز انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی۔ دوسری دونوں نے اس کی تائید ضروری جانی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی نہایت ہی اہم انکشاف کرنے والی ہوں۔

میں نے متذبذب لہجے میں پوچھا۔ ''کون؟''

''نادر خان!'' کبوتری نے ٹھہرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

✻☆✻

نادر خان ایک معروف کاروباری شخصیت تھا۔ پرانی غلہ منڈی میں اس کی آڑھت کی دکان تھی۔ وہ اس قصبے کا ایک صاحب حیثیت شخص تھا۔ دائی کبوتری اینڈ کمپنی نے جب نادر خان اور ڈاکٹر عطیہ کے تعلق کا ذکر کیا تو میں اس شخص کے بارے میں جاننے میں مصروف ہو گیا۔

اور اس جاننے کے نتیجے میں مجھے معلوم ہوا کہ نادر خان ڈاکٹر عطیہ کے تعلق میں تھا۔ وہ گاہے گاہے اس کے کلینک پر بھی آتا رہتا تھا اور ڈاکٹر عطیہ بھی مہینے میں ایک آدھ چکر نادر خان کی طرف لگا لیتی تھی۔ مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ عطیہ نے جس گھر میں فلاحی کلینک کھول رکھا تھا وہ نادر خان کی ملکیت تھا۔ یہ دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا گھر تھا جس کے سامنے والے کمرے میں ڈاکٹر کا دواخانہ تھا جب کہ عقبی کمرے میں اس کی رہائش تھی۔ اس رہائشی کمرے میں وہ عورتوں کو ''چیک'' بھی کرتی تھی۔ دونوں کمروں کے بیچ میں ایک چھوٹا سا صحن تھا۔

نادر خان ڈاکٹر عطیہ سے اس مکان کا کرایہ نہیں لیتا تھا اور یہ بات بھی میرے علم میں

آئی کہ نادر خان ہی ڈاکٹر عطیہ کو اس قصبے میں لے کر آیا تھا۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ نادر خان، ڈاکٹر عطیہ کی سرگرمیوں سے پوری طرح آگاہ تھا۔ اگر میں اس سے ایک بھرپور ملاقات کر لیتا تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جاتا۔

میں اپنی گوناگوں مصروفیات کے باعث نادر خان کی طرف نہ جا سکا اور اس دوران میں ڈاکٹر عطیہ کی ایک اور شکایت مجھ تک پہنچ گئی۔ اس مرتبہ سائل ایک مرد تھا۔ اس کا نام نیاز علی تھا۔ مجھے جب پتہ چلا کہ وہ ڈاکٹر عطیہ کے سلسلے میں مجھ سے ملنے آیا ہے تو میں نے فوراً اسے اپنے پاس بلا لیا۔

نیاز علی کی عمر لگ بھگ تیس سال ہو گی۔ وہ عام سی صورت شکل کا مالک ایک دُبلا پتلا شخص تھا۔ میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا۔ ''ڈاکٹر عطیہ نے تمہیں کیا نقصان پہنچایا ہے؟''

''بہت بڑا نقصان تھانے دار جی!'' وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ''سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کو کیسے بتاؤں!''

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا، نیاز علی ڈاکٹر عطیہ کے بارے میں کوئی اہم انکشاف کرنے والا ہو۔ میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔

''تم مجھے وہ سب کچھ ایسے ہی بتا دو جیسے بتایا ہے کہ عطیہ نے تمہیں بہت بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ مجھ سے ڈرنے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں۔''

اس نے قدرے ہمت پکڑی اور جزبز ہوتے ہوئے بولا۔ ''جناب! میری بیوی زبین چند ہفتوں سے ڈاکٹر عطیہ کے پاس علاج کے لئے جا رہی ہے۔ زبین کی کمر میں درد تھا۔ ڈاکٹرنی کے علاج سے وہ درد تو ٹھیک ہو گیا لیکن اب زبین کے دماغ میں درد ہونے لگا ہے۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے برا سا منہ بنایا اور اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے لگتا ہے زبین کے دماغ میں کوئی پھوڑا اٹھا ہے اور ...... اس کی ذمے دار صرف اور صرف وہی ڈاکٹرنی ہے۔''

''آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' اس کی بات نے مجھے بری طرح الجھا دیا تھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''تھانے دار جی! یہ ڈاکٹرنی میری بیوی کو الٹی سیدھی پٹی پڑھا رہی ہے۔ اس کے دماغ میں یہ زہر ڈال رہی ہے کہ شوہر سے زیادہ سے زیادہ دور رہنا چاہئے۔ اگر سدا حسین اور جوان رہنا ہے تو بچوں کا روگ نہ پالے ورنہ بچے پیدا کر کر کے وہ جوانی ہی میں بوڑھی ہو جائے گی ...... اور سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ

PDF LIBRARY 0333-7412793

ڈاکٹرنی کی باتیں زبین کی سمجھ میں آ گئی ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں یہ باتیں الٹی مت کی ہیں یا نہیں؟''

وہ ایک گمبھیر سوال پر بات ختم کر کے بڑی امداد طلب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس نے جو صورتِ حال بیان کی تھی وہ واقعی تشویش ناک تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''اور کچھ؟''

''جناب! کیا یہ کم ہے جو میں آپ کو اور کچھ بھی بتاؤں؟'' وہ احتجاجی لہجے میں بولا۔ ''یہ ازدواجی تعلق ہی تو میاں بیوی کو آپس میں مضبوطی سے جوڑے رکھتا ہے۔ یہ ایک طرح سے محبت کا مضبوط رشتہ ہے اور یہ کم بخت ڈاکٹرنی اسی اہم ترین رشتے کی دشمن بن بیٹھی ہے۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں اضافہ کیا۔

''تھانے دار جی! میں تو ایک بزدل اور شریف آدمی ہوں اس لئے فریاد لے کر آپ کے پاس چلا آیا ہوں۔ اگر ڈاکٹرنی نے کسی گرم دماغ والے خاوند کی بیوی کو یہی پٹی پڑھانا شروع کر دی تو پھر آپ کسی بھی خطرناک نتیجے کے لئے تیار رہنا۔ گرم مزاج اور غصہ ور خاوند جھنجلاہٹ میں کچھ بھی کر سکتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کی بھی ایسی کم تیسی کر سکتا ہے اور اس ڈاکٹرنی کو بھی بھرپور مزہ چکھا سکتا ہے۔''

نیاز علی کی بات میں اچھا خاصا وزن تھا۔ وہ شوہروں کے جس فطری ردِعمل کی جانب اشارہ کر رہا تھا وہ میرے لئے خلافِ توقع نہیں تھا۔ فطرت کے اصولوں کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کرنے سے بگاڑ ہی پیدا ہوتا ہے، کسی قسم کی بہتری کی توقع نہیں رکھی جا سکتی!

میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ اب لیڈی ڈاکٹر عطیہ چوہان کے سلسلے میں کوئی عملی اقدام اٹھانے کا وقت آ گیا ہے ورنہ مجھے محسوس ہو رہا تھا، کوئی بہت بڑا فتنہ اٹھ کھڑا ہو گا۔

میں نے نیاز علی کو مخاطب کرتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''تم گھر جاؤ اور اپنی بیوی کو پیار محبت سے سمجھانے کی کوشش کرو۔ میں ڈاکٹر عطیہ کو تھانے بلوا کر اس سے بات کرتا ہوں۔ انشاء اللہ کوئی نہ کوئی حل اس مسئلے کا نکل ہی آئے گا۔ تم فکر نہ کرو۔''

میں سردست نیاز علی کے لئے اس سے زیادہ اور کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔ ڈاکٹر عطیہ سے ایک بھرپور ملاقات کے بعد ہی آئندہ کے بارے میں سوچا جا سکتا تھا۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مایوسی سے بولا۔ ''آپ کہہ رہے ہیں تو میں ایک اور کوشش کر کے دیکھ لیتا ہوں۔ ورنہ شرافت کی راہ پر رہتے ہوئے تو میں نے ہر کوشش کر لی ہے، میں نے منت خوشامد کو بھی آزما لیا ہے۔ اب لات جوتا تو مجھ سے ہوتا نہیں۔ کوئی سنے گا تو کیا

کہے گا۔ خواہ مخواہ میری ناک ہی کٹے گی۔ انسان کی عزت اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ لوگوں کا حال تو اس کوّے جیسا ہے جو کسی بھی گھر سے دھواں اٹھتے دیکھ کر یہ یقین کر لیتا ہے کہ وہاں ضرور کچھ پک رہا ہو گا۔ لوگ بھی کسی گھر میں مچنے والے شور شرابے سے اپنی اپنی ذہنیت کے مطابق نئی نئی کہانیاں گھڑ لیتے ہیں۔ اللہ معاف کرے بہت برا زمانہ آ گیا ہے۔''

بات ختم کرتے ہی اس نے دونوں کانوں اور ناک کو چھوا۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''دیکھو نیاز علی! وقت اور زمانے کو کبھی برا نہیں کہنا چاہئے۔ ہر دور میں اچھے برے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ زمانہ انہی لوگوں سے مل کر بنتا ہے لہٰذا لوگوں کے اعمال کا الزام زمانے کو نہیں دینا چاہئے۔ بہر حال......'' میں نے ذرا توقف کیا پھر کہا۔ ''تم اس وقت سخت پریشان ہو، بیوی تمہارے قابو سے نکلی جا رہی ہے لیکن تم غم نہ کرو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا...... انشاء اللہ بہت جلد۔''

وہ میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گیا۔

نیاز علی کے جانے کے بعد میں نے حوالدار کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ وہ آ کر میرے سامنے کھڑا ہوا تو میں نے اسے بیٹھنے کو کہا پھر پوچھا۔ ''تمہاری بیوی آج کل کہاں ہے؟''

وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میری گھر والی کہاں جائے گی۔ وہ گھر میں ہی ہے، میرے تین بچوں کے ساتھ۔''

''بوٹا! میرے پوچھنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے میکے میں ہے یا سسرال میں؟''

حوالدار محمد بوٹا موضع چنی وال کا رہنے والا تھا اور جس قصبے میں ہمارا تھانہ واقع تھا، بوٹا کی بیوی صفیہ کا میکا یہیں تھا۔ صفیہ کے حوالے سے میرے ذہن میں ایک اچھوتا آئیڈیا آیا تھا اور اسی سلسلے میں، میں نے بوٹا کو اس وقت اپنے پاس بلایا تھا۔ بوٹا کی بیوی صفیہ ایک چالاک اور کائیاں عورت تھی۔

میرے سوال کے جواب میں بوٹا نے بتایا۔ ''صفیہ ادھر چنی وال میں ہے جی، میرے ماں پیو کے ساتھ۔'' پھر رک کر مجھ سے مستفسر ہوا۔ ''آپ میری بیوی کے بارے میں اتنی شد و مد سے کیوں پوچھ رہے ہیں ملک صاحب؟''

میں نے گول مول جواب دیا۔ ''اس کی اچانک یہاں ضرورت پیش آ گئی ہے۔ کیا تم چند دن کے لئے صفیہ کو اس کے میکے میں چھوڑ سکتے ہو؟''

PDF LIBRARY 0333-7412793

''ضرور چھوڑ سکتا ہوں ملک صاحب! پر پتہ تو چلے، آخر معاملہ کیا ہے؟''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں ڈاکٹر عطیہ چوہان کے بارے میں خفیہ تفتیش کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے آج کل کیا قصہ چل رہا ہے۔ مجھے امید ہے صفیہ بہت جلد اندر کی بات کھینچ لائے گی۔''

''ہاں جی، میری گھر والی تیز تو بہت ہے۔'' وہ ذومعنی انداز میں بولا۔ ''آپ مجھے ایک دن کی چھٹی دے دیں، پھر میں آپ کو ایم بی بی ایس بن کر دکھاتا ہوں۔''

اس کے لہجے میں قدرے شوخی پائی جاتی تھی۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''تمہیں جو بننا تھا، بن گئے۔ ایک حوالدار بننے کے بعد تم ڈاکٹری کس طرح پڑھ سکو گے؟''

''میں نے کب کہا ہے، میں ڈاکٹری پڑھنے جا رہا ہوں!''

''تم نے کہا نہیں، ایم بی بی ایس بن کے دکھاؤ گے؟''

''او ملک صاحب! میرا مطلب وہ والا ایم بی بی ایس نہیں تھا۔''

''پھر کیا مطلب تھا تمہارا؟'' میں نے اسے گھورا۔

وہ وضاحتی انداز میں بولا۔ ''جناب! ایم بی بی ایس سے میری مراد تھی ...... میاں بیوی بچے سمیت!'' وہ ایک لمحے کو رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میں تین ماہ سے چھٹی پر نہیں گیا۔ صفیہ نے کئی بار پیغام بھجوایا ہے، وہ اپنے ماں باپ سے ملنے آنا چاہتی ہے۔ چلو، اس طرح دونوں مسئلے حل ہو جائیں گے۔ میاں بیوی اپنے بچوں سمیت یہاں پہنچ جائیں گے۔''

آئندہ دس منٹ میں، میں نے بوٹا کو سمجھایا کہ اس کی بیوی کو کیا فرض ادا کرنا تھا۔ میں نے کہا۔ ''بوٹا! تمہیں سب سے پہلے اپنی بیوی کو اعتماد میں لینا ہوگا۔ اسے اچھی طرح تاکید کر دینا کہ وہ اس منصوبے کے بارے میں کسی کو نہ بتائے ورنہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔''

''آپ فکر ہی نہ کریں ملک صاحب! صفیہ بڑی سمجھ دار عورت ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں اس سے جو کہہ دوں گا، وہ اس سے ایک انچ اِدھر اُدھر نہیں ہوگی۔ ویسے بھی اسے جاسوسی کا بہت شوق ہے۔ یہ کام وہ بڑی رازداری سے کر لے گی۔''

اس کے خاموش ہوتے ہی میں نے کہا۔ ''بوٹا! تم دنیا کے ان چند خوش نصیب شوہروں میں سے ایک ہو جن کی بیویاں ان کی مرضی سے ایک انچ اِدھر اُدھر نہیں جاتیں۔ فی الحال میں اس ذیل میں ذاتی تجربہ تو نہیں رکھتا تاہم میں نے اکثر شوہروں کو بیویوں کی نافرمانی اور سرکشی کی داستانیں بیان کرتے ہی سنا ہے۔''

''ملک صاحب! میں نے آپ سے غلط بیانی نہیں کی۔ صفیہ واقعی بہت اطاعت گزار بیوی ہے۔'' بوٹا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آج تک اس نے مجھے کسی بڑی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ ہماری شادی کو دس سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے اور ماشاء اللہ ہمارے تین بچے ہیں۔ آپ سے کیا چھپا ہوا ہے!''

''تم ٹھیک کہتے ہو ...... مجھ سے کچھ چھپا ہوا نہیں بلکہ اس میں چند دن پہلے ایک حیرت انگیز اضافہ ہی ہوا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ حوالدار، نیاز علی کی کہانی سے آگاہ تھا۔ میں نے اس کا حوالہ دیتے ہوئے مزید کہا۔ ''یہ ڈاکٹر عطیہ تو عجیب وغریب مہم کے موڈ میں نظر آ رہی ہے۔ اگر میاں بیوی کے درمیان یونہی فاصلے بڑھتے رہے تو پھر اس قصبے میں کوئی انقلاب رونما ہو کر رہے گا ...... اور مجھے امید ہے یہ انقلاب بہت تباہ کن ہوگا۔''

''اس انقلاب کی رونمائی سے پہلے ہی ہمیں کوئی عملی قدم اٹھانا ہوگا۔'' حوالدار محمد بوٹا جوش بھرے لہجے میں بولا۔ ''ہمیں پہلی فرصت میں ڈاکٹر عطیہ کی مہم ناکام بنانا ہوگی۔'' اس کے الفاظ میں ایک مضبوط عزم کی جھلک تھی۔

میں نے کہا۔ ''میں اس لئے تو تمہاری گھر والی کو یہاں بلا رہا ہوں۔''

''آپ کے ذہن میں کس قسم کا منصوبہ ہے؟''

''منصوبہ بالکل سیدھا اور سادہ ہے۔'' میں نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری گھر والی یہاں قیام کے دوران میں ایک مریض بن کر ڈاکٹر عطیہ کے کلینک پر جائے گی۔ وہ خود کو بہت ہی مظلوم ظاہر کرے گی۔ ایک ایسی بے بس اور لاچار بیوی جسے شوہر پاؤں کی جوتی سمجھتا ہے اور ہر وقت اسے اپنی خواہش کی کنیز بنائے رکھنا چاہتا ہے۔ صفیہ، ڈاکٹر کو بتائے گی کہ وہ اپنی ازدواجی زندگی سے بہت ناخوش بلکہ نالاں ہے۔ کاش اس نے یہ شادی ہی نہ کی ہوتی۔ صفیہ، ڈاکٹر سے کہے گی کہ وہ تمہارے تین بچے پیدا کر کے اپنی صحت تباہ کر بیٹھی ہے۔ اس کے بدن کا کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں رہ رہ کر درد نہ اٹھتا ہو، چکر الگ آتے ہیں۔ دنیا میں ابھی تک ایسا کوئی آلہ ایجاد نہیں ہوا جو بتا سکے کہ کسی شخص کو واقعی درد ہو رہا ہے یا درد کا بہانہ کر رہا ہے۔''

میں چند لمحات کے لئے خاموش ہوا پھر ایک گہری سانس لینے کے بعد دوبارہ گویا ہوتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری بیوی کی یہ ''المیہ داستان'' سننے کے بعد ڈاکٹر عطیہ اسے زریں مشوروں سے نوازے گی۔ اس طرح نیاز علی کے بیان کی تصدیق ہو جائے گی کہ مذکورہ ڈاکٹر میاں بیوی کے درمیان دیوار اٹھانے کے جرم میں ملوث ہے۔ خیر یہ تصدیق اتنی اہم

PDF LIBRARY 0333-7412793

نہیں۔''

میں نے سرسری انداز میں کہا۔ پھر اضافہ کیا۔ ''صفیہ ڈاکٹر عطیہ کو اور زاویوں سے بھی گھس کر دیکھے گی۔ مجھے ان تمام الزامات کے ثبوت چاہئیں جو اب تک مختلف لوگوں نے ڈاکٹر عطیہ چوہان پر لگائے ہیں تاکہ میں اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کر سکوں۔ تم میرا مقصد سمجھ رہے ہو نا؟''

''بڑی چنگی طراں سمجھ رہا ہوں ملک صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میری گھر والی چند دن میں یہ کام کر لے گی۔ آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے ...... تم کل ہی صفیہ کو لانے کے لئے چنی وال روانہ ہو جاؤ۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''اب یہ پراجیکٹ تمہارے حوالے ہے۔ مجھے جلد از جلد رپورٹ چاہئے۔''

''میں اس سلسلے میں بہت جلد آپ کو کوئی بڑی خوش خبری سناؤں گا۔''

اگلے روز حوالدار بوٹا اپنی بیوی کو لینے چنی وال چلا گیا اور میں نادر خان سے ملنے پرانی غلّہ منڈی کی طرف روانہ ہو گیا۔ نادر خان اناج کی آڑھت کرتا تھا اور مذکورہ منڈی میں ''نادر خان اینڈ سنز'' کے نام سے اس کی ایک بہت بڑی دکان تھی۔ اس دکان کے عقبی حصے میں ایک بہت بڑا گودام بھی تھا۔

میں کانسٹیبل نجیب اللہ کے ہمراہ جب نادر خان کی دکان پر پہنچا تو وہ اپنے دفتر میں موجود تھا۔ یہ دکان دراصل ایک وسیع برآمدے، ایک دفتری کمرے اور ایک کشادہ گودام پر مشتمل تھی۔ اونچی چھت والا یہ کاروباری اڈہ نادر خان کی ملکیت تھا۔ وسیع برآمدے میں دونوں دیواروں کے ساتھ زمین سے چھت تک اناج کی بوریاں چُنی ہوئی تھیں۔ یہی حال عقبی گودام کا تھا۔ گودام اور برآمدے کو ایک طویل راہ داری آپس میں ملا رہی تھی اور اسی راہ داری کے پہلو میں دس بائی بارہ فٹ کا وہ کمرہ تھا جو نادر خان اپنے دفتر کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ اس کمرے کا ایک دروازہ راہ داری میں کھلتا تھا جب کہ دوسرا دروازہ عقبی سمت گودام میں۔ سامنے والی دیوار میں ایک کھڑکی موجود تھی جس میں سے باہر برآمدے اور اس سے آگے سڑک کا بڑا واضح منظر دکھائی دیتا تھا۔

جب ہم وہاں پہنچے تو برآمدے کے باہر سڑک پر دو ٹرک کھڑے تھے اور کوئی نصف درجن مزدور (پلے دار) ان ٹرکوں پر سے اناج کی بوریاں اتار اتار کر اندر گودام میں پہنچا رہے تھے۔ میں اس سیٹ اَپ پر ایک طائرانہ سی نگاہ ڈال کر نادر خان کے کمرے کی جانب

بڑھ گیا۔

اس وقت ہم دونوں یونیفارم میں تھے۔ نادر خان ہمیں دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بڑے تپاک سے ملا۔ ''آیئے آیئے تھانے دار صاحب! میری خوش قسمتی ہے کہ آپ میری دکان پر تشریف لائے۔'' اس کے انداز نے ظاہر کر دیا کہ وہ مجھے تھانے دار کی حیثیت سے اچھی طرح جانتا تھا۔

گرم جوش مصافحے کے بعد ہم دونوں بیٹھ گئے۔ اس کمرے میں نادر خان کے علاوہ ایک اور شخص بھی موجود تھا۔ ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے نادر خان اسی شخص سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''منشی جی! جاؤ کوئی چائے پانی کا بندوبست کرو۔ دیکھ نہیں رہے ہو، تھانے دار صاحب پہلی مرتبہ ہماری دکان پر آئے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''خان صاحب! کسی تکلّف کی ضرورت نہیں۔ ہم تو اتفاقاً ادھر سے گزر رہے تھے۔ سوچا، آپ سے علیک سلیک کرتے چلیں۔ ہم چند منٹ بیٹھ کر واپس چل جائیں گے۔''

''او سرکار! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔'' وہ بے تکلفی سے بولا۔ ''آپ چند منٹ ٹھہریں یا چند گھنٹے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ خاطر تواضع کئے بغیر تو آپ کو جانے نہیں دوں گا۔'' پھر وہ اپنے منشی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''منشی! تم کیوں رک گئے ہو؟ میں نے جو کہا ہے وہ فوراً کرو۔''

نادر خان کے اخلاق اور محبت کو دیکھتے ہوئے میں نے زیادہ مزاحمت نہیں کی اور یک چشم شوکت نامی منشی کے جانے کے بعد نادر خان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''کاروبار کیسا چل رہا ہے خان صاحب؟''

''بس جی، آپ کی دعا اور اللہ کا کرم ہے۔'' وہ عاجزی سے بولا۔ ''آپ کے سامنے دو ٹرک کھڑے ہیں، مال اتر رہا ہے۔ اسی طرح دوسرے ٹرک کھڑے ہوتے ہیں اور مال لوڈ ہو رہا ہوتا ہے۔ میں اس ذات پاک کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔''

نادر خان اپنی بات چیت اور انداز سے خاصا سلجھا ہوا اور شائستہ لگتا تھا۔ رسمی گفتگو کے بعد میں اسے اصل موضوع کی طرف لے آیا۔ اس دوران میں منشی شوکت ہماری ہلکی پھلکی تواضع کا بندوبست کر چکا تھا۔ نادر خان نے اپنے منشی کو تاکید کر دی تھی کہ وہ باہر ٹرکوں کے پاس موجود رہے اور جب تک وہ خود نہ بلائے، کوئی شخص اندر آنے کی کوشش نہ کرے۔ پھر

PDF LIBRARY 0333-7412793

وہ ہماری طرف ہمہ تن گوش ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ”خان صاحب! میں دراصل ڈاکٹر عطیہ کے بارے میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ یک دم سنجیدہ ہو گیا اور بولا۔ ”جی کہیں ملک صاحب!“

”ڈاکٹر عطیہ کے بارے میں مختلف قسم کی باتیں سننے کو مل رہی ہیں۔“ میں نے گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا پھر کسی کا نام ظاہر کئے بغیر ان باتوں کی وضاحت بھی کر دی جو ڈاکٹر عطیہ کی ذات سے منسوب کی جا رہی تھیں۔ پھر کہا۔ ”اس نوعیت کی در پردہ اور ظاہرہ خبریں خواہ مخواہ غلط فہمیاں پیدا کرتی ہیں۔ مجھے پتہ چلا تھا آپ ڈاکٹر کی سرپرستی کر رہے ہیں۔“ میں نے محتاط الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے کہا۔ ”اس لئے سوچا پہلے آپ سے ہی بات کر لوں۔“

”آپ نے بالکل صحیح کیا جو میرے پاس چلے آئے۔“ وہ مدبرانہ انداز میں بولا۔ ”ایسی باتیں اُڑتی اُڑتی میں نے بھی سنی ہیں اور میں جانتا ہوں ڈاکٹر عطیہ اس سلسلے میں کسی طرح بھی قصور وار نہیں۔ وہ میڈیکل کے شعبے سے وابستہ ہے اور صحت کے بارے میں درست اور مفید معلومات قصبے کی عورتوں تک پہنچا رہی ہے۔ پتہ نہیں کچھ لوگ اس کے دشمن کیوں ہو گئے ہیں۔ میں نے تو یہاں تک سنا ہے بعض [illegible] مجھے اس کا ساتھی سمجھ رہے ہیں۔“

”ہاں، یہ خبر مجھ تک بھی پہنچی ہے [illegible] ای کی تو نہاہا۔“ ”اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔“ [illegible] یکھا جس [illegible]

”ملک صاحب! عورت کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے۔“ وہ تشویش ناک نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں جانتا ہوں، کون کون لوگ [illegible] کے خلاف زہر اُگل رہے ہیں۔ آپ بھی یقیناً جانتے ہیں لیکن کسی مصلحت کے تحت ان کے نام ظاہر نہیں کر رہے۔ بہرحال میں کہہ رہا تھا...... میں کوئی کمزور یا گیا گزرا نہیں ہوں۔ میں بڑی آسانی سے ان لوگوں سے نمٹ سکتا ہوں جو عطیہ کے خلاف الٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں۔ لیکن اس سے کیا ہو گا؟“ وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر خود ہی بتانے لگا۔

”ابھی جو لوگ دبی دبی زبان میں مجھے عطیہ کے ساتھ ملوث کر رہے ہیں وہ کل علی الاعلان اس طرف داری کے نتیجے میں مجھ پر کیچڑ اچھالنے لگیں گے۔“

”تو گویا آپ اپنی بدنامی سے ڈرتے ہیں؟“ میں نے کہا۔

”ہر شریف آدمی کو اپنی نیک نامی بہت عزیز ہوتی ہے۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”مجھے بھی

ہے۔ میں نے یہ ساکھ اور عزت بڑی محنت اور کوشش سے حاصل کی ہے ملک صاحب!“

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے پتہ چلا ہے آپ اکثر و بیشتر اس کے کلینک پر جاتے رہتے ہیں بلکہ کلینک والا مکان آپ ہی کی ملکیت ہے۔ مہینے میں ڈاکٹر عطیہ بھی ایک آدھ بار آپ سے ملنے آتی ہے۔ آپ کم از کم اسے سمجھا تو سکتے ہیں۔“

”میں اسے کیا سمجھاؤں؟“ اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے وضاحت میں نیاز علی کا معاملہ دہرایا اور کہا۔ ”اگر ڈاکٹر عطیہ لوگوں کی بیویوں کو اس قسم کی پٹیاں پڑھانا شروع کر دے گی تو آپ خود اندازہ لگا لیں کہ شوہروں کی ذہنی کیفیت کیا ہو گی۔ یہاں تو بعض خاندانوں میں اس شخص کو اتنا ہی زیادہ جی دار سمجھا جاتا ہے جس کی جتنی زیادہ اولادیں ہوتی ہیں۔ آپ تو ہر بات سے بہ خوبی آگاہ ہیں خان صاحب!“

”یہ آپ نے بالکل نئی بات بتائی ہے ملک صاحب! میں اس بارے میں پہلے نہیں جانتا تھا۔“ وہ فکر مندی سے بولا۔ ”اگر عطیہ واقعی اس قسم کے مشورے بانٹ رہی ہے تو اسے سختی سے روکنا ہو گا۔ میں کل ہی اس سلسلے میں اس سے بات کرتا ہوں۔“ بات ختم کرتے ہی وہ پُر معنی انداز میں گردن ہلانے لگا۔

میں نے استفسار کیا۔ ”خان صاحب [illegible] ڈاکٹر عطیہ چند ماہ سے اس قصبے میں نظر آ رہی ہے۔ اس سے پہلے اس کا کلینک کہاں [illegible] ار ہیں خا [illegible] لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اگر آپ کو برا محس [illegible] برا اپنا مردک [illegible] بھی بتا دیں کہ آپ ڈاکٹر کو کب سے جانتے ہیں...... اور کس حوالے سے؟“

وہ چند لمحے ٹھہری ہوئی نظر سے [illegible] دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”میں آپ کے سوالات کا قطعاً برا نہیں مناؤں گا ملک صاحب! سب سے پہلے تو میں یہ وضاحت کر دوں کہ ڈاکٹر عطیہ چوہان کوئی باقاعدہ ”ایم بی بی ایس“ گائنی نہیں ہے۔ وہ ایک ”ایل ایچ وی“ ہے۔“

وہ ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”ہماری پہلی ملاقات ضلع لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کے علاقے چک جھمرا میں ہوئی تھی۔ میں اپنے ایک کاروباری دوست سے ملنے چک جھمرا گیا ہوا تھا۔ وہاں ایک اصلاحی سماجی پروگرام میں میرا دوست مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ ڈاکٹر عطیہ بھی اس پروگرام میں شامل تھی۔ گاؤں دیہات میں زچہ و بچہ کی صحت اور دیگر مسائل پر اس نے اتنی بھرپور اور تاثر انگیز تقریر کی کہ میں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ عطیہ کی تقریر تو رہی ایک طرف، مجھے اس کی

PDF LIBRARY 0333-7412793

آواز میں ایک خاص قسم کا درد محسوس ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ اندر سے بڑی دکھی عورت ہو۔ میں نے اسی لمحے فیصلہ کرلیا کہ اس پروگرام کے بعد میں ڈاکٹر عطیہ سے تفصیلی ملاقات کروں گا۔

تقریب کے دوران ہی میں نے اپنے دوست کو اس ارادے سے آگاہ کر دیا۔ یہ پروگرام چونکہ اسی کی نگرانی میں ہو رہا تھا اس لئے عطیہ سے ملاقات کروانا اس کے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ قصہ مختصر میں تنہائی میں عطیہ سے ملا۔ پہلے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں پھر میں اسے اپنے مطلب کی طرف لے آیا۔ مجھے معلوم تھا وہ اسی طرح گاؤں گاؤں، قریہ قریہ گھوم کر سماجی اصلاح کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔ میں نے نہیت ہی سنجیدگی سے کہا۔

"ڈاکٹر عطیہ! تم کسی ایک جگہ کوئی کلینک وغیرہ کھول کر کیوں نہیں بیٹھ جاتیں۔ عوام کی خدمت کرنا تمہارا نصب العین ہے تو تمہارا یہ نیک مقصد کلینک کھول کر بھی پورا ہو سکتا ہے۔"

"ہاں خان صاحب!" وہ اُداس لہجے میں بولی۔ "آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں، بلکہ میں خود بھی یہی چاہتی ہوں۔ نگر نگر گھوم پھر کر میں تھک سی گئی ہوں لیکن میرے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ جو کام آپ کہہ رہے ہیں وہ میرے بس میں نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس میں ایسی مشکل کون سی بات ہے؟ کوئی بھی صاب حیثیت تمہاری مدد کرنے گا۔ نیکی میں حصہ ڈالنے والوں کی کمی تو نہیں۔"

ڈاکٹر عطیہ نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسے یقین کرنے کی کوشش کر رہی ہو کہ میں اس کے سامنے موجود بھی ہوں کہ نہیں۔ میں خاموش مگر سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھتا رہا۔ چند لمحات کے بعد وہ ایک افسردہ سی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

"خان صاحب! اس دنیا میں صاحب حیثیت لوگوں کی کمی نہیں اور ان میں سے اکثر نیکی و ثواب کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کو بھی تیار رہتے ہیں مگر اس سلسلے میں میرا تجربہ خاصا تلخ ہے۔" وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی اور اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو تکنے لگی۔

ڈاکٹر عطیہ کے چہرے کی حالت بتاتی تھی کہ اس وقت اس کے اندر ایک طوفان مچل رہا تھا جسے وہ بڑی استقامت سے لگام دیئے بیٹھی تھی۔ میں چند لمحات تک اس کی کیفیت کا بہ غور جائزہ لیتا رہا پھر پوچھا۔

"اپنے تلخ تجربے کی تھوڑی وضاحت نہیں کرو گی؟"

وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "اگر میں کچھ عرض کروں گی تو آپ ناراض تو

نہیں ہو جائیں گے؟"

"نہیں ...... میں بھلا تم سے کیوں ناراض ہوں گا۔" میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

وہ بولی۔ "میں دراصل مردوں کی برائی کرنے والی ہوں ...... اور آپ بھی ایک مرد ہی ہیں۔"

"تم جو کہنا چاہتی ہو بلا تردّد کہو۔" میں نے فراخ دلی سے کہا۔ "میں تمہاری ہر ترش و تلخ بات بن لوگا۔ کیونکہ مجھے یقین ہے وہ بات کم از کم میرے لئے نہیں ہو گی۔"

اس نے ایک گھائل سانس کھینچی اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "خان صاحب! جو آئیڈیا آپ کے ذہن میں آیا ہے، میں بھی اسی کی خواہش مند ہوں۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں کہیں کلینک کھول کر آرام سے عوام کی خدمت کروں ...... اور یہ کام کسی صاحب ثروت شخص کے تعاون ہی سے ممکن ہے۔" وہ ذرا متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

"میں نے ایک دو صاحبانِ حیثیت و مرتبہ سے اس سلسلے میں درخواست کی تو وہ فوراً میری مدد کو تیار ہو گئے۔ لیکن دُکھ اور افسوس کا مقام یہ ہے کہ وہ اس مدد کے بدلے مجھ سے تعاون کے طلب گار تھے۔ اب یہ نہ پوچھئے گا، بدلے میں وہ مجھ سے کس نوعیت کا تعاون چاہتے تھے۔ آپ خاصے سمجھ دار ہیں خان صاحب! اگر مجھے مردوں کی ہر جائز و ناجائز خواہش کے سامنے جھکنا ہوتا تو پھر اپنا مرد کیا برا تھا!"

اتنا کہہ کر وہ اچانک خاموش ہوگئی۔ میں حیرت بھری نظر سے ڈاکٹر عطیہ کو دیکھنے لگا۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی اور اس نے ابھی ابھی مردوں کے جس وصف کا ذکر کیا تھا وہ بہت سوں کی گردن جھکانے کے لئے کافی تھا۔ میں اس کی بات کو بڑی وضاحت سے سمجھ گیا تھا۔ اس نے صاحب حیثیت افراد کی جس طلب کا حوالہ دیا تھا اسے سمجھنے کے لئے کسی خاص عقل کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ تاہم ڈاکٹر عطیہ کے آخری جملے نے مجھے گھما کر رکھ دیا تھا۔ شاید اس نے اپنے شوہر کا حوالہ دیا تھا۔

میں نے اپنے لہجے میں ہمدردی سموتے ہوئے کہا۔ "آپ دو تین مردوں کے تجربے کو دیکھتے ہوئے پوری دنیا کے مردوں کو ایک ہی قطار میں کھڑا کر رہی ہیں۔ بہرحال سب مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ "اگر تم پسند کرو تو میں اپنے علاقے میں تمہارا کلینک کھلوا سکتا ہوں۔ میں کوئی بہت ہی نیکو کار اور اللہ کا

PDF LIBRARY 0333-7412793

برگزیدہ بندہ تو نہیں لیکن اتنا وعدہ ضرور کرسکتا ہوں کہ تمہیں میری ذات سے اس قسم کی کوئی شکایت نہیں ہوگی جیسا تجربہ تم نے بیان کیا ہے۔ میں ہر طرح کے مالی تعاون کے لئے تیار ہوں۔ تم اپنی پیشہ ورانہ صلاحیت کو آزماؤ۔ اس طرح تمہارا شوق بھی پورا ہوتا رہے گا اور یہ ایک قسم کا صدقہ جاریہ بھی ہوگا۔''

ڈاکٹر عطیہ نے ممنونیت بھری نظر سے مجھے دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''خان صاحب! پتہ نہیں کیا بات ہے کہ آپ کے الفاظ پر یقین کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔''

''وہ اس لئے کہ یہ الفاظ خلوصِ دل کی آواز ہیں۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اور ان الفاظ کا ایک ایک حرف سچائی پر مبنی ہے۔''

''ڈاکٹر عطیہ چوہان نے میرے ساتھ، اس قصبے آنے کا فیصلہ سنا دیا۔ میں نے یہاں اس کی آمد اور تعارف کے لئے ایک چھوٹا سا پروگرام بھی رکھا جس کے اختتام پر اس قصبے کی پانچ بیوہ عورتوں کو سلائی مشینیں بھی تقسیم کی گئیں۔ قصبے کے مین بازار میں میرا ایک چھوٹا سا مکان تھا، میں نے وہ مکان عطیہ کے کلینک کیلئے وقف کر دیا۔ دو کمروں کے اس مختصر سے مکان میں وہ بچوں اور عورتوں کی فلاح و بہبود کے لئے کلینک بھی چلاتی ہے اور اسی مکان میں اس کی رہائش بھی ہے۔ ان چھ سات مہینوں میں ڈاکٹر عطیہ نے مجھے ایک مرتبہ بھی شکایت کا موقع نہیں دیا اور میرا خیال ہے وہ میری ذات سے بھی مطمئن ہی ہے ...... ورنہ وہ کب کی یہ علاقہ چھوڑ کر جا چکی ہوتی۔''

آڑھتی نادر خان اس طویل وضاحت کے بعد خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔''خان صاحب! ڈاکٹر عطیہ سے اکثر و بیشتر آپ کی ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ اس نے اپنے شوہر کے بارے میں بھی آپ کو بہت کچھ بتایا ہوگا؟''

نادر خان نے تھوڑی دیر پہلے ڈاکٹر عطیہ کے شوہر کا جس انداز میں تذکرہ کیا تھا وہ خاصا چونکا دینے والا تھا۔ نادر خان نے عطیہ کے یہ الفاظ دہرائے تھے ...... اگر مجھے مردوں کی ہر جائز و ناجائز خواہش کے سامنے جھکنا ہوتا تو پھر اپنا مرد کیا برا تھا! کوئی بھی عورت اپنا مرد صرف شوہر ہی کو کہہ سکتی ہے۔ ڈاکٹر عطیہ کے الفاظ اور انداز سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی مرد اس کا شوہر ہوا کرتا تھا اور اب اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یا تو عطیہ نے اپنے شوہر کو چھوڑ دیا تھا اور یا پھر شوہر نے عطیہ کو! بہرحال یہ انکشاف اس کہانی میں ایک سنسنی خیز موڑ لا رہا تھا اور اسی تجسس کے باعث میں نے نادر خان کو ٹٹولنے کے لئے وہ سوال کیا تھا۔

اس نے بتایا۔''ملک صاحب! میں نے عرض کیا نا، یہ ڈاکٹر عطیہ بہت دکھی عورت ہے۔ میں آپ کو بتاؤں، تین سال پہلے اس کے شوہر وحید اللہ نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ اس وقت سے یہ ایسے ہی در در کی ٹھوکریں کھاتی پھر رہی تھی۔ اللہ کا شکر ہے اب یہ جم کر ایک جگہ بیٹھ گئی ہے۔''

نادر خان کے اس انکشاف نے میری دلچسپی کو اور بڑھایا۔ میں نے پوچھا۔''وحید اللہ نے اسے گھر سے کیوں نکال دیا تھا؟ اور یہ وحید اللہ رہتا کہاں ہے؟''

''وحید اللہ لاہور میں رہتا ہے۔'' نادر خان نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔''ادھر انارکلی بازار میں اس کی ''کیپ اینڈ ہیٹ'' کے نام سے ایک دکان ہے جہاں پر ٹوپی اور ہیٹ وغیرہ کے علاوہ مختلف قسم کی چھڑیاں اور چھتریاں بھی فروخت ہوتی ہیں۔'' وہ ایک لمحے کو سانس لینے کے لئے رکا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے افسوسناک لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! انسانیت کی خدمت ڈاکٹر عطیہ کا مسئلہ خاص ہے اور اس کا شوہر اس مسئلے کو محسوس نہیں کرتا تھا۔ اسے عطیہ کے جذبات کا مطلق احساس نہیں تھا۔ عطیہ کی سماجی سرگرمیاں اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں۔ ان میں آئے دن جھگڑا فساد ہوتا رہتا۔ وحید اللہ کا مطالبہ تھا، عطیہ ایک گھریلو بیوی بن کر رہے اور عطیہ گھر میں ٹِک کر بیٹھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے شوق کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ اس کا زیادہ تر وقت گھر سے باہر گزرتا۔ پھر ایک روز وحید اللہ نے صاف الفاظ میں عطیہ سے کہہ دیا کہ اگر وہ اپنی سرگرمیوں سے باز نہیں آ سکتی تو پھر اس کے گھر سے دفع ہو جائے۔ عطیہ اپنے شوق کے ہاتھوں اتنی بے بس تھی کہ اس نے اپنا گھر چھوڑ دیا۔ وحید اللہ نے بیٹی کو اپنے پاس رکھ لیا۔ شاید میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا کہ ڈاکٹر عطیہ کی ایک بیٹی بھی ہے جس کا نام ناہید ہے۔ جب عطیہ نے گھر چھوڑا اس وقت ناہید کی عمر نو سال تھی۔ اب ماشاء اللہ بارہ سال کی ہو گئی ہوگی!''

ڈاکٹر عطیہ کی کہانی سن کر مجھے واقعی بہت دکھ ہوا۔ ایک عورت کی ضد نے ایک معصوم بچی سے اس کی ماں چھین لی تھی۔ کہتے ہیں اور بالکل درست کہتے ہیں کہ نیک کام کا آغاز اپنے گھر سے کرنا چاہئے مگر ڈاکٹر عطیہ نے اپنے گھر کو نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ انسانیت کی خدمت میں اپنے گھر گھاٹ سے بہت دور ہو گئی تھی۔ انسانیت کی خدمت ایک اعلیٰ اخلاقی فریضہ ہے جس کی حقیقت اور افادیت سے انکار ممکن نہیں لیکن انسان کو اپنے افعال و اعمال میں ایک توازن قائم رکھنا چاہئے۔ انتہا پسندی اور خود سری ہمیشہ بھیانک نتائج لے کر آتی ہے۔ ڈاکٹر عطیہ نیک کام کی تکمیل میں اپنے فرائض خاص کو فراموش کر بیٹھی تھی۔ میرے

PDF LIBRARY 0333-7412793

خیال میں اس سارے خرابے میں زیادہ قصور ڈاکٹر عطیہ کا تھا۔ وہ انسانیت کی خدمت میں دو ایسے انسانوں کو نظر انداز کر بیٹھی تھی جن کا اس پر سب سے زیادہ حق بنتا تھا۔ اور یہ سب کچھ اس نے دانستہ کیا تھا۔ یہ تو بالکل ایسی بات ہو گئی کہ انسان اپنے افرادِ خانہ کو دلی صدمات سے دوچار کر کے حج بیت اللہ کو روانہ ہو جائے!

میں نے اب تک کی گفتگو سے اندازہ لگایا تھا کہ نادر خان، ڈاکٹر عطیہ کے لئے اپنے دل میں بہت ہمدردی رکھتا تھا لہٰذا میں نے عطیہ کی کوتاہی کو زیرِ بحث لانا ضروری بلکہ مناسب نہ سمجھا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے خان صاحب! میں چلتا ہوں ...... آپ ڈاکٹر عطیہ کو سمجھانے کی کوشش کریں۔ میں اپنے تھانے کی حدود میں کوئی بدمزگی نہیں چاہتا۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا؟''

وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''آپ بے فکر ہو جائیں ملک صاحب! میں آج ہی عطیہ سے بات کرتا ہوں۔ انشاء اللہ اس طرف سے آپ کو کوئی شکایت نہیں ہو گی!''

میں کانسٹیبل کے ساتھ واپس تھانے آ گیا۔

پانچ روز بعد حوالدار محمد بوٹا کی گھر والی صفیہ نے اپنی تحقیقاتی رپورٹ پیش کر دی۔ اس رپورٹ کی زیادہ تر باتیں میری توقع کے عین مطابق تھیں۔ مثلاً ڈاکٹر عطیہ زیادہ بچے پیدا کرنے کے حق میں نہیں تھی۔ اس کے خیال میں زیادہ اولاد سے ایک طرف معاشی مسائل میں اضافہ ہوتا ہے تو دوسری طرف ماں کی صحت کا بھی کباڑہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ بار بار کی زچگی کے بعد وہ مختلف قسم کی جسمانی اور دماغی کمزوریوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے پاس آنے والی عورتوں کو یہ کہہ کر ڈراتی بھی تھی کہ کثیر الاولادی کے باعث عورت بہت جلد بوڑھی ہو جاتی ہے، اس کا بدن بے ڈھنگا اور بے کشش ہو کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ شوہر اس پر سے توجہ ہٹا لیتا ہے اور دوسری عورتوں میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔ اس طرح مرد کے لئے دوسری شادی کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

وہ عورتوں کو ان کے حقوق اور محفوظ مستقبل کا احساس دلاتے ہوئے کم سے کم اولاد پیدا کرنے کی طرف مائل کرتی۔ اس سلسلے میں وہ انہیں بہت سے آزمودہ کار ٹوٹکے بتاتی ...... اور اس سلسلے کا سب سے خطرناک ٹوٹکا یہ تھا کہ ...... شوہر کو قریب نہ پھٹکنے دو!

صفیہ نے اپنے طویل بیان کے اختتام پر بڑا تاریخی تبصرہ کیا۔ حوالدار بوٹا اسے تھانہ دکھانے کے بہانے اپنے ساتھ لے آیا تھا اور اس وقت وہ میرے کمرے میں میرے

سامنے ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ وہ بڑے جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''ملک جی! مجھے تو یہ ڈاکٹرنی کوئی نفسیاتی مریضہ لگی ہے۔ پتہ نہیں اسے مردوں سے اتنا بیر کیوں ہے۔ اب دیکھیں نا جی! انسانوں کے بچے ہم عورتیں پیدا نہیں کریں گی تو کیا گائے مجیں (بھینسیں) کریں گی؟''

میں نے صفیہ کا ذہن صاف کرنے کے لئے اسے بتایا کہ ڈاکٹر عطیہ لاشعوری طور پر مردوں کے اتنا خلاف کیوں ہے۔ اس ذیل میں اس نے اسے ڈاکٹر عطیہ اور اس کے شوہر وحید اللہ کے اختلاف کی پوری کہانی سنا دی اور کہا۔

''وحید اللہ اس کے شوق سے ناخوش بلکہ عاجز تھا۔ اس لئے یہ اپنے شوہر سے نفرت کرنے لگی اور ایک دن اس نے اپنا گھر چھوڑ دیا۔ اب اس واقعے کو تین سال گزر گئے ہیں۔''

صفیہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔ ''توبہ توبہ، غضب خدا کا! اس عورت نے اپنے شوق کے لئے خاوند اور بیٹی کو چھوڑ دیا۔ یہ تو بہت گنہگار ہے۔ پتہ نہیں اللہ نے اس کے ہاتھ میں شفا کیوں دی ہوئی ہے؟'' ایک لمحے کا وقفہ کرنے کے بعد اس نے کہا۔ ''میں نے سنا ہے یہاں کی اکثر عورتوں کو اس کے علاج سے فائدہ ہوا ہے۔''

''شفا کا معاملہ سراسر شفا دینے والی ذات سے متعلق ہے۔ وہ ذات پاک جسے چاہے شافی بنا دے۔ یہ انسان کی سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ جب وہ انتہائی مہلک زہر میں زندگی اور انتہائی صحت بخش غذا میں موت رکھ سکتا ہے تو پھر اس کی مصلحتوں اور حکمتوں کے بارے میں سوال اٹھانا نادانی اور بے وقوفی کے سوا کچھ نہیں!

میں نے صفیہ سے کہا۔ ''ہم نے تم سے جو بھی کام لیا ہے اسے تم خود تک محدود رکھنا۔''

''آپ فکر نہ کریں جی۔ میں ان باتوں کا کسی سے تذکرہ نہیں کروں گی۔''

میں نے اسے مزید ہدایات دیں اور رخصت کر دیا۔

اس کے جانے کے بعد میں ڈاکٹر عطیہ چوہان کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ عورت اس قصبے کی عورتوں کے ذہنوں میں جس قسم کے فتنہ انگیز خیالات ٹھونس رہی تھی وہ دلچسپ ہونے کے ساتھ فکر انگیز بھی تھے۔ اس کی سرگرمیوں پر بظاہر کوئی بڑی کارروائی نہیں ہو سکتی تھی تاہم اس کی مصروفیات امن و امان کے لئے ایک بڑا خطرہ بننے والی تھیں ...... اور میں اپنے تھانے کی حدود میں کسی قسم کی ناخوشگواری اور بدامنی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

• چند روز بعد ایک ضروری کام کے سلسلے میں مجھے لاہور جانا تھا۔ میں نے سوچا انارکلی جا

PDF LIBRARY 0333-7412793

کر ڈاکٹر عطیہ کے شوہر نام دار سے ضرور ملوں گا تا کہ اس ایل ایچ وی (لیڈی ہیلتھ وزیٹر) کی ذات کی مزید پرتیں کھل کر سامنے آسکیں۔ فریق ثانی یعنی وحید اللہ کی طرف سے کسی سنسنی خیز انکشاف کی توقع کی جا سکتی تھی۔

☆☆☆

اگلا دن بڑا تہلکہ خیز ثابت ہوا!

مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ آٹھ اکتوبر کی صبح تھی۔ موسم میں ہلکی پھلکی خنکی در آئی تھی۔ میں اپنے سرکاری کوارٹر میں موجود تھا اور تھانے جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں یونیفارم پہن کر جیسے ہی فارغ ہوا، کوارٹر کے بیرونی چوبی دروازے پر دستک ہونے لگی۔ اس دستک میں حد درجہ اضطراب پایا جاتا تھا۔

میں نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک کانسٹیبل کھڑا نظر آیا۔ اس کے چہرے کے ہیجان کو دیکھتے ہوئے میں نے تشویش بھرے لہجے میں دریافت کیا۔ ''کیا بات ہے شریف حسین! تم اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟''

''ملک صاحب! آپ جلدی سے تھانے آ جائیں ...... ایک واردات ہو گئی ہے۔'' وہ بوکھلائی ہوئی آواز میں بولا۔

میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''کیسی واردات؟''

''ڈاکٹرنی کو کسی نے قتل کر دیا ہے!''

''ڈاکٹرنی......؟'' میں اچھل کر رہ گیا۔ ''تم ...... عطیہ کی بات کر رہے ہو؟''

''جی ...... جی ملک صاحب!'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''ڈاکٹرنی کا گوانڈی (پڑوسی) ادھر تھانے کے اندر بیٹھا ہے۔ وہی یہ اطلاع لے کر آیا ہے۔''

ڈاکٹر عطیہ کے قتل کی خبر ایسی تھی کہ میں چشم زدن میں تھانے پہنچ گیا۔ اپنے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے میں نے برآمدے کا جائزہ لیا۔ وہاں تین چار پریشان صورتوں والے افراد موجود تھے۔ میرے ساتھ ہی حوالدار محمد بوٹا بھی کمرے میں آ گیا۔ میں نے حوالدار سے کہا۔

''متعلقہ افراد کو فوراً اندر بلاؤ۔''

حوالدار کے چہرے کے تاثرات سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مجھ سے بہت کچھ کہنے والا تھا لیکن میں نے اسے بولنے کا موقع نہ دیا۔ ڈاکٹر عطیہ والے معاملے نے مجھے چکرا کر رکھ دیا تھا۔ اگلے ہی لمحے بوٹا نے دو افراد کو میرے سامنے حاضر کر دیا۔

ان میں ایک تو ڈاکٹر کا پڑوسی صابر علی تھا۔ صابر علی کی عمر چالیس کے قریب رہی ہو گی۔ وہ عام سی شکل وصورت اور اوسط صحت کا مالک تھا۔ دوسرا شخص رحمو دودھی (گوالا) تھا۔ رحم دین عرف رحمو دودھی اس علاقے کے گھروں میں دودھ سپلائی کرتا تھا۔ وہ پکی رنگت کا حامل ایک پچاس سالہ شخص تھا۔ میرے تھانے پہنچنے سے پہلے حوالدار بوٹا ان سے ضروری پوچھ تاچھ کر چکا تھا۔

حوالدار کی زبانی مجھے جو مختصر حالات معلوم ہوئے ان کے مطابق رحمو دودھی روزانہ صبح ایک سیر دودھ ڈاکٹر عطیہ کو دینے آتا تھا۔ آج بھی وہ وقت معمول پر ڈاکٹر کے دروازے پر پہنچا۔ دو تین بار کی دستک کے باوجود بھی جب ڈاکٹر عطیہ نے دروازہ نہ کھولا تو اسے حیرت ہوئی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر عطیہ علی الصباح اٹھنے کی عادی تھی اور ہمیشہ پہلی دستک کے جواب میں وہ دروازہ کھول دیتی تھی۔ رحمو کو ڈاکٹر کی طرف سے تشویش ہوئی تو اس نے پورے زور سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ اس ہنگامے کی آواز سن کر ڈاکٹر عطیہ کا پڑوسی صابر علی گھر سے باہر نکل آیا۔

رحمو دودھی نے صابر کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ پوری بات سن کر وہ بھی پریشان ہو گیا۔ دونوں گھروں کے درمیان ایک آٹھ فٹ بلند دیوار کھڑی تھی۔ صابر نے اپنے بیٹے نذیر سے کہا کہ وہ دیوار پھاند کر دوسری طرف جائے اور ڈاکٹر کی خیر خیریت معلوم کر کے آئے۔ پندرہ سالہ نذیر مذکورہ دیوار پھلانگ کر ادھر پہنچ گیا ...... اور پھر نذیر نے واپس آ کر بتایا کہ ڈاکٹر عطیہ اپنے کمرے میں مُردہ پڑی ہے۔

اس وقت رحمو دودھی اور صابر علی دونوں میرے کمرے میں موجود تھے۔ میں نے ان سے زیادہ سوالات میں وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور حوالدار محمد بوٹا کے ساتھ جائے وقوعہ کی جانب روانہ ہو گیا تاہم میں نے صابر اور رحمو کو تاکید کر دی تھی کہ وہ تھانے ہی میں بیٹھیں، ان سے تفصیلی پوچھ گچھ میں واپس آنے کے بعد کروں گا۔

جب ہم موقع واردات پر پہنچے تو وہاں ڈاکٹر عطیہ کے ''فلاحی'' کلینک کے سامنے درجن بھر افراد موجود تھے۔ اب یہ بات عام ہو چکی تھی کہ ڈاکٹر عطیہ کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ میں نے متلاشی نظر سے وہاں موجود افراد کا جائزہ لیا لیکن میرا مطلوبہ شخص مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔ مجھے امید تھی وہاں پہنچنے کے بعد سب سے پہلے جو صورت نظر آئے گی وہ نادر خان کی ہو گی۔ اسے غیر حاضر پا کر مجھے قدرے حیرت ہوئی۔

بہرحال لوگوں کو پیچھے ہٹانے کے بعد میں حوالدار کے ساتھ گھر کے اندر داخل ہو گیا۔

PDF LIBRARY 0333-7412793

ڈاکٹر عطیہ کی لاش عقبی کمرے میں بستر پر پڑی تھی۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اسے اس دنیا سے رخصت ہوئے چند گھنٹے گزر چکے ہیں۔ ڈاکٹر عطیہ اپنے بستر پر چت لیٹی تھی اور اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر ایک خنجر پیوست تھا۔

میں نے لاش کا تفصیلی معائنہ کیا تو مجھے حیرت ہوئی۔ خنجر کی پیوستگی کے نتیجے میں عطیہ کے بدن سے جو خون خارج ہوا تھا اس نے مقتولہ کے لباس کے ساتھ ساتھ بستر کے کچھ حصے کو بھی آلودہ کر دیا تھا لیکن میری حیرت کا سبب یہ نکتہ تھا کہ ایسا محسوس ہوتا تھا، مقتولہ نے خنجر کھانے کے بعد کوئی حرکت نہ کی ہو، اس نے خاموشی اور سکون سے لیٹ کر موت کو خوش آمدید کہا ہو، ورنہ خنجر گھونپنے کے نتیجے میں جو موت واقع ہوتی ہے اس میں مضروب شخص بہت تڑپتا پھڑکتا ہے اور ان بے ہنگام حرکات کے سبب اس کے جسم سے خارج ہونے والا خون بے سمت اُڑتا اور پھیلتا ہے۔ جب کہ ڈاکٹر عطیہ کی موت کے سلسلے میں ایسے شواہد نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس کے برخلاف بستر کی چادر پر افراتفری کے آثار واضح طور پر دکھائی دے رہے تھے۔ چادر کی بے ترتیب شکنیں بتاتی تھیں کہ وہاں اچھی خاصی دھینگا مشتی کی گئی تھی۔

فوری طور پر میری سمجھ میں یہی آیا کہ عین ممکن ہے موت کے گھاٹ اتارنے سے پہلے ڈاکٹر عطیہ کو بے سُدھ کر دیا گیا ہو، اس کے بعد اس کے سینے میں خنجر اتارا گیا ہو۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اس راز سے پردہ اٹھا سکتی تھی کہ مقتولہ کو بے سدھ کرنے کے لئے کون سا طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔

میں لاش کے تنقیدی جائزے میں مصروف تھا۔ مقتولہ کی گردن پر میری نگاہ ٹک کر رہ گئی۔ مجھے اس کے گلے پر کچھ ایسے آثار نظر آئے جیسے کسی نے اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی ہو۔ ایک دو جگہ پر ناخن کے سبب بننے والی خراشیں بھی موجود تھیں۔ بے ساختہ میرے ذہن میں یہ خیال چمکا کہ ہو نہ ہو، عطیہ کے سینے میں خنجر گھونپنے سے قبل گلا دبا کر اسے بے بس کیا گیا ہو!

یہ خاصا قوی اور قرین قیاس خیال تھا۔ میں نے حوالدار سے کہا کہ وہ جائے واردات کا نقشہ بنائے اور خود خانہ تلاشی میں مصروف ہو گیا۔ اس دوران میں خنجر اور گلا گھونٹنے والا خیال میرے ذہن میں مسلسل گردش کرتا رہا۔ آج کل کی طرح اس زمانے میں فنگر پرنٹس اٹھانے کا رواج نہیں تھا، عدالت بھی ایسے ثبوت و شواہد کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتی تھی۔ لہٰذا میں نے اس تردد میں پڑنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

پولیس ڈیپارٹمنٹ کو آج کل جرائم کی بیخ کنی کے سلسلے میں بے پناہ آسانیاں اور سہولیات میسر ہیں لیکن اس کے باوجود بھی یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ جرائم کی تعداد میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا ہے۔ پتہ نہیں اس میں پولیس ڈیپارٹمنٹ کا قصور ہے یا یہ اس قوم کی اجتماعی بدقسمتی ہے کہ ہم زندگی کے ہر شعبے میں ترقی معکوس کے کچھ "عادی" سے ہو گئے ہیں۔ اللہ رحم کرے!

سامنے والا کمرا جو کلینک کے طور پر استعمال ہوتا تھا اس کا ایک دروازہ باہر مین بازار کی جانب کھلتا تھا اور دوسرا دروازہ اندر صحن کی طرف۔ باہر والے دروازے سے مریضوں کی آمدورفت ہوتی تھی اور اندرونی دروازہ ڈاکٹر عطیہ کے ذاتی استعمال کے لئے تھا۔ کلینک والے حصے میں مجھے کوئی خاص شے نہ مل سکی اور میں اندر والے کمرے میں آ گیا۔ اس دوران میں حوالدار اپنے کام میں مصروف رہا۔

اس عقبی کمرے میں ایک پلنگ بچھا تھا اور اسی پلنگ کے اوپر ڈاکٹر عطیہ کی لاش پائی گئی تھی۔ کمرے میں دیگر چھوٹے موٹے سامان کے علاوہ دیوار کے ساتھ ایک بڑی چوبی الماری ایستادہ تھی جو اتفاق سے کھلی ہوئی تھی۔ میں باریک بینی سے مذکورہ الماری کی تلاشی لینے لگا۔ پندرہ بیس منٹ کی کوشش کے بعد بھی کوئی قابل ذکر مفید چیز میرے ہتھے نہ چڑھ سکی تو میں نے الماری بند کر دی۔ اس الماری میں ڈاکٹر عطیہ کے استعمال کے کپڑے، دواؤں کا کچھ اسٹاک اور روزمرہ استعمال کی اشیاء کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔

میں زندگی میں پہلی مرتبہ ڈاکٹر عطیہ چوہان کو دیکھ رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر تیس کے قریب رہی ہو گی۔ وہ مضبوط کاٹھی کی مالک ایک دراز قد عورت تھی۔ اس کے بال بوائے کٹ انداز میں ترشے ہوئے تھے۔ بہ حیثیت مجموعی وہ ایک خوبصورت اور پُرکشش عورت تھی۔ یہ وہی عورت تھی جس نے اپنے کاز کی خاطر شوہر اور بیٹی کو تین سال قبل چھوڑ دیا تھا۔ آج اس سے وہ دنیا چھوٹ گئی تھی جہاں وہ اپنے کاز کے لئے کوشاں تھی۔

موقع کی کارروائی مکمل ہو چکی تو میں نے کلینک کے باہر جمع افراد میں ایک مرتبہ پھر نادر خان کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ مجھے کہیں بھی نظر نہیں آیا چنانچہ میں نے لاش کو حوالدار محمد بوٹا کی نگرانی میں پوسٹ مارٹم کے لئے سرکاری ہسپتال بھجوا دیا۔

رحمو دودھی اور صابر علی کو میں تھانے بٹھا آیا تھا۔ ان کے مفصل بیانات میں واپس جا کر ہی قلم بند کر سکتا تھا۔ میں نے موقع پر موجود افراد میں سے تین چار سے قتل کی اس

PDF LIBRARY 0333-7412793

واردات کے بارے میں مختلف سوالات کئے لیکن کام کی کوئی بات پتہ نہ چل سکی۔ اسی دوران میں صابر کا بیٹا نذیر میرے ہتھے چڑھ گیا۔ یہ وہ شخص تھا جس نے سب سے پہلے ڈاکٹر عطیہ کی لاش کو دیکھا تھا لہٰذا اس کا انٹرویو بہت ضروری تھا۔

نذیر کی عمر اگرچہ پندرہ سال تھی لیکن اچھی صحت کے باعث وہ اٹھارہ اُنیس کا دکھائی دیتا تھا۔

میں نے تھوڑی دیر تک اسے اِدھر اُدھر کی باتوں میں گھمایا پھر اصل موضوع کی طرف لے آیا۔ ''نذیر پتر! اچھی طرح سوچ کر بتاؤ، تم ڈاکٹر عطیہ کے گھر میں کیسے داخل ہوئے تھے؟''

نذیر اپنے چہرے کے تاثرات سے خاصا نڈر اور ہمت والا نظر آتا تھا، مضبوط لہجے میں بولا۔ ''تھانے دار جی! میں دیوار ٹپ (پھلانگ) کر ادھر پہنچا تھا۔

''دیوار پھلانگ کر کیوں؟'' میں نے سوال کیا۔ ''کیا باہر والا دروازہ بند تھا؟''

''یہ تو مجھے پتہ نہیں جی۔'' وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ''ابا نے مجھ سے کہا تھا، میں دیوار ٹپ کر ادھر جاؤں اور دیکھ کر آؤں کہ ڈاکٹرنی کا کیا حال ہے۔ میں نے ابا کی بات مانی اور اچک کر دیوار پر چڑھ گیا پھر بڑی آسانی سے ڈاکٹرنی کے گھر میں اتر گیا۔

دودھی رحمو کا بیان تھا، متعدد بار دستک کے باوجود بھی ڈاکٹر عطیہ نے دروازہ نہیں کھولا تھا۔ اس کا سیدھا سیدھا مطلب یہی تھا کہ وہ دروازہ اندر سے بند تھا اور یہ نکتہ میرے ذہن میں چبھ رہا تھا، میری سوچ میں کھٹکن پیدا کر رہا تھا۔ قاتل اگر دروازے سے باہر نکلا تھا تو پھر دروازے کو اندر سے بند نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اس روشنی میں دھیان خود بہ خود اس طرف چلا جاتا تھا کہ کہیں قاتل دیوار پھاند کر تو وہاں سے رخصت نہیں ہوا...... اس طرف کی دیوار یا پھر اُس جانب کی دیوار! اس طرف صابر علی کا گھر تھا اور اُس جانب والا گھر کافی دنوں سے بند پڑا تھا، وہاں کوئی رہائش پذیر نہیں تھا۔ میں نے ان تمام حقائق کو ذہن میں رکھتے ہوئے نذیر سے سوال کیا۔

''تمہاری واپسی کیسے ہوئی تھی؟''

شاید وہ میری بات کو سمجھ نہ سکا، الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے اسی کے انداز میں کہا۔ ''کیا تم دیوار ٹپ کر ہی واپس آئے تھے؟''

''نہیں جی...... میں تو دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا۔'' وہ سادگی سے بولا۔

''کیا مطلب...... کون سا دروازہ؟''

''باہر والا دروازہ جناب۔''

''کیا وہ دروازہ اندر سے بند تھا؟''

''جی، دروازے کو اندر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔

''لیکن...... تھوڑی دیر پہلے تو تم نے بتایا ہے کہ تمہیں یہ بات پتہ نہیں تھی، بیرونی دروازہ بند تھا یا کھلا ہوا؟'' میں نے کڑے تیوروں سے گھورا۔

وہ بڑی معصومیت سے بولا۔ ''جناب! میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ جب میں دیوار ٹپ کر ڈاکٹرنی کے گھر میں اُترا تھا تو اس وقت مجھے بالکل پتہ نہیں تھا کہ اس کے گھر کا دروازہ کھلا ہے یا بند! جب ابا نے مجھے دیوار ٹپ کر ادھر جانے کو کہا تو میں نے یہی سمجھا کہ دروازہ اندر سے بند ہے۔'' وہ ایک لمحے کو رکا پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''یہ تو واپس آتے ہوئے مجھے پتہ چلا کہ دروازے کو اندر سے کنڈی لگی ہوئی ہے۔ میں نے کنڈی کھولی اور باہر آ گیا۔ اس میں میرا بھلا کیا قصور ہے؟''

وہ بات ختم کر کے شاکی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کے الفاظ سے سچائی ٹپکتی تھی۔ اس وقت ہم باہر مین بازار میں کھڑے تھے۔ میں نے نذیر کا کندھا تھپتھپایا اور تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''تمہارا کوئی قصور نہیں ہے پتر! تم آؤ میرے ساتھ۔''

میں نذیر کو اپنے ہمراہ رکھتے ہوئے ڈاکٹر عطیہ کے گھر کے بیرونی دروازے کے پاس آ گیا۔ میں پہلے اس دروازے کا تفصیلی جائزہ نہیں لے سکا تھا لیکن نذیر کے بیان کے بعد جو حالات سامنے آئے تھے ان کے پیش نظر وہ دروازہ خصوصی توجہ کا متقاضی ہو گیا تھا۔

میں نے اندر اور باہر دونوں جانب سے اس دروازے کا باریک بینی سے معائنہ کیا اور ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ اس دروازے کے عین وسط میں لٹو والی کنڈی نصب تھی۔ مذکورہ کنڈی ایک مخصوص ساخت اور فعل کی حامل ہوتی ہے۔ اس کا لٹو اندر اور باہر دونوں سمت سے گھمایا جا سکتا ہے۔ اس لٹو کے گھومنے سے کنڈی کا لیور گرایا اور اٹھایا جا سکتا ہے...... بہ الفاظ دیگر اس دروازے میں اندر سے لگی ہوئی کنڈی کے لٹو کو گھما کر باہر سے کھولا جا سکتا تھا۔ اسی طرح دروازے سے باہر رہتے ہوئے لٹو کی مدد سے دروازے کی اندرونی کنڈی لگائی جا سکتی تھی۔

اب یہ بات واضح ہو گئی کہ قاتل نے اس گھر سے رخصت ہوتے وقت دروازے کو

PDF LIBRARY 0333-7412793

اندر سے کس طرح بولٹ کر دیا تھا۔ یہ نہایت ہی آسان اور عام سی بات تھی۔

میں دروازے کے معائنے سے نمٹ کر نذیر کی جانب متوجہ ہوا ہی تھا کہ ایک نسوانی آواز نے اسے پکار لیا۔ ''نذیر پتر! تم پولس والوں کے ساتھ کھڑے کیا کر رہے ہو ...... یہ تمہارا ابا کدھر ہے؟''

اس عورت کے طرزِ تخاطب سے میں سمجھ گیا کہ وہ نذیر کی ماں یعنی صابر علی کی بیوی ہو گی۔ اس پکار پر نذیر اپنے گھر کی طرف منہ کر کے جلدی سے بولا۔ ''آتا ہوں اماں!'' پھر اس نے اجازت طلب نظر سے میری جانب دیکھا۔

میرے ذہن میں اچانک یہ خیال آیا کہ کیوں نہ صابر کی گھر والی سے دو چار باتیں کر لوں۔ عورتوں میں تجسس کا مادہ بہ نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ اور یہ مخلوق ایک دوسرے کی ٹوہ میں رہنے کی بھی شوقین ہوتی ہے۔ عین ممکن ہے نذیر کی ماں سے کوئی ایسی بات معلوم ہو جائے جو ڈاکٹر عطیہ کے قتل پر روشنی ڈال سکے۔ اسی امکان کے پیش نظر میں نے نذیر سے کہا۔

''پتر! میں تمہاری ماں سے دو چار باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تمہارے گھر میں بیٹھنے کی کوئی جگہ ہے؟''

''ہاں جی، ہماری بیٹھک میں بیٹھ سکتے ہیں۔'' اس نے مثبت انداز میں جواب دیا پھر متاملانہ لہجے میں بولا۔ ''میں پہلے اماں سے پوچھ لوں۔''

''ضرور پوچھو برخوردار!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ میری تائید پا کر اپنے گھر کی جانب بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں صابر علی کی کشادہ بیٹھک میں ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ پہلے زمانے میں جو کمرہ بیٹھک کے نام سے موسوم ہوا کرتا تھا آج کل کے رواج کے مطابق اسے ڈرائنگ روم کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔

صابر علی کی بیوی کا نام شہناز معلوم ہوا۔ وہ اس وقت خاصی تشویش میں مبتلا تھی۔ وہ گویا ہوئی تو مجھے یہ اندازہ لگانے میں ذرا بھی دقت کا سامنا نہیں ہوا کہ نذیر اسے صابر کے بارے میں بتا چکا تھا۔ اس نے چھوٹتے ہی بڑے ترش لہجے میں پوچھا۔

''تھانے دار جی! اگر کسی نامراد نے ڈاکٹرنی کو قتل کر دیا ہے تو اس میں ہمارا کیا دوش ہے ...... آپ نے میرے گھر والے کو تھانے میں کیوں بند کر دیا ہے؟''

میں نے رسانیت سے کہا۔ ''میں نے تمہارے خاوند کو حوالات میں نہیں ڈالا بلکہ بڑی عزت سے وہاں بٹھا رکھا ہے ...... اور وہ بھی ضروری بیان کے لئے۔ تم صابر کے لئے

زیادہ فکرمند نہ ہو۔ میں تھانے پہنچتے ہی اسے فارغ کر دوں گا۔'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر شہباز سے پوچھا۔

''تم اس واقعے کے بارے میں کیا جانتی ہو؟''

''میں بھی اتنا ہی جانتی ہوں جتنا دوسرے لوگ جانتے ہیں۔'' وہ بیزاری سے بولی۔

''ڈاکٹرنی کے قتل سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔''

''پھر کس کا تعلق ہے؟'' میں نے اچانک سوال کیا۔

''مجھے کچھ پتہ نہیں جی۔ میرا اس سے زیادہ میل جول نہیں تھا۔''

میں نے چند لمحے سوچنے کے بعد پوچھا۔ ''تم ڈاکٹر عطیہ کے قاتل کے بارے میں کوئی اندازہ تو لگا سکتی ہو۔ میں اس سلسلے میں تمہاری رائے جاننا چاہتا ہوں۔''

وہ اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ ''تھانے دار جی! میں کسی پر شک ظاہر کر کے خوامخواہ گنہگار نہیں ہونا چاہتی۔ آپ پولیس والے ہیں، خود ہی اس ڈاکٹرنی کے قاتل کو پکڑنے کی کوشش کریں۔''

''قاتل کو تو میں پکڑ ہی لوں گا شہناز!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

''لیکن لگتا ہے تم قانون سے تعاون کرنے کو تیار نہیں ہو؟''

''توبہ، توبہ......'' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے کانوں کو چھوتے ہوئے بولی۔ ''تھانے دار جی! میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔ آپ خواہ مخواہ مجھے ڈرانے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟''

میں نے اس کی سراسیمگی کو نظر انداز کرتے ہوئے ٹھوس لہجے میں دریافت کیا۔ ''یہ نیاز علی کیسا بندہ ہے؟''

''نیاز علی ......کون نیاز علی؟'' وہ الجھن بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میں زبین کے گھر والے کی بات کر رہا ہوں۔''

نیاز علی لگ بھگ دو ماہ پہلے ڈاکٹر عطیہ کے خلاف ایک سنجیدہ شکایت لے کر میرے پاس آیا تھا۔ وہ خاصا برہم نظر آتا تھا۔ وہ اپنے دل میں ڈاکٹر عطیہ کے لئے بہت غم و غصہ رکھتا تھا۔ میں پچھلے صفحات میں نیاز علی کے مسئلے کو تفصیلاً بیان کر چکا ہوں۔ ابھی قاتل کی تلاش کے سلسلے میں سوچ بچار کے دوران میں اچانک میرا دھیان نیاز علی کی طرف چلا گیا تھا۔ مجھے معلوم تھا، نیاز اور زبین اولاد جیسی نعمت سے محروم تھے اور ڈاکٹر عطیہ علاج معالجے

PDF LIBRARY 0333-7412793

کی آڑ میں زبین کو جس نوعیت کی پٹی پڑھا رہی تھی اس کے ردِ عمل کے طور پر نیاز علی کوئی بھی سنگین قدم اٹھا سکتا تھا۔

''اچھا اچھا...... آپ نیاجا کی بات کر رہے ہیں۔'' شہناز زبین کا حوالہ سننے کے بعد تیزی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''نیاز علی تو شاید ہی کوئی اسے کہتا ہو، وہ نیاجا مشہور ہے۔ آپ اس کے بارے میں مجھ سے کیا پوچھ رہے ہیں؟''

میں نے پوچھا ہے تم سے، نیاز علی عرف نیاجا کیسا بندہ ہے؟'' میں نے کہا۔ ''کہیں اسی نے تو ڈاکٹر عطیہ کو......؟''

میں نے دانستہ سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ وحشت زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کک...... کیا نیاجا...... ایسا کر سکتا ہے؟''

''یہی تو میں تم سے پوچھ رہا ہوں اللہ کی بندی!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے قدرے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''میرے خیال میں تو نیاز یہ قدم اٹھا سکتا ہے!''

اس کی سراسیمگی میں اضافہ ہو گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ میرے سوال کے جواب میں لب کھولتی میں نے اس کے چہرے کے تاثرات میں ایک نمایاں تغیر رونما ہوتے دیکھا۔ خوف آمیز تاثرات میں اچانک چونکنے کی کیفیت شامل ہو گئی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے ذہن میں کوئی اچھوتا خیال پیدا ہوا ہو۔

میں نے اس کے بولنے سے قبل ہی پوچھ لیا۔ ''شہناز! لگتا ہے تم مجھے کوئی نہایت ہی اہم بات بتانے والی ہو؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ نے نیاجا کا ذکر کیا ہے تو میرا دھیان کل رات والے واقعے کی طرف چلا گیا ہے۔ پتہ نہیں وہ نیاجا ہی تھا یا کوئی اور بندہ!'' آخری جملہ شہناز نے بڑے الجھے ہوئے انداز میں ادا کیا تھا۔

اس کی مبہم بات سن کر میں ریڈ الرٹ ہو گیا۔ میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔ ''تم کس واقعے کی بات کر رہی ہو؟''

وہ بولی۔ ''کل رات ڈاکٹرنی کسی مرد سے جھگڑا کر رہی تھی۔ میں نے انہیں دیکھا نہیں، صرف ان کے غصے میں تیز تیز بولنے کی آوازیں سنی تھیں۔ اب سوہنے رب ہی کو پتہ ہو گا کہ ڈاکٹرنی نیاجا سے منہ ماری کر رہی تھی یا وہ کوئی اور بندہ تھا!''

شہناز کے اس سنسنی خیز انکشاف نے مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے پوچھا۔ ''وہ جو کوئی بھی تھا، ڈاکٹر عطیہ سے کہاں جھگڑا

کر رہا تھا...... اور رات کو کس وقت؟''

''تھانے دار جی!'' وہ بڑی رسانیت سے مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ''اس جھگڑے کی آوازیں کلینک والے کمرے سے آ رہی تھیں اور...... میرا خیال ہے اس وقت رات کے آٹھ بجے ہوں گے۔''

بات ختم کر کے وہ خاموش ہوئی اور متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی نظر میں ایک توقع پائی جاتی تھی جیسے وہ میرے منہ سے کوئی بڑا انکشاف سننے کی متمنی ہو۔ میں نے بہ دستور اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

''کیا تم نے پوری توجہ سے انہیں جھگڑتے ہوئے سنا تھا؟ ان کی تلخ و ترش باتیں تمہارے پلّے تو پڑی ہوں گی؟''

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''نہ جی...... میں نے ان کے جھگڑے پر زیادہ دھیان نہیں دیا اس لئے میں نہیں جانتی وہ کس بات پر لڑائی کر رہے تھے۔ ویسے بھی......'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ ''ان کی آوازیں تھوڑی دیر بعد آنا بند ہو گئی تھیں۔''

میں نے صابر علی کی بیوی شہناز سے چند اور متعلقہ سوالات کئے پھر اس کے گھر سے نکل آیا۔

تھانے میں رحمو دودھی اور صابر علی میرے انتظار میں سوکھ رہے تھے۔ میں نے وہاں پہنچتے ہی انہیں باری باری اپنے کمرے میں بلا لیا۔ مزید پوچھ گچھ کے نتیجے میں بھی کوئی نئی اور مفید بات سامنے نہ آ سکی۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ دونوں کسی بھی طور ڈاکٹر عطیہ کے قتل میں ملوث نہیں تھے۔ میں نے ضروری تاکید کے ساتھ انہیں اپنے گھروں کو جانے کی اجازت دے دی تاہم بہ وقت رخصت میں نے صابر علی سے ایک استفسار ضرور کیا۔

''صابر! تمہاری گھر والی کی زبانی مجھے پتہ چلا ہے کہ کل رات آٹھ بجے ڈاکٹر عطیہ کے کلینک میں کوئی شور شرابا سنا گیا ہے۔ ڈاکٹر عطیہ کسی مرد سے جھگڑا کر رہی تھی...... یہ کیا قصہ ہے بھئی؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''شہناز نے مجھ سے بھی اس واقعے کا ذکر کیا تھا لیکن میں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی۔''

ایک لمحے کے توقف سے وہ اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میں پرائے پھڈے میں ٹانگ پھنسانے کا عادی نہیں ہوں تھانے دار صاحب! اس لئے میں نے بیوی کی بات کو ایک

PDF LIBRARY 0333-7412793

کان سے سنا اور دوسرے سے نکال دیا۔"

"تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے تم نے خود ڈاکٹر عطیہ کو کسی مرد سے جھگڑتے سنا ہے اور نہ ہی دیکھا ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "بلکہ یہ سارا قصہ شہناز کے توسط سے تم تک پہنچا ہے؟"

اس نے اثبات میں گردن ہلا کر میرے اندازے کی تصدیق کر دی۔

صابر علی اور رحمو دودھی کے جانے کے بعد میں نے یکے بعد دیگرے دو کانسٹیبلز کو اپنے کمرے میں بلایا اور انہیں دو افراد کو تھانے لانے کے لئے روانہ کر دیا۔ میرے ان دو مطلوبہ افراد میں ایک تو نیاز علی عرف نیاجا تھا اور دوسرا شخص تھا نادر خان!

میں نادر خان کی طرف سے خاصا تشویش میں مبتلا تھا۔ وہ اس علاقے میں ڈاکٹر عطیہ کا سب سے بڑا خیر خواہ تھا اور ابھی تک منظر سے غائب تھا۔ میں نے جائے وقوعہ پر بھی اسے تلاش کرنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ یہ تو ممکن نہیں تھا ڈاکٹر عطیہ والے واقعے کی ابھی تک اسے خبر نہ ہوئی ہو۔ آج صبح ہی صبح یہ معاملہ سامنے آ گیا تھا اور اب تک تو اس قصبے کا ایک ایک فرد ڈاکٹر عطیہ کے قتل سے آگاہ ہو چکا تھا۔ نادر خان کی جانب سے یہ پراسرار خاموشی میرے دل و دماغ میں انجانے اندیشوں کو ابھار رہی تھی اور میں پہلی فرصت میں اپنے دماغ و دل کو صاف کر لینا چاہتا تھا۔

※☆※

دوپہر کے بعد حوالدار محمد بوٹا ہسپتال سے واپس آ گیا اور اس نے بتایا کہ پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ کل مل جائے گی اور کل شام تک مقتولہ ڈاکٹر عطیہ کی لاش بھی ہمارے حوالے کر دی جائے گی۔ بوٹا میرے کمرے میں ہی بیٹھ گیا اور ہمارے درمیان عطیہ مرڈر کیس پر بات چیت ہونے لگی۔

تھوڑی دیر بعد وہ کانسٹیبل واپس آ گیا جسے میں نے نادر خان کی طرف روانہ کیا تھا۔ اس نے بتایا کہ نادر خان قصبے میں موجود نہیں۔ وہ کل صبح یعنی سات اکتوبر کو ایک ضروری کام سے منڈی لالہ موسیٰ گیا ہوا ہے۔ اسے کل شام ہی واپس آنا تھا لیکن نہیں پہنچا۔ امید ہے آج وہ کسی بھی وقت یہاں پہنچ جائے گا۔ اس اطلاع سے واضح ہو گیا کہ نادر خان آج کہیں نظر کیوں نہیں آیا تھا!

میں نے کانسٹیبل سے پوچھا۔ "تم خان کی دکان پر گئے تھے یا گھر؟"

"میں پہلے ادھر پرانی غلہ منڈی میں اس کی دکان پر گیا تھا ملک صاحب!" کانسٹیبل

نے بتایا۔ "اس کے بعد گھر کا چکر بھی لگایا ہے۔ دونوں جگہوں سے مجھے ایک ہی جواب ملا ہے۔ میں نے دکان پر منشی شوکت سے اور گھر میں خان صاحب کی بیوی نگہت سے کہہ دیا ہے کہ جیسے ہی خان صاحب واپس آئیں، انہیں تھانے بھیج دیا جائے۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا ہے۔" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

کانسٹیبل میرے کمرے سے نکل گیا تو میں دوبارہ حوالدار سے اس گمبھیر صورت حال پر گفت و شنید کرنے لگا۔ حوالدار ڈاکٹر عطیہ اور قصبے کے حالات سے پوری طرح آگاہ تھا۔ اس نے بات چیت کے نتیجے میں اپنا فتویٰ جاری کر دیا۔

"ملک صاحب! ڈاکٹر عطیہ کا قاتل تین افراد میں سے کوئی ایک ہو سکتا ہے!"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "کون سے تین افراد؟"

اس نے ٹھہر ٹھہر کر یہ تین نام دہرا دیئے۔ "نیاز علی ...... وحید اللہ ...... نادر خان۔"

حوالدار کے انکشاف نما فتوے نے مجھے گہری سوچ میں ڈال دیا۔ اس نے بڑی اُلجھی ہوئی بات کی تھی۔ نیاز علی تو میری بھی ہٹ لسٹ پر تھا لیکن وحید اللہ اور نادر خان کسی پیمائش میں نہیں آ رہے تھے۔ نادر خان تو ڈاکٹر عطیہ کا ہمدرد اور سچا خیر خواہ تھا۔ ویسے میں نے اپنے طور پر خان کے بارے میں بھی خاصی تحقیق کی تھی۔ ایک لمحے کو مجھے بھی محسوس ہوا تھا کہ کہیں وہ بھولے بادشاہ بن کر کوئی خطرناک کھیل تو نہیں کھیل رہا؟ لیکن میری تفتیش نے مجھے بتایا تھا، نادر خان اچھے کردار کا مالک ایک ہمدرد انسان تھا اور ڈاکٹر عطیہ سے اس کے خلوص میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی اور جہاں تک ڈاکٹر عطیہ کے شوہر وحید اللہ کا تعلق تھا تو وہ عرصہ تین سال سے اپنی بیوی سے دور تھا۔ یہ بات بھی سمجھ میں اترنے والی نہیں تھی کہ اچانک وہ شخص لاہور سے شیخوپورہ کے اس قصبے میں پہنچے اور ڈاکٹرنی عطیہ کو قتل کر کے واپس چلا جائے۔

میں نے اپنی رائے اور خیالات سے حوالدار بوٹا کو آگاہ کیا تو وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "ملک صاحب! نیاز علی کی طرف تو سیدھا سیدھا دھیان جاتا ہے اور نادر خان و وحید اللہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ممکن ہے تین سال بعد اچانک وحید اللہ کی غیرت نے جوش مارا ہو اور وہ بیوی کو کھری کھری سنانے یہاں آ پہنچا ہو۔ آپ نے ڈاکٹر عطیہ اور کسی مرد کے جھگڑے کی جو بات بتائی ہے وہ بھی اس کی طرف اشارہ کرتی ہے۔" وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"اور پھڈا جھگڑا کرنے والا نادر خان بھی ہو سکتا ہے۔ بہرحال میرے ذہن میں جو کچھ

PDF LIBRARY 0333-7412793

تھا وہ میں نے آپ کے سامنے رکھ دیا ہے ملک صاحب!"

میں نے کہا۔ "محمد بوٹا! نادر خان کل سے منڈی لالہ موسیٰ گیا ہوا ہے اور ابھی تک واپس نہیں پلٹا۔ تم نے ابھی تھوڑی دیر پہلے کانسٹیبل کی رپورٹ نہیں سنی؟"

"سنی ہے ملک صاحب!" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "پر میں کیا کروں، میرا دماغ اسی انداز میں سوچ رہا ہے۔ اگر نادر خان ہی ڈاکٹر عطیہ کا قاتل ہے تو اس کا منڈی لالہ موسیٰ جانا ایک بہانہ بھی تو ہوسکتا ہے۔ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت وہ سب کو یہ بتا کر غائب ہوسکتا ہے کہ وہ منڈی لالہ موسیٰ جا رہا ہے۔ اس کے بیان کو چیک کرنے کون لالہ موسیٰ جائے گا۔"

"میں جاؤں گا۔" میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ "اگر مجھے ذرا سا بھی شبہ ہوگیا کہ نادر خان کسی بھی حوالے سے اس قتل میں ملوث ہے تو لالہ موسیٰ کیا، میں دنیا کے آخری کنارے تک اس کا پیچھا کروں گا۔ مگر تم ایک بات بھول رہے ہو حوالدار بوٹا!"

میں چند لمحات تک خاموش رہ کر سوچتی ہوئی نظر سے محمد بوٹا کو دیکھتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس قصبے میں اگر ڈاکٹر عطیہ کا کوئی حقیقی خیر خواہ تھا تو وہ نادر خان کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ تم ان دونوں کی کہانی سے اچھی طرح واقف ہو۔"

ہوسکتا ہے حوالدار اپنے موقف کے حق میں کوئی لمبی چوڑی تاویل پیش کرتا کہ ہماری باہمی گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ ایک کانسٹیبل میرے کمرے میں داخل ہوا اور اس نے آ کر بتایا۔

"ملک صاحب! میں نیاز علی کو پکڑ کر لے آیا ہوں۔"

یہ وہی کانسٹیبل تھا جسے میں نے نیاز کی جانب روانہ کیا تھا۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔ "اتنی دیر کہاں لگ گئی؟ تم تو بہت پہلے اسے لینے گئے تھے؟"

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ملک صاحب! نیاز اپنے گھر پر موجود نہیں تھا۔ اسے ڈھونڈنے میں کافی وقت خرچ ہوگیا۔ اب جا کر ملا ہے تو پکڑ کر سیدھا تھانے لے آیا ہوں۔"

"یہ تمہیں کہاں سے ملا ہے؟" میں نے استفسار کیا۔

کانسٹیبل نے جواب دیا۔ "جناب! یہ ادھر بشیر نائی کی دکان کے سامنے بیٹھا تاش کھیل رہا تھا۔"

"اس کے ساتھ اور کون تھا؟"

کانسٹیبل نے چار پانچ نام گنوا دیئے۔

میں نے پوچھا۔ "یہ لوگ روکھی سوکھی تاش کھیل رہے تھے یا......؟"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ کانسٹیبل فوراً میری بات کی تہہ تک پہنچ گیا اور بڑے ولولہ انگیز لہجے میں بولا۔ "جناب! اگر یہ لوگ کچھ لگا کر کھیل رہے ہوتے تو پھر میں خالی خولی نیاز کو ہی پکڑ کر نہ لاتا بلکہ ان سب کو بھیڑ بکری کی طرح آگے دھر کے آپ کی خدمت میں پہنچا دیتا۔"

میں نے کانسٹیبل کے جذبے کو ستائشی الفاظ میں سراہا اور کہا۔ "ٹھیک ہے، تم نیاز علی کو میرے پاس بھیج دو۔"

کانسٹیبل مجھے سلیوٹ کرنے کے بعد کمرے سے نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد نیاز علی میرے سامنے حاضر تھا۔ وہ خاصا بوکھلایا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ پہلی مرتبہ جب میرے پاس ڈاکٹر عطیہ کی شکایت لے کر آیا تھا تو میں بڑی گرم جوشی سے ملا تھا اور اسے بیٹھنے کے لئے کرسی بھی پیش کی تھی لیکن اب وہ میرے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر خاصا گھبرا گیا تھا۔ اس نے میرے کہے بغیر ایک کرسی کھینچ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو حوالدار نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔

"اوئے نیاز علی! بندے دے پتر کی طرح سیدھا کھڑا رہ۔ مجرموں کو ہم کرسی پیش نہیں کرتے بلکہ چھت والے کنڈے میں الٹا لٹکا دیتے ہیں۔"

وہ میری طرف دیکھتے ہوئے گھگیایا۔ "تھانے دار صاحب! یہ سب کیا ہے؟ میں نے کون سا جرم کیا ہے؟ میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا جا رہا ہے؟"

میں اب تک اسے خاموش نظر سے گھور رہا تھا۔ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "جرم تم کرو اور بتائیں ہم کہ تم نے کیا، کیا ہے۔ کیا تم لاٹ صاحب کی اولاد ہو؟"

"جناب! آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔" وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ "تاش کھیلنا کوئی جرم تو نہیں۔ اللہ پاک کی قسم ہم جوا نہیں کھیل رہے تھے۔"

نیاز علی ہماری اس سنگین باز پرس کو کسی اور کھاتے میں لے گیا تھا۔ میں نے اس کے کانوں کے کیڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے جس جرم کی بات کر رہا ہوں اس کا تعلق تاش کھیلنے سے نہیں بلکہ ڈاکٹر عطیہ کے قتل سے ہے۔ بتاؤ تم نے ڈاکٹر عطیہ کو کیوں قتل کیا؟"

PDF LIBRARY 0333-7412793

میرے آخری جملے نے کسی ہتھوڑے کا سا کام کیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی کھوپڑی پر اچانک بھاری ضرب لگی ہو۔ بکھری ہوئی آواز میں اس نے کہا۔

”تھانے دار جی! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ...... میں نے ڈاکٹرنی کو قتل نہیں کیا جناب۔ آپ کو کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔“

”اوئے غلط فہمی کی اولاد......“ میں نے اسے گھرکا۔ پھر اندھیرے میں ایک تیر چلاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے کوئی غلط فہمی نہیں بلکہ تمہارے بارے میں پکی اطلاع ملی ہے۔“

میں نے لمحاتی توقف دے کر اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہاں الجھن اور فکرمندی کے سوا مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔

”مجھے پتہ چلا ہے تم کل رات لگ بھگ آٹھ بجے ڈاکٹر عطیہ کے کلینک پر گئے تھے۔ کسی بات پر تم دونوں کے بیچ تلخ کلامی ہوئی اور ......تم نے ڈاکٹر عطیہ کو قتل کر دیا!“

اس کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی۔ پل بھر میں وہ برسوں کا بیمار دکھائی دینے لگا۔ اس کی صحت پہلے ہی ماشاء اللہ تھی۔ وہ خوف زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔

”تھانے دار صاحب! میں رب دی سوں (قسم) کھا کر کہتا ہوں ...... ڈاکٹرنی کے قتل سے میرا کوئی تعلق نہیں اور ...... یہ جو جھگڑے والی بات بتا رہے ہیں یہ بھی بالکل جھوٹی ہے۔ میں ڈاکٹرنی کے کلینک پر گیا ہوں اور نہ ہی اس سے کوئی لڑائی جھگڑا کیا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے میں تم سے جھوٹ بول رہا ہوں؟“ میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔

وہ گھگیایا۔ ”جناب! میں آپ کو جھوٹا نہیں کہہ رہا۔ آپ میری بات کا یقین کریں آپ کو کسی نے میرے بارے میں غلط اطلاع دی ہے۔ میں ڈاکٹرنی کے پاس نہیں گیا۔“

”پھر تم کل رات آٹھ بجے کہاں تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں اپنے گھر پر تھا سرکار!“

”تمہارے گھر میں اور کتنے افراد ہیں؟“

”بس میں اور میری بیوی زیبن۔“ اس نے بتایا۔ ”آپ زیبن سے میری بات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ میں کل شام سے پہلے گھر آ گیا تھا اور پھر آج صبح ہی گھر سے نکلا

ہوں۔“

وہ ایک بہت ہی وزنی دلیل دے رہا تھا لیکن میں نے اسے ڈرانے کا عمل جاری رکھا اور دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ”تم یہ نہ سمجھ لینا کہ میں آنکھیں بند کر کے تمہاری بات کا یقین کر لوں گا۔ میں زیبن کو تھانے بلا کر اس کا بیان بھی لوں گا۔“

”آپ ضرور اس سے پوچھیں جی۔“ وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔

حوالدار بوٹا نے نیاز علی کی نظر بچا کر ایک آنکھ دبائی اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”ملک صاحب! یہ لاتوں کا بھوت ہے، باتوں سے قابو نہیں آئے گا۔“

”پھر تم کیا چاہتے ہو؟“ میں نے حوالدار کی طرف دیکھا۔

وہ بولا۔ ”آپ ایک گھنٹے کے لئے اسے میرے حوالے کر دیں۔ میں اسے ٹرائی روم کی سیر کراتا ہوں۔ وہاں کے مناظر اتنے گویائی آور ہیں کہ میرا خیال ہے یہ ایک گھنٹے سے پہلے زبان کھول دے گا۔ آزمائش شرط ہے!

اگر حوالدار نے مجھے آنکھ نہ ماری ہوتی تو اس کے مطالبے بلکہ فرمائش کا مفہوم کچھ اور ہوتا۔ تب وہ واقعی کسی تشدد کے لئے نیاز کو ٹرائل روم میں لے جاتا۔ لیکن موجودہ صورت حال میں، میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ وہ محض ڈرانے دھمکانے کے لئے اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے تا کہ اگر وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہو تو چھپا نہ سکے چنانچہ میں نے بڑی فراخ دلی سے اسے اجازت دے دی۔

”ٹھیک ہے بھئی!“ میں نے بے پروائی سے کہا۔ ”تم لے جاؤ اسے۔ میری بات تو اس کی عقل میں بیٹھ نہیں رہی۔ ہو سکتا ہے یہ تمہاری زبان سمجھ جائے۔“

نیاز علی متوحش نظر سے باری باری ہم دونوں کو دیکھنے لگا۔ حوالدار نے اسے کالر سے دبوچا اور ایک جھٹکا دے کر گھسیٹتے کھینچتے ہوئے میرے کمرے سے باہر لے گیا۔

✲☆✲

تین سوا تین بجے نادر علی خان تھانے پہنچا۔ وہ بہت اپ سیٹ دکھائی دیتا تھا۔ وہ سیدھا میرے کمرے میں آیا اور رسمی علیک سلیک کے بعد بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ملک صاحب! یہ کیا غضب ہو گیا۔ عطیہ کی موت کا ذمہ دار کون ہے، کیا آپ نے قاتل کو گرفتار کر لیا؟“

اس نے ایک ہی سانس میں تین سوالات پوچھ ڈالے تھے۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”خان صاحب! ڈاکٹر عطیہ کے قاتل کو میں بڑی سرگرمی سے تلاش کر رہا

PDF LIBRARY 0333-7412793

ہوں۔ انشاء اللہ بہت جلد آپ اسے حوالات کی سلاخوں کے پیچھے دیکھیں گے۔" ذرا رک کر میں نے اضافہ کیا۔ "اس سلسلے میں مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔"

"میں ہر قسم کے تعاون کے لئے تیار ہوں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "بتائیں میں کیا کروں؟"

اس کے الفاظ اور آواز سے گہری فکر مندی جھلکتی تھی۔ میں نے اسے گھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "آپ غالباً اس قصبے میں موجود نہیں تھے۔ میں نے آپ کو بلانے کے لئے ایک بندہ بھی بھیجا تھا۔ شاید آپ لالہ موسیٰ گئے ہوئے تھے!"

میں نے غالباً اور شاید جیسے الفاظ دانستہ استعمال کئے تھے۔ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

"ملک صاحب! میں کل صبح لالہ موسیٰ چلا گیا تھا۔ وہاں کی غلہ منڈی میں ایک آڑھتی ہے ...... چوہدری رحمت علی۔ اس سے ایک بڑی رقم لینا تھی۔ ارادہ یہی تھا کل شام تک واپس آ جاؤں گا لیکن رحمت علی رقم کا بندوبست نہ کر سکا۔ دس ہزار روپے کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔ بہرحال میں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی گھر پہنچا ہوں ...... اور اب کھڑے کھڑے آپ کے پاس آ گیا ہوں۔"

مجھے نادر خان پر ویسے بھی کوئی خاص شک نہیں تھا لیکن چونکہ حوالدار محمد بوٹا فتویٰ دے چکا تھا اس لئے دس پندرہ منٹ تک میں نادر خان کو مختلف زاویوں سے چیک کرتا رہا اور مجھے اپنا خیال ہی درست لگا۔ اس کی پریشانی میں کوئی تصنع نظر نہیں آتا تھا۔

میں نے نادر خان کو وقوعہ کی کارروائی اور تازہ ترین حالات کے بارے میں تفصیلاً بتایا تو وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چند لمحات کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا نیاز علی نے اقرارِ جرم کر لیا ہے؟"

"وہ اس جرم سے انکاری ہے۔" میں نے بتایا۔ اس دوران میں حوالدار نے نیاز علی پر طبع آزمائی کر لی تھی جس سے کوئی مثبت نتیجہ نہیں ابھرا تھا۔ "تاہم میں اسے آسانی سے چھوڑنے والا نہیں ہوں۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

نادر خان تشویش ناک لہجے میں بولا۔ "اگر نیاز علی نے قتل نہیں کیا تو پھر ڈاکٹر عطیہ کو کس نے موت کے گھاٹ اتارا؟"

"قاتل جو کوئی بھی ہے، بہت جلد میری گرفت میں ہو گا!" میں نے کہا۔

نادر خان سوچتے ہوئے اچانک چونکا اور اضطراری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے خان صاحب؟" میں نے استفسار کیا۔

"آپ نے بتایا ہے کل رات آٹھ بجے ڈاکٹر عطیہ اپنے کلینک میں کسی مرد سے جھگڑا کر رہی تھی۔" وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ "میرے ذہن میں بار بار یہ شک اُبھر رہا ہے، ڈاکٹر سے جھگڑا کرنے والا شخص ہی اس کا قاتل ہے۔"

"میں بھی اسی انداز میں سوچ رہا ہوں۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے شک تھا، مذکورہ شخص نیاز علی ہو گا لیکن حالات و واقعات اس پر فٹ نہیں بیٹھ رہے۔ اگر وہ جھگڑالو شخص میرے ہتھے چڑھ جائے تو بہت سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔"

اس گفتگو کے دوران میں ہم دونوں ایک دوسرے کے چہرے کو بھی بغور دیکھ رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا، نادر خان کے چہرے کے تاثرات میں اچانک ایک نمایاں تبدیلی رونما ہوئی، جیسے وہ کسی خاص زاویے پر سوچ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کوئی سوال کرتا وہ ہیجانی انداز میں بولا۔

"ملک صاحب! ڈاکٹر عطیہ کا قاتل اس کا شوہر بھی تو ہو سکتا ہے!"

"آپ کا مطلب ہے، وحید اللہ؟"

"جی ...... میں اسی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ممکن ہے، وحید اللہ کل رات ڈاکٹر عطیہ کے پاس آیا ہو۔ ان میں کسی بات پر شدید اختلاف ہوا ہو جس کے نتیجے میں وحید اللہ نے اسے قتل کر دیا ہو!"

"اس بات کے امکانات تو ہیں۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بہرحال وحید اللہ کو چیک کیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ کل رات اس قصبے میں آیا تھا تو یہ حقیقت چھپی نہیں رہ سکتی۔ ویسے بھی......"

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر تھوڑا توقف کیا پھر کہا۔ "کل ڈاکٹر عطیہ کی لاش ہسپتال سے آ جائے گی۔ لاش کو اس کے وارث کے حوالے کرنے کے لئے ہمیں وحید اللہ سے رابطہ کرنا ہو گا۔ اگرچہ میاں بیوی میں گزشتہ تین سال سے علیحدگی چل رہی ہے لیکن قانوناً اور شرعاً ڈاکٹر عطیہ، وحید اللہ کی بیوی تھی ...... اور ناہید کی ماں! اس واقعے کی اطلاع ان باپ بیٹی کو دینا ہو گی۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں ملک صاحب!" وہ تائیدی انداز میں بولا۔ "میرے پاس وحید اللہ کا لاہور والا ایڈریس ہے۔ گھر کا بھی اور دکان کا بھی۔ میں یہ دونوں پتے آپ کو نوٹ کروا دیتا ہوں۔ آپ جیسے مناسب سمجھیں اس بندے کو چیک کر لیں۔"

PDF LIBRARY 0333-7412793

اس کے بعد نادر خان نے وہ دونوں پتے مجھے لکھوا دیئے اور تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھنے کے بعد رخصت ہو گیا۔ میں ڈاکٹر عطیہ کے ممکنہ قاتل تک رسائی حاصل کرنے کے لئے سوچ کے گھوڑے دوڑانے لگا۔ مذکورہ گھوڑے اگر سنجیدگی سے دوڑائے جائیں تو ضرور منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔

اسی روز شام کو دائی بشیراں اور دائی کبوتری تھانے آئیں۔ ان کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ وہ کافی فکرمند اور افسردہ نظر آتی تھیں۔ میں نے پلک جھپکتے میں اندازہ لگا لیا ان کی افسردگی کا تعلق ڈاکٹر عطیہ کے قتل سے تھا۔ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تم دونوں کے منہ کیوں لٹکے ہوئے ہیں؟ جاؤ جا کر لڈی ڈالو۔ خوشی کے گیت گاؤ۔ تمہاری دشمن کا کام تمام ہو گیا!''

''تھانے دار جی!'' بشیراں بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''ہم تو چاہتے تھے یہ ڈاکٹرنی اس قصبے سے کہیں دفع ہو جائے تاکہ ہمارا کاروبار متاثر نہ ہو۔ ہم اس کی جان کے دشمن نہیں تھے۔''

دائی کبوتری نے کہا۔ ''سچ مانیں، ہمیں ڈاکٹرنی کی موت کا بہت دکھ ہوا ہے۔ ویسے کیا آپ نے اس کے قاتل کا سراغ لگا لیا؟''

''سراغ لگا رہا ہوں۔'' میں نے باری باری ان دونوں کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''میں بہت جلد قاتل کو گرفتار کر لوں گا۔'' پھر میں نے انہیں ڈرانے کی خاطر کہا۔ ''تم لوگ بھی مشکوک افراد کی فہرست میں شامل ہو۔ تم تینوں ڈاکٹر عطیہ کے لئے اپنے دلوں میں بہت کینہ اور کدورت رکھتی تھیں۔ میں تمہیں بھی کڑی تفتیش سے گزاروں گا۔''

وہ ہاتھ جوڑ کر میری سماجت کرنے لگیں۔ ''تھانے دار صاحب! ہم غریبوں کو اس معاملے میں نہ گھسیٹیں۔ ہم ڈاکٹرنی کے بدخواہ ضرور تھے لیکن اس کی جان لینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔''

''بدخواہ ہی سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے۔'' میں نے انہی کے الفاظ لوٹاتے ہوئے کہا۔ ''بہرحال تم لوگ اس وقت تک قصبے سے باہر قدم نہیں نکالو گے جب تک میں اس کیس کی تفتیش مکمل نہیں کر لیتا۔''

''جی ... جی ... آپ جیسا کہیں گے ہم ویسا ہی کریں گے۔'' دائی کبوتری نے فرمانبرداری سے کہا۔

میں نے پوچھا۔ ''تمہاری تیسری ساتھی نظر نہیں آ رہی۔ کیا نام تھا اس کا ...... دائی

حنیفاں!''

''حنیفاں کیس کرنے گئی ہے جناب!'' دائی بشیراں نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔ ''ادھر منظور حسین وڑائچ کی گھر والی کے بچہ ہونے والا ہے۔''

میں نے موقع محل کی مناسبت سے کہہ دیا۔ ''چلو ڈاکٹر عطیہ کے قتل سے آپ لوگوں کو کوئی فائدہ تو پہنچا۔ ادھر وہ مرحوم ہوئی ادھر آپ دائیوں میں تیزی آ گئی۔''

میرے لہجے میں ایک مخصوص قسم کی کاٹ موجود تھی۔ ان دونوں نے اس کاٹ کو واضح طور پر محسوس کیا۔ وہ خاصی شرمندہ دکھائی دینے لگیں۔ کبوتری نے کہا۔

''تھانے دار جی! آپ تو ہمیں کھلم کھلا جوتے مار رہے ہیں۔''

''میں نے تو ایک حقیقت بیان کی ہے۔ تم جو بھی سمجھ لو۔'' میں نے کہا۔

بشیراں بولی۔ ''تھانے دار جی! اللہ کا کرم ہے۔ ہماری روزی روٹی چل ہی رہی ہے۔ بس اس ڈاکٹرنی کی وجہ سے کام کم ہو گیا تھا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ بالکل ہی ٹھپ ہو گیا تھا! رزق دینے والی تو وہ خدا کی ذات ہے۔''

''یہ بات اگر آپ لوگوں کی سمجھ میں آ جاتی تو ڈاکٹر عطیہ کے خلاف محاذ کیوں کھڑا کرتیں؟''

''آپ ہماری بات کو غلط رنگ میں لے رہے ہیں۔'' کبوتری نے رسانیت سے کہا۔ ''ہم ڈاکٹرنی کے خلاف نہیں تھے۔ وہ قصبے کی عورتوں کے ساتھ جو سلوک کر رہی تھی ہم نے اس رویے کے خلاف آواز اٹھانے کی کوشش کی تھی مگر ......'' وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر ذرا متوقف ہوئی پھر نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے افسوس ناک لہجے میں بولی۔

''چھوڑیں جی ...... اب ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ جب وہ ہی نہیں رہی تو پھر اس قصے کا کیا دہرانا ...... اللہ اس کی مغفرت کرے!''

سارے جھگڑے زندگی تک محدود ہیں۔ مرنے کے بعد سب اچھے ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں مرنے والے کی برائی نہیں کرنی چاہئے۔ دائی کبوتری اور بشیراں بھی اسی حکمت عملی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ ویسے یہ کوئی حکمت تھی یا مصلحت آمیز منافقت، اس سے قطع نظر ہم لوگ بڑے مُردہ پرست واقع ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاتھوں جو شخص اپنی پوری زندگی اذیت اور کرب میں گزار دے ہم اس کی ہر خوشی، ہر سُکھ چین چھین لیں اور بالآخر وہ ہماری ہی ''مہربانی'' سے یہ دنیا چھوڑ جائے، لیکن ادھر اس کی آنکھ بند ہوئی ادھر ہم نے اپنی پالیسی بدلی۔ اب ہماری نظر میں وہ دنیا کا عظیم ترین انسان بن جاتا ہے۔ اس کی مغفرت کے

PDF LIBRARY 0333-7412793

لئے ہم دامے، درمے، سخنے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔ میں اس ذیل میں انسانوں کے عمومی طرزِ عمل کی بات کر رہا ہوں ورنہ مستثنیات کی گنجائش تو بہرحال ہر جگہ ہوتی ہے!

میں نے ان دائی جات کی ہاں میں ہاں ملائی اور ان الفاظ کے ساتھ انہیں رخصت کر دیا۔ ''اللہ ڈاکٹر عطیہ کی مغفرت کرے۔ بے شک وہی غفور الرحیم ہے!''

اگلے روز پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ آ گئی۔ اس رپورٹ کے مطابق ڈاکٹر عطیہ کی موت سات اور آٹھ اکتوبر کی درمیانی شب دس اور گیارہ بجے کے بیچ واقع ہوئی تھی۔ تاریخ کے اعتبار سے یہ موت سات اکتوبر رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اس رپورٹ نے میرے ایک اندازے کی تصدیق بھی کر دی کہ قاتل نے ڈاکٹر عطیہ کو موت کے گھاٹ اتارنے سے قبل گلا گھونٹ کر بے بس کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ میں نے جائے وقوعہ پر مقتولہ کی لاش کا تفصیلی معائنہ کیا تھا اور مجھے اس کی گردن پر ناخن کی ایک دو خراشوں کے علاوہ گلا گھونٹنے کے آثار بھی دکھائی دیئے تھے۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی اسی جانب اشارہ کر رہی تھی کہ پہلے مقتولہ کا گلا گھونٹ کر اسے قابو میں کیا گیا تھا اس کے بعد قاتل نے بڑی بے دردی سے اس کے سینے میں خنجر اتار دیا۔

میں نے اے ایس آئی اعظم خان کو لاہور بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے مذکورہ اے ایس آئی کو اپنے کمرے میں بلایا اور پوری بات سمجھانے کے بعد کہا۔ ''یہ دونوں ایڈریس تم اپنے پاس رکھ لو۔'' میں نے الگ سے ایک پرچے پر وحید اللہ کی رہائش گاہ اور دکان کے پتے لکھ دیئے تھے۔ ''وحید اللہ گھر میں ملے یا دکان پر تم اسے اپنے ساتھ لے کر شام سے پہلے یہاں آؤ گے۔ اسے بتا دینا کہ اس کی بیوی عطیہ کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ وہ آ کر اس کی لاش حاصل کر لے۔''

اے ایس آئی نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میرے احکام کی تعمیل میں ذرا بھی کوتاہی نہیں کرے گا۔ میں نے اسے ضروری ہدایات کے بعد لاہور روانہ کر دیا۔

میں نے اپنے ذہن میں یہی منصوبہ بنایا تھا کہ ایک دفعہ وحید اللہ یہاں آ جائے پھر اس سے ہر نوعیت کی پوچھ گچھ کر لی جائے گی۔ ڈاکٹر عطیہ کے قتل سے پہلے میں خود لاہور جا کر اس سے ملنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن اب حالات نے اپنی صورت کافی حد تک بدل لی تھی۔ عطیہ کی لاش حاصل کرنے کے لئے وحید اللہ کو یہاں ضرور آنا تھا اور جب اسے آنا ہی تھا تو پھر یہیں پر اس سے دو دو باتیں بھی ہو جاتیں۔

دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے نادر خان میرے پاس آیا۔ اس کے ساتھ ایک اور بندہ بھی

تھا۔ میں نے نادر خان کے چہرے پر دبا دبا جوش محسوس کر لیا جیسے وہ میرے سامنے کوئی بہت بڑا انکشاف کرنے والا ہو۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

رسمی دعا سلام کے بعد اس نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ ''ملک صاحب! آپ نے مجھ سے تعاون مانگا تھا اور میں نے اپنی پوری کوشش کر کے ڈاکٹر عطیہ کے قاتل کو ڈھونڈ نکالا ہے۔''

میں تقریباً اچھل پڑا۔ نادر خان نے بات ہی بڑی سنسنی خیز کی تھی۔ بے ساختہ میں نے نادر خان کے ساتھ آنے والے شخص کو دیکھا۔ خان کے انداز سے یہی محسوس ہوا تھا وہ قاتل کو پکڑ کر اپنے ساتھ تھانے لایا ہے۔ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''کہاں ہے ڈاکٹر عطیہ کا قاتل؟''

بات کے اختتام پر میں نے ایک مرتبہ پھر خان کے ساتھی کو دیکھا۔ وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''عطیہ کا قاتل اس وقت لاہور میں ہے جناب! میرا اندازہ بالکل درست تھا۔ ڈاکٹر عطیہ کو اس کے شوہر وحید اللہ نے قتل کیا ہے۔''

''تم اتنی بڑی بات کس بنیاد پر کہہ رہے ہو؟'' میں الجھن زدہ انداز میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''تمہارے پاس اس دعوے کا کوئی ثبوت ہے؟''

''ثبوت تو میں اپنے ساتھ لایا ہوں ملک صاحب!'' وہ جوشیلے لہجے میں بولا پھر اپنے ساتھی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کا نام خوشی محمد ہے۔ ادھر بس اسٹینڈ پر اس کی چائے سگریٹ کی ایک بہت بڑی دکان ہے۔ یہ اس بات کا گواہ ہے کہ پرسوں رات کو ایک بابو ٹائپ بندہ لاہور سے اس قصبے میں آیا تھا اور آدھے پونے گھنٹے بعد وہ واپس لاہور چلا گیا۔ مجھے یقین ہے وہ بابو وحید اللہ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہ اس شخص کا جو قد کاٹھ اور حلیہ بتا رہا ہے وہ عطیہ کے شوہر پر بڑا فٹ بیٹھتا ہے۔ عطیہ نے مجھے وحید اللہ کے بارے میں تفصیلاً بتا رکھا تھا ملک صاحب! آپ نے بے چارے نیاز علی کو خواہ مخواہ حوالات میں ڈال رکھا ہے۔ اس کی چھٹی کریں اور وحید اللہ کی گرفتاری کا پروگرام ترتیب دیں۔''

''اس مشورے کا بہت بہت شکریہ خان صاحب!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ کی اطلاع کے لئے بتاتا چلوں کہ میں نے وحید اللہ کو یہاں لانے کے لئے اے ایس آئی اعظم خان کو لاہور روانہ کر دیا ہے۔ انشاء اللہ آج رات سے پہلے وہ تھانے میں ہو گا اور جہاں تک نیاز علی کا تعلق ہے......'' میں نے چند لمحے رک کر ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

PDF LIBRARY 0333-7412793

''جب تک اصل قاتل میرے ہاتھ نہیں آ جاتا، میں نیاز کو نہیں چھوڑ سکتا۔ وحید اللہ کو بھی آنے دو۔ دیکھ لیتے ہیں کیا معاملہ ہے اس کا۔''

نادر خان کا خوشی محمد نامی ساتھی خاصا جلدی میں دکھائی دیتا تھا۔ نادر خان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''ملک صاحب! اس سے اگر کوئی پچھ پریت کرنا ہے تو کر لیں۔ اس بے چارے کو دکان پر جانا ہے۔ یہ تو میرے مجبور کرنے سے یہاں تک چلا آیا ہے۔''

میں خوشی محمد عرف خوشیا کی جانب متوجہ ہو گیا۔

وہ پکے رنگ کا مالک ایک عام سا شخص تھا۔ عمر تیس سے کچھ اوپر رہی ہو گی۔ میرے استفسار کے جواب میں اس نے بتایا کہ سات اکتوبر کی شام کو ایک بابو ٹائپ دراز قامت شخص نے اس کی دکان سے ووڈبائن سگریٹ کا ایک پیکٹ خریدا۔ اس نے موقع پر ہی پیکٹ کھول کر ایک سگریٹ نکالی اور اسے سلگانے کے بعد خوشیا سے ''عطیہ فلاحی کلینک'' کے بارے میں دریافت کیا۔ خوشیا اس کلینک سے واقف تھا چنانچہ اس نے شہری بابو کو بتا دیا کہ مذکورہ کلینک مین بازار میں کہاں واقع ہے۔ آدھے پونے گھنٹے بعد وہ شخص دوبارہ خوشیا کو دکھائی دیا۔ اس مرتبہ وہ لاہور جانے والی ایک بس میں سوار ہو رہا تھا۔ خوشیا کو اس وقت یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ بندہ کہاں سے آیا تھا۔ بس میں سوار ہوتے دیکھ کر اس نے اندازہ لگا لیا کہ وہ اگر لاہور جا رہا ہے تو لاہور ہی سے آیا بھی ہو گا۔

اس کی وضاحت ختم ہوئی تو میں نے پوچھا۔ ''ذرا سوچ کر بتاؤ، مذکورہ شخص نے سات اکتوبر کی شام یا رات کتنے بجے تم سے سگریٹ کا پیکٹ خریدا تھا؟''

''اس وقت میری گھڑی میں ساڑھے سات بجے تھے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور تمہارا اندازہ ہے وہ آدھے پونے گھنٹے بعد واپس چلا گیا تھا؟''

''جی ہاں ...... میں نے لگ بھگ اتنی دیر بعد ہی اسے لاہور جانے والی بس میں سوار ہوتے دیکھا تھا۔'' اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بتایا۔ ''ویسے میں نے اس کی واپسی پر گھڑی میں وقت نہیں دیکھا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے، وہ بندہ آٹھ یا ساڑھے آٹھ بجے بس میں سوار ہوا تھا!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

نادر خان درمیان میں بول اٹھا۔ ''ملک صاحب! آپ نے ڈاکٹر عطیہ کے ساتھ کسی مرد کے جھگڑا کرنے کا بھی یہی وقت بتایا ہے نا۔ میرے خیال میں سات اکتوبر رات آٹھ

بجے وحید اللہ ہی ڈاکٹر عطیہ سے منہ ماری کر رہا ہو گا!''

نادر خان کا وثوق اور وحید اللہ کو مورد الزام ٹھہرانے کی کوشش سے مجھے الجھن محسوس ہونے لگی۔ میں نے قدرے ترش لہجے میں کہا۔

''خان صاحب! آپ جس گواہ کو پکڑ کر میرے پاس لائے ہیں اس کے مطابق وہ بابو ٹائپ شخص زیادہ سے زیادہ ساڑھے آٹھ ...... یا نو بجے لاہور جانے والی بس میں سوار ہو گیا تھا اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ڈاکٹر عطیہ کی موت کا وقت رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان بتاتی ہے۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟''

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ پہلی مرتبہ اس کے علم میں آ رہی تھی۔ وہ میری بات سن کر تھوڑی دیر کے لئے گڑبڑا گیا پھر دوبارہ وحید اللہ کی مخالفت پر کمربستہ ہو گیا۔ اس نے کہا۔

''جناب! یہ بھی تو ہو سکتا ہے وحید اللہ نے ایک سوچے سمجھے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے بس میں قدم رکھا ہو اور بس کے روانہ ہونے سے پہلے ہی وہ نظر بچا کر اتر گیا ہو ...... اور پھر دوبارہ کلینک پر آ کر اس نے ڈاکٹر کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہو!''

میں نادر خان کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ درحقیقت وہ ڈاکٹر عطیہ سے گہری ہمدردی رکھتا تھا اور اس ہمدردی کے پس منظر میں وحید اللہ اسے سراسر قصور وار دکھائی دیتا تھا۔ عطیہ نے اپنے شوہر کے مظالم و زیادتیوں کا ایسا نقشہ کھینچا ہو گا کہ وہ خان کی نظر میں بے چاری اور اس کا شوہر چیرہ دست بن کر رہ گیا ہو گا۔

میں نے نادر خان کے جوش کو لگام دیتے ہوئے کہا۔ ''خان صاحب! آپ مفروضات پر بات کر رہے ہیں ...... ایسا ہو سکتا ہے، ویسا ہو سکتا ہے، یوں ہوا ہو گا، ووں ہوا ہو گا ...... لیکن یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں کہ پہلے رات آٹھ بجے وحید اللہ مقتول سے لڑائی جھگڑا کرنے آیا اور واپس چلا گیا۔ دوبارہ دس اور گیارہ بجے کے درمیان وارد ہوا اور اپنی بیوی کے سینے میں خنجر اتار کر چلتا بنا ...... اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے، سات اکتوبر کو رات ساڑھے سات بجے جس شہری بابو نے خوشیا کی دکان سے ووڈبائن کا پیکٹ خریدا تھا اور ازاں بعد وہ لاہور جانے والی بس میں سوار ہوا تھا ...... وہ شخص ڈاکٹر عطیہ کا شوہر وحید اللہ ہی تھا؟'' میں نے سوالیہ نظر سے خوشی محمد کو دیکھا اور پوچھا۔

''کیوں خوشیا! کیا تم وحید اللہ کو صورت سے پہچانتے ہو؟''

اس نے نفی میں گردن ہلائی اور نادر خان کی جانب تکنے لگا۔

نادر خان بولا۔ ''جناب ملک صفدر حیات صاحب! میں نے صرف اسی ایک بندے

PDF LIBRARY 0333-7412793

خوشیا ہی سے معلومات نہیں گی۔ لگ بھگ پچاس بندوں کو کھنگال چکا ہوں سرکار۔ خوشیا نے اس بندے کا جو حلیہ اور ٹپ ٹاپ بتایا ہے وہ وحید اللہ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا!"

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "ٹھیک ہے خان صاحب! آپ دل چھوٹا نہ کریں۔ شام تک وحید اللہ یہاں پہنچ جائے گا۔ پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔"

تھوڑی دیر بعد نادر خان کے ساتھ خوشی محمد عرف خوشیا بھی رخصت ہو گیا۔ میں نے ایک ضروری کام کے لئے حوالدار محمد بوٹا کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

***

اے ایس آئی اعظم خان شام سے کچھ دیر پہلے ہی واپس آ گیا۔ مگر وہ وحید اللہ کو اپنے ساتھ لانے میں ناکام رہا تھا۔ میں ایک یا دو فی صد اس بات کی توقع رکھتا تھا کہ وحید اللہ یہاں آنے سے انکار کر دے گا لیکن وحید اللہ نے اعظم خان سے جو کچھ کہا اس کے بارے میں، میں نے ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سوچا تھا۔ اے ایس آئی نے بڑے حیرت بھرے لہجے میں مجھ سے کہا۔

"ملک صاحب! وہ بندہ تو کوئی اور ہی کہانی سنا رہا ہے...... بڑی عجیب کہانی۔"

"یہ عجیب کہانی کیا ہے بھئی؟" میں نے سوالیہ نظر سے اعظم خان کو دیکھا۔

وہ بولا۔ "میں نے جب وحید اللہ کو بتایا کہ اس کی بیوی ڈاکٹر عطیہ کو کسی نے قتل کر دیا ہے لہٰذا وہ قصبے میں آ کر اس کی لاش وصول کر لے تاکہ اس بدنصیب کی تدفین مناسب طریقے سے ہو سکے تو اس نے نفرت سے ایک جانب تھوک دیا اور برہمی سے بولا، مجھے عطیہ کی ضرورت نہیں۔ نہ زندہ کی اور نہ ہی اس کی لاش کی۔ اب اس عورت کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ میں نے اسے طلاق دے دی ہے۔ آپ لوگ اس کی لاش مناسب یا نا مناسب جیسے بھی چاہیں اسی طریقے سے دفن کر دیں...... اور اگر دفن نہ کرنا چاہیں تو پھر آوارہ کتوں کے سامنے ڈال دیں۔ وہ عورت اسی سلوک کی مستحق ہے...... ملک صاحب! اس کی بات سن کر میں ہکا بکا رہ گیا اور میں نے اس پر زور دیا کہ وہ میرے ساتھ چلے لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ اس لئے میں اکیلا ہی واپس آ گیا ہوں۔"

اعظم خان خاموش ہوا تو اس وقت تک میرے اندر کھلبلی مچ چکی تھی۔ طلاق والی بات نئی تھی اور یہ ایک چونکا دینے والا انکشاف تھا۔ میں نے اعظم خان سے سوال کیا۔

"کیا تم نے اس سے پوچھا نہیں کہ اس نے اپنی بیوی کو کب طلاق دی تھی؟"

"پوچھا تھا ملک صاحب! لیکن اس نے ڈھنگ سے کوئی جواب نہیں دیا۔" اے ایس

آئی نے بتایا۔ "وہ بار بار ایک ہی جملہ دہرا رہا تھا...... اب اس آوارہ عورت کا مجھ سے کوئی تعلق، کوئی ناتا نہیں۔ وہ قتل ہو جائے یا اسے کالے چور لے جائیں، کوئی پرواہ نہیں ہے مجھے۔"

اے ایس آئی کی رپورٹ نے اس کیس کو ایک نئے رخ پر ڈال دیا تھا۔ اگر وحید اللہ واقعی عطیہ کو طلاق دے چکا تھا تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس نے یہ کام کب کیا؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لئے نادر خان اور خوشیا کے بیانات کو زیر غور لانا ضروری تھا۔ جس دراز قامت بابو ٹائپ شخص نے سات اکتوبر کی رات ساڑھے سات بجے خوشیا کی دکان سے دوڈ بائن سگریٹ کا پیکٹ خریدا تھا اگر وہ وحید اللہ ہی تھا تو پھر کہا جا سکتا تھا وہ طلاق دینے ہی ہمارے قصبے میں آیا تھا۔ یہاں ایک اور اہم سوال سر اٹھاتا تھا اور وہ یہ کہ اچانک بیٹھے بٹھائے تین سال بعد وحید اللہ کے دل میں طلاق کا خیال کیسے آ گیا؟ اس کے ساتھ ہی یہ معمہ حل کرنا بھی ضروری تھا کہ وحید اللہ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ ڈاکٹر عطیہ ہمارے قصبے میں ایک فلاحی کلینک چلا رہی تھی۔ عطیہ کو اپنا گھر چھوڑے ہوئے لگ بھگ تین سال ہو گئے تھے اور اس قصبے میں اس کے قیام کی مدت صرف سات ماہ تھی!

یہ تمام سوالات اور انہی جیسے درجنوں دیگر سوالات کے درست جوابات صرف اور صرف وحید اللہ ہی دے سکتا تھا۔ مجھے محسوس ہوا میرا لاہور جانا از حد ضروری ہو گیا تھا۔ اس منٹے کو جلد از جلد نمٹ جانا چاہئے تھا۔ یہ تو اچھا ہوا میں نے حوالدار کو سرکاری ہسپتال بھیج کر ڈاکٹر عطیہ کی لاش کو سرد خانے میں رکھوانے کی ہدایت کر دی تھی تاکہ ضرورت کے وقت ہی اسے منگوایا جائے۔

اگلے روز یعنی دس اکتوبر کی صبح میں لاہور روانہ ہو گیا۔ میں نے اپنے ساتھ کانسٹیبل وقار احمد کو بھی رکھ لیا تھا۔ میں وحید اللہ کو اس کی دکان واقع انارکلی بازار میں پکڑنا چاہتا تھا۔ مجھے پتہ چلا تھا وہ لگ بھگ دس بجے دکان پر پہنچ جاتا تھا۔ مجھے لاہور پہنچتے ہوئے گیارہ بج گئے۔ میں پہلے متعلقہ تھانے گیا اور وہاں کے انچارج سے اپنا تعارف کرانے کے بعد آمد کی وجہ بیان کی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس سے تعاون کی درخواست بھی کی۔ تھانہ انچارج بھلا آدمی تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے میرا خیر مقدم کیا اور اپنے عملے میں سے دو کانسٹیبلز میرے ہمراہ کر دیئے تاکہ وحید اللہ زیادہ چون و چرا نہ کر سکے۔ میں اور کانسٹیبل وقار اس وقت سادہ لباس میں تھے۔ ہم جلد ہی انارکلی بازار کی جانب روانہ ہو گئے۔

"کیپ اینڈ ہیٹ سینٹر" مین انارکلی بازار میں واقع تھا۔ اس دکان کی ایک طرف

PDF LIBRARY 0333-7412793

"انگلش واچ ہاؤس" اور دوسری طرف "سلکو ساڑھی والے" تھے۔ وحید اللہ کی دکان پر کیپ اینڈ ہیٹ کے علاوہ چھتریاں اور ہر قسم کی چھڑیاں بھی فروخت ہوتی تھیں۔ جب ہم نے دکان میں قدم رکھا تو اس وقت وہاں دو افراد موجود تھے۔ ایک اُنیس بیس سال کا نوجوان تھا جو یقینی طور پر وحید اللہ کا ملازم تھا۔ دوسرا شخص دراز قامت اور مناسب ڈیل ڈول کا تھا۔ اس کی عمر پینتیس سے متجاوز تھی۔ اس شخص پر نگاہ پڑتے ہی میرے دل نے پکارا کہ وہ وحید اللہ کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

پہلے وہ ہمیں گاہک سمجھا لیکن ہمارے عقب میں دو وردی پوش پولیس والوں کو دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا اور وہ متوحش نظر سے باری باری ہم سب کی صورتیں تکنے لگا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں ان گنت الجھنوں نے جال سے بُن دیئے تھے۔ میں نے وقت برباد کرنا مناسب نہ سمجھا اور براہِ راست اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"غالباً تم وحید اللہ ہو؟"

"جی، وحید اللہ میرا ہی نام ہے۔" وہ متذبذب انداز میں بولا۔ "لیکن آپ کون لوگ ہیں؟"

میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "میرا نام ملک صفدر حیات ہے اور میں ضلع شیخوپورہ کے ایک قصبے کا تھانہ انچارج ہوں۔ میرے یہ تینوں ساتھی بھی پولیس والے ہیں جن میں سے یہ دو یونیفارم والے تمہارے ہی تھانے سے تعلق رکھتے ہیں۔"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ "آپ کا ایک اے ایس آئی کل میرے پاس آیا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن......"

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے اے ایس آئی اعظم خان کو تو ٹال دیا تھا لیکن میں ٹلنے والا نہیں۔ اگر تم نے مجھے چکر دینے کی کوشش کی تو میں تمہیں رسیوں سے جکڑ کر اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور اس سلسلے میں تمہارے علاقے کا تھانہ مجھ سے بھرپور تعاون کرے گا۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

وہ قدرے نرم پڑتے ہوئے بولا۔ "جناب! میں یہی بات تو آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اس عورت سے میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ اگر کسی نے اسے قتل کر دیا ہے تو میں کیا کروں۔ آپ جا کر اس کے قاتل کو تلاش کریں۔ خدارا میری جان چھوڑیں۔"

"تمہاری جان اتنی آسانی سے نہیں چھوٹ سکتی وحید اللہ۔" میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "اگر میاں یا بیوی میں سے کوئی قتل ہو جائے تو سب سے پہلے شریک حیات پر شک کیا

جاتا ہے۔"

"میاں بیوی......شریک حیات!" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ "جناب! میں نے کل آپ کے اے ایس آئی کو بھی بتایا تھا اور اب آپ کی خدمت میں بھی عرض کرتا ہوں کہ میں اس عورت کو پوری تین طلاق دے چکا ہوں۔ وہ کچھ بھی کرتی پھرے، زندہ رہے یا مر جائے مجھے اس آوارہ اور بدمعاش عورت سے کوئی سروکار نہیں۔ میں اس کے کسی قول و فعل کا ذمے دار نہیں ہوں۔"

وحید اللہ نے ڈاکٹر عطیہ کے لئے آوارہ کا لفظ پہلے بھی استعمال کیا تھا اور اب اس لفظ کے ساتھ بدمعاش کا اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ سیدھی سیدھی ڈاکٹر عطیہ کی کردار کشی تھی۔ ایک شوہر اپنی بیوی کو بدچلن کہہ رہا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا وحید اللہ اپنے دل و دماغ میں ڈاکٹر عطیہ کے لئے بہت سارا زہر بھرے بیٹھا تھا۔ میں نے سوچا اس کے دل و دماغ کا آپریشن تو بعد میں کروں گا، پہلے طلاق والے قصے کو نمٹا لیا جائے۔

میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اے ایس آئی کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ تم نے ڈاکٹر عطیہ کو طلاق دے دی ہے......لیکن تم نے کب اسے طلاق دی؟"

وہ چند لمحے ساکت نظر سے مجھے گھورتا رہا، پھر جواب دیا۔ "میں نے دو روز پہلے اسے طلاق دی ہے۔"

"یعنی سات اکتوبر کی رات لگ بھگ آٹھ بجے؟" میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"تم ساڑھے سات بجے ہمارے قصبے میں پہنچے تھے۔ ایک سگریٹ فروش سے تم نے ووڈ بائن کا پیکٹ خریدا اور ایک سگریٹ سلگانے کے بعد تم نے اس سے "عطیہ فلاحی کلینک" کا پتہ پوچھا۔ تم قصبے کے مین بازار میں ڈاکٹر عطیہ کے کلینک پر گئے اور رات آٹھ بجے تم دونوں کے درمیان اچھی خاصی تلخ کلامی ہوئی......"

وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ "اور اسی تلخ کلامی کے نتیجے میں، میں نے عطیہ کو طلاق دے دی تھی۔ پوری تین طلاق!"

میں نے اس کے انکشاف پر کوئی تبصرہ کرنا ضروری نہ سمجھا اور اپنا بیان جاری رکھا۔

"تم آٹھ سوا آٹھ بجے ڈاکٹر عطیہ کے کلینک سے نکلے اور سیدھا بس اسٹینڈ پر پہنچے۔ پھر لاہور جانے والی بس میں سوار ہو کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ تم واپس چلے گئے ہو لیکن......"

PDF LIBRARY 0333-7412793

میں نے بیان نامکمل چھوڑ کر اس کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہاں الجھن اور استعجاب کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے ڈرامائی انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن مذکورہ بس ابھی اسٹینڈ سے نکلی بھی نہیں تھی کہ تم چپکے سے بس سے نیچے اتر گئے۔ پھر تقریباً دو گھنٹے تم نے اِدھر اُدھر گھوم پھر کر گزارے۔ اس طرح رات دس بجے کے بعد تم دوبارہ ڈاکٹر عطیہ کے گھر پہنچے اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔“

”یہ جھوٹ ہے ...... سراسر مجھ پر الزام ہے۔“ وہ احتجاجی انداز میں چیخ اٹھا۔ ”میں لاہور والی بس میں بیٹھ کر اپنے گھر آ گیا تھا۔ دس بجے تو میں اپنے گھر پر موجود تھا۔ آپ میری بیٹی ناہید سے اس بات کی تصدیق بھی کر سکتے ہیں ...... پھر ہماری گلی کے کونے پر موجود بیکری والا بھی میرے حق میں گواہی دے گا۔ میں نے دس بجے کے قریب اس سے انڈے وغیرہ خریدے تھے۔ اگر میں نے رات دس بجے آپ کے قصبے میں عطیہ کے سینے میں کوئی خنجر اتارا تھا تو پھر اسی وقت پر میں اپنے محلے ذیلدار روڈ اچھرہ لاہور میں کیسے موجود تھا؟“

وحید اللہ کی بات میں اچھا خاصا وزن تھا۔ اگر وہ دس بجے رات لاہور میں اپنی موجودگی کو ثابت کر دیتا تو پھر وہ ڈاکٹر عطیہ کے قاتل کے دائرے سے خود بہ خود باہر ہو جاتا۔ کوئی بھی شخص لاہور اور شیخوپورہ میں بہ یک وقت موجود نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر گھنٹے آدھے گھنٹے کا فرق ہوتا تو کسی زاویے سے سوچا جا سکتا تھا لیکن اس کیس میں کوئی گنجائش نہیں آتی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق ڈاکٹر عطیہ کی موت سات آٹھ اکتوبر کی رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی ...... یعنی نہ دس سے پہلے اور نہ ہی گیارہ کے بعد!

میں نے وحید اللہ کو ایک اور زاویے سے گھیرنے کی کوشش کی۔ ”تم نے اپنی بیوی کے لئے آوارہ، بدچلن اور بدمعاش عورت کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ آخر کیوں؟“

اس نے عجیب نظر سے مجھے دیکھا اور شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ ”چھوڑیں اب ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ وہ اچھی تھی یا بری اب اس دنیا میں نہیں رہی۔ مرنے والے کی برائی نہیں کرنی چاہئے۔“

میں نے واضح طور پر محسوس کیا، عطیہ کے ذکر پر پہلے اس کے چہرے پر جو نفرت اور غصے کے تاثرات نظر آ رہے تھے اب ان میں افسردگی بھی شامل ہو گئی تھی۔ میں چند لمحے ٹٹولتی ہوئی نظر سے اسے دیکھتا رہا پھر پوچھا۔

”کیا تم نے ناہید کو اس کی ماں کی موت کے بارے میں بتایا ہے؟“

”نہیں۔“ وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ”ناہید کے لئے وہ تین سال پہلے ہی مر گئی تھی جب وہ ہمیں چھوڑ کر اپنا شوق پورا کرنے چلی گئی تھی۔ میں اس سانحے کی اطلاع دے کر اس معصوم کے زخموں کو ہرا نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے اسے ماں اور باپ بن کر پالا ہے تھانیدار صاحب!“ اس کی آواز میں نمی اتر آئی۔ ”آپ تصور نہیں کر سکتے میں نے ناہید کی پرورش کے لئے کتنی مشکلات اٹھائی ہیں۔ اب تو وہ ماشاء اللہ سیانی ہو گئی ہے۔ اگلے سال ساتویں جماعت کا امتحان دے گی۔“

بات ختم کرتے ہی اس نے چہرہ دوسری جانب پھیر لیا۔ میں سمجھ گیا وہ آنکھوں میں اتر آنے والے موتیوں کو مجھ سے چھپانا چاہتا تھا۔ اس کی آواز کی بھراہٹ بتا رہی تھی وہ اندر سے کتنا دکھی تھا۔

یہ سچ ہے کسی بھی بچے کی شخصیت کی تکمیل کے لئے اس کے سر پر ماں اور باپ دونوں کا سایہ موجود رہنا ضروری ہے۔ اسے دونوں کی یکساں محبت ملنی چاہئے لیکن میرے خیال میں بچے کی شخصیت کی تعمیر میں ماں کا زیادہ ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ زیادہ قربانیاں دیتی ہے۔ شاید اسی لئے قدرت نے اس کے قدموں کے نیچے جنت کی بشارت دی ہے۔ خدا کسی بچے کو ماں سے محروم نہ کرے!

وحید اللہ کی کیفیت نارمل ہوئی تو میں نے پوچھا۔ ”یہ تین سال بعد اچانک تمہیں بیوی کو طلاق دینے کا خیال کیوں آ گیا؟ تمہیں کیسے پتہ چلا کہ وہ میرے قصبے میں کلینک کھولے بیٹھی ہے؟ کیا ان تین سالوں میں تم اس کی سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے تھے؟“

سوالات کے اس تانتے نے اسے بوکھلا دیا، جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ”لگتا ہے مجھے آپ کو وہ حقیقت بتانا ہی پڑے گی جس نے مجھے آپ کے قصبے جانے پر مجبور کر دیا۔ ورنہ آپ تفتیش کے نام پر سوالات کر کر کے میرے دماغ کا قیمہ بنا دیں گے۔“

”تم کس حقیقت کا ذکر کر رہے ہو وحید اللہ؟“ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

”اس حقیقت کا نام ہے ...... خط!“

”خط......؟“ میں الجھ کر رہ گیا۔ ”کیسا خط؟“

”ٹھہریں، میں آپ کو وہ خط دکھا دیتا ہوں۔“ وہ اپنی جیبیں ٹٹولتے ہوئے بولا۔ ”پھر ساری بات آپ کی سمجھ میں آ جائے گی۔“

میں استعجابیہ انداز میں وحید اللہ کو دیکھنے لگا۔ پتہ نہیں وہ اپنے کوٹ کے پٹارے میں سے کون سا انکشاف برآمد کرنے والا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ایک اندرونی جیب سے

PDF LIBRARY 0333-7412793

ایک تہہ شدہ کاغذ نکالا اور میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

”لیں ...... آپ بھی اس شاہکار کو پڑھ لیں۔“

میں نے تہہ شدہ اس پرچے کو کھولا اور اس کی تحریر پر نگاہ جما دی۔ وہاں لکھا تھا!

”تم بھی عجیب قسم کے بندے ہو، بیوی کو بے لگام چھوڑ رکھا ہے۔ تمہیں کچھ پتہ بھی ہے وہ یہاں کون کون سے گل کھلا رہی ہے۔ سنو گے تو تمہارا دماغ پھٹ جائے گا۔ پتہ نہیں تم کتنے بے غیرت شوہر ہو۔ اگر بیوی کو اپنے قابو میں نہیں رکھ سکتے تو اسے آزاد کر دو۔ جب تک وہ تمہارے نکاح میں ہے، اس کا ہر کرتوت تمہارے کھاتے میں لکھا جائے گا۔ تمہاری اطلاع کے لئے صرف اتنا بتا دوں کہ وہ یہاں کے ایک با اثر شخص نادر خان کی رکھیل بنی ہوئی ہے۔ اسی بندے نے اسے مین بازار میں کلینک کھول کر دیا ہے۔ نادر خان دن رات اس کے کلینک میں گھسا رہتا ہے۔ یہ دونوں مل کر کون سا کھیل کھیلتے ہوں گے تم اندازہ لگا سکتے ہو۔ اگر تم میں ذرا سی بھی غیرت باقی ہے تو اپنی بیوی کا کوئی مناسب بندوبست کرو۔ میں تمہیں ایک اور بات بھی بتا دوں اور وہ یہ کہ نادر خان اور عطیہ کے خفیہ تعلقات کی خبر نادر خان کی بیوی کو بھی ہو گئی ہے۔ نگہت بڑی جلال والی عورت ہے۔ وہ کچھ بھی کر سکتی ہے ...... کچھ بھی!“

آخر میں ہمارے قصبے کا مکمل ایڈریس درج تھا۔ راقم الحروف کا نام کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ اس تحریر سے یہ بھی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ کوئی لکھنے والا ہے یا لکھنے والی! ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ میں نے اس تحریر کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے تا کہ مفہوم میں کوئی فرق نہ آئے ورنہ وہ خاصی ناپختہ تحریر تھی۔ لگتا تھا جیسے پرائمری کے کسی بچے نے طبع آزمائی کی ہو۔ ویسے تحریر کے پیچھے سوچ بہت پختہ تھی۔ اب یہی بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ کسی ان پڑھ شخص نے وہ خط کسی بچے سے لکھوایا ہو گا یا پھر کسی بہت ہی کم لکھے پڑھے شخص نے خود تحریر کیا تھا۔ میں نے دو تین مرتبہ اس خط کو پڑھا اور نظر اٹھا کر سوالیہ انداز میں وحید اللہ کو دیکھا۔

وہ جلدی سے بولا۔ ”جناب! میں یہ خط پڑھ کر آگ بگولا ہو گیا۔ مجھے عطیہ پر شدید غصہ آیا۔ یہ سچ ہے کہ اس نے گھر تو چھوڑ دیا تھا لیکن ہنوز وہ میرے نکاح میں تھی۔ میں اس کی بے غیرتی کا قصہ پڑھ کر انگاروں پر لوٹنے لگا۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں ایسی صورت حال میں کسی شوہر کی ذہنی کیفیت کیا ہو سکتی ہے۔ میں ہر روز اس خط کو کئی بار پڑھتا اور ہر مرتبہ میرا خون کھول کر رہ جاتا۔ اس خط سے پہلے میں نہیں جانتا تھا وہ کہاں ہے اور کیا

کرتی پھر رہی ہے! لیکن اب تازہ ترین حالات میرے علم میں آ چکے تھے۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ مجھے شیخوپورہ کے اس قصبے میں جانا چاہئے۔ عطیہ وہاں کیا گند پھیلا رہی ہے، یہ اس کا دین ایمان! میں نے فیصلہ کر لیا کہ پہلی فرصت میں اسے طلاق دے دوں گا تا کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری!“

وہ بڑے جذباتی انداز میں خاموش ہوا تو میں نے کہا۔ ”چنانچہ تم سات اکتوبر کی رات آٹھ بجے ڈاکٹر عطیہ کے کلینک پر پہنچے اور تین لفظ بول کر اسے فارغ کر دیا!“

”میں اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتا تھا۔“ وہ بے چارگی سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اپنے ذہن کی ایک اُلجھن کو دور کرنے کی خاطر اس سے پوچھا۔ ”کیا تمہارے پاس اس خط کا لفافہ بھی محفوظ ہے؟“

میں یہ دیکھنا چاہتا تھا، آیا وہ خط واقعی ہمارے قصبے سے ارسال کیا گیا تھا یا کہیں اور سے۔ حالانکہ تحریر سے تو اندازہ ہوتا تھا، وحید اللہ کے ذہن میں آگ لگانے والا اسی قصبے کا باسی ہے۔ بہر حال تصدیق ضروری تھی۔

میرے سوال کے جواب میں وہ مختلف درازیں کھول بند کرتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”میں نے خط نکال کر وہ لفافہ یہیں کہیں ڈال دیا تھا!“

تھوڑی دیر بعد وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا اور ایک لفافہ میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ لیں جناب! مل گیا لفافہ۔“

میں نے لفافے پر ثبت مہروں کا جائزہ لیا۔ ان میں سے ایک مہر ہمارے قصبے سے متعلقہ ڈاک خانے کی تھی۔ اس سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ وہ خط اسی قصبے میں سے کسی شخص نے وحید اللہ کو ارسال کیا تھا۔ وہ شر پسند جو کوئی بھی تھا، نادر خان اور ڈاکٹر عطیہ کا پکا دشمن تھا ...... اور مجھے جلد از جلد اس شر پسند کو قانون کی گرفت میں لانا تھا۔

لاہور میں میرا کام ختم ہو گیا تھا۔ میں نے مذکورہ خط کو اپنی جیب میں محفوظ کر لیا اور وحید اللہ کی طرف دیکھتے ہوئے تنبیہی انداز میں کہا۔ ”جب تک عطیہ مرڈر کیس کی تفتیش مکمل نہیں ہو جاتی تم اپنے علاقے کے تھانے میں پیشگی اطلاع دیئے بغیر شہر سے باہر نہیں جا سکتے۔“

”ٹھیک ہے جناب! آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔“ وہ تعاون آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے نہایت ہی سنجیدگی سے پوچھا۔ ”عطیہ کی لاش کا کیا کرنا ہے؟“

”مجھے عطیہ اور عطیہ کی لاش سے کوئی دلچسپی نہیں۔“ وہ رکھائی سے بولا۔ ”میرا نام اس

PDF LIBRARY 0333-7412793

کے نام کے ساتھ کہیں نہیں آنا چاہئے۔“

”کیا اس کی لاش کو کسی لاوارث کی مانند ہم اپنے قصبے کے قبرستان میں دفن کر دیں؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکا۔

وہ بڑی سفاکی سے بولا۔ ”جو لوگ اپنوں کو چھوڑ دیتے ہیں ان کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ وہ تین سال پہلے میری اور اپنی بیٹی کی زندگی سے نکل گئی تھی۔ میں نے چند روز پہلے اسے رشتہ ازدواج سے خارج کر دیا۔ اب اس عورت سے ہمارا کوئی تعلق ناتا نہیں۔“

میں نے ایک زمینی حقیقت کی جانب اشارہ کیا اور کہا۔ ”وحید اللہ! اگر کل کلاں تمہاری بیٹی کو یہ پتہ چلا کہ اس کی ماں کی موت کن حالات میں ہوئی اور تدفین کس کسمپرسی میں انجام پائی تو وہ کیا سوچے گی؟ تم نے تو طلاق دے کر عطیہ کو اپنی زندگی سے خارج کر دیا لیکن دنیا کی کوئی زبان ابھی تک ایسے الفاظ تخلیق نہیں کر سکی جو خون کے رشتوں کو یک سر ختم کر دیں۔ اگر زندگی کے سفر میں کبھی تمہاری بیٹی سوالیہ نشان بن کر تمہارے سامنے کھڑی ہو گئی تو جواب دینا مشکل ہو جائے گا!“

”آپ فکر نہ کریں۔ اگر ایسا کوئی موقع آیا تو میں ناہید کو سمجھا لوں گا۔“ وہ اٹل لہجے میں بولا۔

وحید اللہ کے ساتھ مزید وقت صرف کرنا گویا وقت برباد کرنے کے مترادف تھا۔ چنانچہ میں خاموشی سے اٹھا اور اپنے تھانے کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

ہمارا قصبہ زیادہ بڑا نہیں تھا اور کوئی بہت چھوٹا بھی نہیں تھا۔ تاہم پڑھے لکھے افراد کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔ یہ بات میں نے محاورتاً کہی ہے ورنہ تیس چالیس افراد تو ضرور ایسے ہوں گے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اگلے روز میں نے ڈاکٹر عطیہ کی لاش کو ہسپتال سے منگوایا اور نادر خان کی سرکردگی میں اس کی تجہیز و تکفین کرا دی۔

نادر خان کو میں نے لاہور میں پیش آنے والے حالات سے آگاہ کر دیا تھا۔ اب اس کا جوش قدرے کم ہو گیا تھا۔ اس نے پُر سوچ انداز میں کہا۔ ”ملک صاحب! اگر وحید اللہ وقوعہ کی رات دس بجے لاہور میں موجود تھا تو پھر ڈاکٹر عطیہ کو اس نے قتل نہیں کیا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے پھر عطیہ کا قاتل کون ہے؟“

”اس سوال کا جواب وہی شخص دے گا جس نے اس قصبے سے وحید اللہ کو وہ اشتعال انگیز خط لکھا تھا۔ ہمیں اس گمنام شخص کو تلاش کرنا ہو گا۔“ میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

میں نے مذکورہ خط نادر خان کو بھی پڑھوا دیا تھا اور وہ خط پڑھ کر بڑا چراغ پا ہوا تھا۔ اس تحریر میں نادر خان کی بیوی نگہت کا بھی حوالہ دیا گیا تھا اور اسے ایک جلالی عورت قرار دیتے ہوئے یہ خدشہ ظاہر کیا گیا تھا کہ وہ غصے میں آ کر کچھ بھی کر سکتی ہے۔

نادر خان نے متفکر لہجے میں کہا۔ ”ملک صاحب! وہ نامراد جو کوئی بھی ہے میرا پکا دشمن ہے۔ اس نے نہ صرف میرے کردار پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی ہے بلکہ میری بیوی کو بھی اس معاملے میں ملوث کرنے کی سعی کی ہے۔ میری شدید خواہش ہے کہ وہ بندہ جلد از جلد سامنے آ جائے۔“

”میری بھی یہی تمنا ہے۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ”اس فتنہ پرور شخص کو سامنے لانے کے لئے ہمیں کوئی چال چلنا ہو گی۔ بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہو گا۔“

پھر آئندہ آدھے گھنٹے میں ہم مذکورہ شخص کو ٹریس آؤٹ کرنے کا منصوبہ ترتیب دے چکے تھے۔ یہ کام تین چار مرحلوں میں ہونا تھا۔ پہلے ان افراد کو چیک کیا جاتا جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ پھر ان کی تحاریر کے نمونوں کو خط کے ساتھ میچ کر کے دیکھا جاتا۔ اس کے علاوہ پرائمری اور مڈل کے بچوں سے بھی پوچھ تاچھ کرنا تھی کہ آیا ان میں سے کسی سے وہ خط تو نہیں لکھوایا گیا تھا۔

یہ کام اگرچہ تھوڑا پیچیدہ تھا لیکن مجھے امید تھی کہ نتیجہ خیز ثابت ہو گا۔ اور بالآخر چند روز کی بھاگ دوڑ کے بعد میری امید بر آئی۔ میں یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ وحید اللہ کو وہ آتش بار خط کس نے ارسال کیا تھا اور ...... اس فتنہ انگیز شخصیت کا نام تھا دائی حنیفاں!

دائی حنیفاں تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا جانتی تھی۔ یہ انکشاف قصبے ہی کی ایک بیوہ عورت نے کیا تھا۔ وہ ان پڑھ تھی اور کبھی کبھار دائی حنیفاں سے اپنے بیٹے کو خط لکھوا لیا کرتی تھی۔ اس بیوہ عورت کا بیٹا نوکری کے سلسلے میں دوسرے شہر میں رہتا تھا۔ بیوہ عورت نے خط کی تحریر کو دیکھتے ہی اعلان کر دیا کہ وہ سو فیصد دائی حنیفاں کے ہاتھ کا کمال تھا۔

تفتیش کی گاڑی شک کے پٹرول سے چلتی ہے اور یہاں تو ایک واضح اشارہ موجود تھا لہٰذا مذکورہ گاڑی ٹاپ گیئر میں دوڑنے لگی۔ میں نے فی الفور دائی حنیفاں کو تھانے بلا لیا اور اس پر سوالات کی بارش کر دی۔

وہ بہت سٹپٹائی، بوکھلائی اور ایک ہی رٹ پر قائم رہی کہ مجھے کوئی شدید قسم کی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ وہ خط اس کا تحریر کردہ نہیں۔ میں نے اس کی تحریر سے خط کا موازنہ کر کے دکھا

PDF LIBRARY 0333-7412793

دیا لیکن وہ ہٹ دھرمی سے باز نہ آئی۔ مجبوراً مجھے سخت رویے کو اپنانا پڑا۔

حنیفاں کی عمر پچاس سے متجاوز تھی اور اس کی بینائی بھی کمزور تھی لیکن آنکھوں میں اتنی روشنی باقی تھی کہ وہ لکھنے پڑھنے کا کام کر سکے۔ اس کی صحت، عمر اور عورت ذات ہونے کے سبب میں اس پر کسی قسم کا تشدد نہیں آزمانا چاہتا تھا لہٰذا میں نے ٹریلر سے کام نکالنے کا فیصلہ کیا۔

دو روز پہلے ایک ہٹا کٹا مویشی چور میرے ہتھے چڑھا تھا اور اس وقت حوالات میں بند تھا۔ وہ بھی زبان کھولنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے حوالدار بوٹا کو علیحدگی میں اپنے پروگرام سے آگاہ کر دیا پھر اسے اپنے کمرے میں بلا کر حنیفاں کی موجودگی میں کہا۔

''بوٹا! تم اس دائی کو اپنے ساتھ ٹرائل روم میں لے جاؤ لیکن اس کا نمبر دوسرا ہے۔''

میں نے ذرا توقف کیا پھر بڑی سفاکی سے کہا۔ ''جانتے ہو نا، پہلا نمبر کس کا ہے؟''

''جی ملک صاحب!'' حوالدار جلدی سے بولا۔ ''پہلا نمبر اس اچھو ڈنگر چور کا ہے۔''

''شاباش!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''اچھو اور حنیفاں کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرنا ہے لیکن اپنی اپنی باری پر!''

حوالدار حنیفاں کو اپنے ساتھ لے کر میرے کمرے سے نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد ٹرائل روم کی جانب سے اچھو مویشی چور کے کراہنے اور بلبلانے کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ میں نے حوالدار کو خصوصی ہدایت کی تھی کہ اچھو کے ساتھ جو بھی کارروائی کی جائے وہ حنیفاں کی نظر کے سامنے ہو تاکہ اس ٹریلر کو دیکھ کر وہ اس فلم کا اندازہ لگا لے جو اس کے ساتھ پیش آنے والی تھی۔ یہ ایک موثر ٹوٹکا تھا۔

پندرہ منٹ کے بعد حوالدار نے آ کر مجھے بتایا کہ حنیفاں مجھ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتی تھی۔ میں نے کہا اسے فوراً میرے پاس لے آؤ۔ ایک منٹ بعد وہ میرے روبرو کھڑی تھی اور اس طرح کھڑی تھی کہ اس کا پورا وجود تھر تھر کانپ رہا تھا۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

''تھانے دار صاحب! مجھ پر کوئی تفتیش نہ کرنا۔ میں قبول کرتی ہوں کہ وہ خط میں نے ہی وحید اللہ کو لکھا تھا۔''

''بیٹھ جاؤ۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کرسی کی جانب اشارہ کیا اور کہا۔ ''اب یہ بھی بتاؤ کہ تم نے ڈاکٹر عطیہ کو قتل کیوں کیا؟''

وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے منت ریز لہجے میں بولی۔ ''خدا پاک کی قسم! ڈاکٹرنی کے

قتل سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں نے تو وہ خط اس کے گھر والے کو صرف اس لئے لکھا تھا کہ وہ اس منحوسنی کو مار کوٹ کر یہاں سے لے جائے تاکہ ہمارے رزق روزگار کی راہ کھل سکے۔''

میں نے اس خط کے مندرجات کو دہرایا اور کڑے لہجے میں سوال کیا۔ ''تم نے نادر خان کے ساتھ ڈاکٹر عطیہ کو نتھی کر کے انہیں ذلیل و رسوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ عطیہ سے تمہاری دشمنی تو سمجھ میں آتی ہے لیکن ذرا یہ تو بتاؤ نادر خان سے تمہارا کیا بیر ہے؟''

اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''میں نے کوئی جھوٹ نہیں لکھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ نادر خان اور ڈاکٹرنی کے درمیان کوئی گہرا چکر تھا اور مجھے تو شک ہے نادر خان اس ڈاکٹرنی سے شادی کرنے والا تھا۔''

''شادی!'' میں نے اسے گھورا۔ ''وہ خدا کا بندہ تو پہلے سے شادی شدہ ہے؟''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''بے شک وہ شادی شدہ ہے لیکن نگہت سے اس کی کوئی اولاد نہیں۔ وہ اولاد کی خاطر دوسری شادی کے لئے پَر تول رہا تھا۔ بہت سے لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں لیکن نادر خان کے ڈر سے کوئی زبان نہیں کھولتا۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئی پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''نگہت کے دکھ کو صرف میں ہی سمجھ سکتی ہوں تھانے دار صاحب! بچی بچے کے سلسلے میں پہلے میں اس کا علاج کر رہی تھی لیکن ڈاکٹرنی کے آنے کے بعد نادر خان نے میرا علاج بند کروا دیا اور نگہت ڈاکٹرنی کے کلینک پر جانے لگی۔ مجھے امید تھی کہ اگر نگہت سال چھ مہینے ٹک کر میرا علاج کرا لیتی تو ضرور اس کی کوکھ آباد ہو جاتی۔ لیکن ان چھ سات ماہ میں ڈاکٹرنی نے پتہ نہیں اس بے چاری کے ساتھ کون سا ہاتھ کیا ہوگا۔ مجھے تو اندیشہ ہے اس نے نگہت کی کوکھ کا سوا ستیاناس نہ مار دیا ہو!''

وہ جلی کٹی پر اتر آئی تھی۔ میں نے اسے پٹڑی پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہیں وحید اللہ کا لاہور والا ایڈریس کس نے دیا تھا؟''

''نگہت سے لیا تھا میں نے وہ ایڈریس۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ڈاکٹرنی نے نادر خان کو اپنی دکھ بھری کہانی سنا رکھی ہے۔ نادر سے نگہت تک اور نگہت سے مجھ تک وہ کہانی پہنچی۔ لیکن میرا خیال تو یہ ہے کہ ڈاکٹرنی نے نادر خان کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے وہ کہانی گھڑی تھی۔ وہ مجھے کوئی بہت ہی گھیرو قسم کی عورت لگتی تھی۔''

وہ ایک مرتبہ پھر پٹڑی سے اترنے لگی تھی۔ میں نے استفسار کیا۔ ''تم نے نادر اور عطیہ

PDF LIBRARY 0333-7412793

کے جن پوشیدہ تعلقات کا ذکر کیا ہے کیا نگہت اس سے واقف ہے؟''

''جی ہاں، پوری طرح واقف ہے۔'' اس نے بڑی شدت سے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔''تھانے دار جی! نگہت بہت ہی دکھی اور پریشان حال عورت ہے۔ میں اس کی تکلیف کو محسوس کرتی ہوں۔ جس عورت کا شوہر چھن رہا ہو، آپ اس کے دل کی کیفیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں!''

تم نے وحید اللہ والے خط میں نگہت کو ایک جلالی عورت گردانا ہے اور کہا ہے وہ غصے میں آ کر کچھ بھی کر سکتی ہے؟'' میں نے تیکھی نظر سے اسے گھورا۔

وہ ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔''تو میں نے کون سا غلط کہا ہے۔ وہ بے چاری تو نادر خان کی وجہ سے مجبور ہے ورنہ اس کا بس چلے تو وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ اللہ نے اسے چار مردوں سے زیادہ طاقت دی ہے۔''

میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔''کیا نگہت جوش میں آ کر ڈاکٹر عطیہ کو قتل بھی کر سکتی ہے؟''

''کیوں نہیں جی؟'' وہ بے ساختہ بولی پھر کچھ گڑبڑا سی گئی جیسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو، بات بدلتے ہوئے بوکھلاہٹ آمیز لہجے میں اس نے کہا۔''وہ میرا مطلب ہے جی ......سر پر آن پڑے تو انسان کچھ بھی کر سکتا ہے ...... وہ کیا کہتے ہیں، مرتا کیا نہ کرتا......''

میں نے کہا۔''تمہارا جو بھی مطلب ہے وہ تو میں بعد میں دیکھ لوں گا۔ فی الحال میں نادر خان کے گھر کی طرف جا رہا ہوں۔''

میں نے حنیفاں کو حوالدار محمد بوٹا کے حوالے کیا اور اے ایس آئی اعظم خان کو ساتھ لے کر نادر خان کے گھر پہنچ گیا۔ حنیفاں نے جس انداز میں نگہت کا ''تعارف'' کرایا تھا اس سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ ان دونوں عورتوں میں سے کوئی ڈاکٹر عطیہ کی قاتل ہے یا پھر یہ لوگ قاتل کے بارے میں معلومات رکھتی ہیں۔ حنیفاں میرے قبضے میں آ چکی تھی لہٰذا نگہت کو پہلی فرصت میں گھسنا ضروری تھا۔

نادر خان اس وقت گھر پر ہی تھا۔ غیر متوقع طور پر مجھے اپنے دروازے پر دیکھ کر اسے شدید حیرت ہوئی۔ میں نے جب اسے بتایا کہ میں نے ڈاکٹر عطیہ کے قاتل کا سراغ لگا لیا ہے تو وہ مجھے جلدی سے اپنی بیٹھک میں لے گیا اور اضطراری لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! وہ بدبخت کون ہے؟''

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔''تم پہلے اپنی بیوی کو یہاں بلاؤ پھر بتاتا ہوں۔''

''میری بیوی کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟''

''بتاتا ہوں ......تم نگہت کو بلاؤ تو سہی۔''

اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور نگہت کو بلانے گھر کے اندرونی حصے کی طرف چلا گیا۔ حنیفاں کی گرفتاری اور پوچھ گچھ کے بارے میں، میں نے نادر خان کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھک میں نمودار ہوا۔

میں نگہت کو دیکھ کر چونک اٹھا۔ حنیفاں نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ اللہ نے نگہت کو چار مردوں سے زیادہ طاقت دی تھی۔ وہ ایک لحیم شحیم اور تنومند عورت تھی۔ کوئی عام سا مرد اس کے لپیٹے میں آ جاتا تو سانس لینا مشکل ہو جاتی۔ میں نے نگہت کے ہاتھوں کا جائزہ لیا اور پلک جھپکتے میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ ہاتھ بہ آسانی ڈاکٹر عطیہ کی گردن دبا سکتے تھے۔ وہ دونوں بیٹھک میں بیٹھ چکے تو نادر خان نے کہا۔

''جی ملک صاحب! نگہت آ گئی ہے۔ بولیں اب کیا کہتے ہیں؟''

میں کچھ کہنے کی بجائے یک ٹک نگہت کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ اس نے اگلے ہی لمحے نظر چرا لی اور کسی مجرم کی طرح بے چین ہو گئی۔ میں اس کے بدن کی اضطراری جنبشوں کو باریک بینی سے نوٹ کرنے لگا۔ وہ زیادہ دیر تک میری نگاہ کی تاب نہ لا سکی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر جیسے ہی اس نے بیٹھک سے نکلنے کے لئے قدم اٹھایا میں نے کڑک کر کہا۔

''رک جاؤ نگہت بیگم! تمہارا جرم کھل چکا ہے۔ اب تم ہمارے ساتھ جاؤ گی۔''

''ملک جی! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' نادر خان ہکا بکا مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے نادر خان کو نظر انداز کیا اور اے ایس آئی کو حکم دیا۔''اعظم خان! نگہت کو گرفتار کر لو۔''

''آپ میری بات تو سنیں ملک جی۔'' نادر خان بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔''نگہت کو آپ کس جرم میں گرفتار کر رہے ہیں؟''

میں نے نہایت ہی سنجیدگی سے کہا۔''جب میں آپ کے گھر آیا تھا تو میرے ذہن میں ایک شک تھا۔ لیکن آپ کی بیوی کی حرکات وسکنات نے میرے شک کو یقین میں بدل دیا ہے۔'' میں نے ایک لمحے کو توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔''ڈاکٹر عطیہ کو آپ کی بیوی نگہت نے قتل کیا ہے خان صاحب!''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' وہ اچھل پڑا۔''کوئی ثبوت بھی ہے آپ کے پاس؟''

PDF LIBRARY 0333-7412793

"ثبوت ادھر تھانے کے حوالات میں موجود ہے۔" میں نے نگہت کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ اس دوران میں اے ایس آئی اسے آہنی زیور پہنا چکا تھا۔ "میں نے دائی حنیفاں کو گرفتار کرلیا ہے۔ اس نے نہ صرف وحید اللہ کو خط لکھنے کا اقرار کیا ہے بلکہ آپ کی بیوی کے بارے میں بھی بہت سے انکشافات کئے ہیں اور ...... نگہت نے ان انکشافات کی تصدیق کر دی ہے۔"

نگہت اچانک ہی تھکی تھکی اور پژمردہ دکھائی دینے لگی۔ اس کے چہرے کی تازگی اور رعنائی پل بھر میں کافور ہوگئی۔ یہ اس کے مجرم ہونے کا ایک مسلّم ثبوت تھا۔ گویا میں نے بالکل ٹھیک جگہ پر ہاتھ ڈالا تھا۔

قانون جب ٹھیک جگہ پر ہاتھ ڈالتا ہے تو پھر مشکل سے مشکل کیس بھی چٹکی بجاتے میں حل ہو جاتا ہے۔ مجھے نگہت پر زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی اور تھوڑی سی کڑی پوچھ گچھ کے بعد اس نے ڈاکٹر عطیہ کے قتل کا اعتراف کر لیا۔

اپنا طویل بیان ریکارڈ کراتے وقت اس نے اس قتل کی تحریک کا سہرا دائی حنیفاں کے سر باندھ دیا جو رفتہ رفتہ نگہت کے کانوں میں ڈاکٹر عطیہ اور نادر خان کے خلاف زہر ٹپکاتی رہتی تھی۔ نگہت کی تمام تر معلومات کا ذریعہ دائی حنیفاں ہی تھی۔ نگہت کو اس کے سوا اپنے مسئلے کا کوئی حل نظر نہ آیا کہ وہ ڈاکٹر عطیہ کو اپنے راستے سے صاف کر دے۔ پھر جب نادر خان لالہ موسیٰ گیا تو اس نے اپنے منصوبے پر عمل کر ڈالا۔ نگہت کے مطابق ڈاکٹر عطیہ نہ صرف اس کا شوہر چھین رہی تھی بلکہ علاج معالجے کی آڑ میں وہ اسے مستقل بانجھ بنانے کی کوشش بھی کر رہی تھی ...... اور یہ تمام تر زہریلی باتیں دائی حنیفاں نے اس کی سوچ میں انڈیلی تھیں۔

ایک فتنہ پرور اور سازشی مکار عورت کی مکاری نے کتنا بڑا فساد کھڑا کیا، یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ ایسی دیا سلائی عورتوں کے شر سے اللہ ہر گھر کو محفوظ رکھے۔ آمین۔

※☆※

ابنِ شیطان

رات تاریک اور خاموش تھی۔ تاہم تھوڑے تھوڑے وقفے سے آسمانی بجلی کی چمک اور بادلوں کی گھن گرج اس خاموشی اور تاریکی کا دامن تار تار کر جاتی۔ میں اس وقت حوالدار فیض محمد کے ساتھ قد آدم گھنی جھاڑیوں میں موجود تھا۔ مذکورہ جھاڑیاں قبرستان کی حدود کے ساتھ ساتھ کافی فاصلے تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ہم وہاں سے قبرستان کے ایک مخصوص حصے کی نگرانی کر رہے تھے۔ ہمیں کسی کا انتظار تھا جو اس خاص حصے میں آنے والا تھا۔

انتظار نے جب طول پکڑا تو حوالدار بیزار ہونے لگا۔ اس نے بادلوں سے گھرے آسمان پر ایک نگاہ ڈالی اور اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ملک صاحب! مجھے تو لگتا ہے بارش شروع ہونے ہی والی ہے۔"

"ایک تو میں تمہاری اس کالی زبان سے بہت تنگ......"

میرا جملہ ادھورا رہ گیا...... اسی لمحے آسمان کے آنسو نکل آئے تھے۔

"میں کہہ رہا تھا نا ملک صاحب!" حوالدار نے بڑے فخریہ انداز میں کہا۔

میں نے بہ غور آسمان کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "اگر تم نہ کہتے تو اس میں تمہارا کیا نقصان تھا۔ اب ہمیں اس پناہ گاہ سے نکلنا ہوگا۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے جھنجلاہٹ آمیز انداز میں اضافہ کیا۔ "جب منہ میں ایسی کالی زبان ہو تو سوچ سمجھ کر کوئی اچھی بات بھی کی جاسکتی ہے۔"

"جناب! سب یہی کہتے ہیں، میری زبان بڑی کالی ہے۔" حوالدار فیض محمد نے شکایتی انداز میں کہا۔ "میں کئی مرتبہ آئینہ میں اپنی زبان کو دیکھ چکا ہوں۔ مجھے تو وہ کہیں سے کالی نظر نہیں آتی۔ وہ ویسی ہی ہے جیسی عام طور پر لوگوں کی ہوتی ہے۔"

اس دوران میں ہلکی پھلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ میں نے حوالدار سے کہا۔ "اب تم اپنے اس وضاحتی فلسفے کو لپیٹ کر ایک طرف رکھ دو اور یہاں سے نکلو۔ اگر ہم

PDF LIBRARY 0333-7412793

تھوڑی دیر مزید یونہی کھڑے رہے تو پوری طرح بھیگ جائیں گے اور ...... ہمارے پاس تبدیل کرنے کے لئے فی الحال اور کوئی لباس نہیں ہے۔"

اگلے ہی لمحے ہم گھنی جھاڑیوں سے باہر نکل آئے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر گورکن کا کمرا تھا۔ ہمارا رخ مذکورہ کمرے کی جانب ہو گیا۔ خود کو بھیگنے سے بچانے کے لئے فی الحال اس سے زیادہ محفوظ پناہ گاہ اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔

وہ قبرستان زیادہ بڑا نہیں تھا اور ایک ٹیلے پر آباد تھا۔ گورکن خیر دین کا کمرا اسی قبرستان کے ایک حصے میں بنا ہوا تھا جہاں وہ تنہا رہتا تھا۔ اس کے بیوی بچے وغیرہ نہیں تھے۔ خیر دین عرف خیرو کی ہی ایک سنسنی خیز اطلاع پر ہم آج رات قبرستان پہنچے تھے۔ اس کے مطابق گزشتہ چند روز سے قبرستان میں ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آرہا تھا۔ وہ یہ واقعہ سناتے ہوئے خاصا سہما ہوا بھی دکھائی دیتا تھا جس کا یہی مطلب تھا اس واقعے نے خیرو کے ذہن کو بری طرح متاثر کیا تھا۔

خیرو نے تھانے آکر مجھے بتایا تھا کہ آدھی رات کے بعد چاچی وزیراں کی قبر پر کوئی برقع پوش آتی ہے۔ وہ قبر کی پائنتی خاموش کھڑی رہتی ہے اور کچھ دیر بعد اسی خاموشی سے واپس چلی جاتی ہے۔ وزیراں چاچی کی تدفین ایک ہفتہ پہلے ہوئی تھی۔ وہ اسی قصبے کی رہنے والی ایک بے سہارا عورت تھی۔ اس دنیا میں اس کا کوئی نہیں تھا۔ کسی برقع پوش عورت کا آدھی رات کے بعد اس کی قبر پر حاضری دینا سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی۔ لہٰذا خیرو کو تشویش ہوئی اور وہ اپنے ذہن کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے میرے پاس تھانے چلا آیا تھا۔ میں نے اس کی کہانی بڑی توجہ سے سنی اور آج حوالدار کے ساتھ ادھر آگیا تھا تاکہ اس راز پر سے پردہ اٹھایا جا سکے۔

اس قبرستان میں داخلے کے لئے تین راستے تھے۔ ایک ہمارے قصبے کی طرف سے سیدھا قبرستان کو جاتا تھا۔ دوسرا راستہ مغربی سمت میں واقع فضل آباد نامی گاؤں کی جانب سے آتا تھا تاہم مذکورہ گاؤں قبرستان سے پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ تیسرا راستہ شمال کی سمت سے آتا تھا۔ قبرستان سے تھوڑی دور لگ بھگ ڈیڑھ میل کے فاصلے پر اس طرف ایک نہر واقع تھی جس کے دوسرے کنارے پر موضع نجیب پورہ واقع تھا۔ قبرستان کے مشرق میں ریلوے لائن تھی جو تقریباً قبرستان کو چھو کر گزرتی تھی۔ اس ریلوے لائن کے متوازی چند گز کے فاصلے سے مین روڈ گزرتی تھی۔ یہ تفصیل بتانے کا مقصد یہ ہے کہ قبرستان اور اس کا محل وقوع آپ کے ذہن میں نقش ہو جائے۔ ہمارا قصبہ "بخت نگر" قبرستان کے

جنوب میں آباد تھا۔ یہ قبرستان درحقیقت اسی قصبے سے متعلق تھا لہٰذا قوی امکان اس بات کا تھا کہ وہ برقع پوش عورت بخت نگر ہی کی رہنے والی تھی ورنہ فضل آباد یا نجیب پورہ سے آدھی رات کے بعد کسی عورت کا قبرستان پہنچنا سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

میں حوالدار کے ساتھ گورکن کے کمرے میں آگیا اور اپنے لباس کو جھاڑتے ہوئے جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

"خیرو! تمہاری وہ برقع والی تو نہیں آئی لیکن بارش آگئی!"

اس وقت ہم سادہ لباس میں تھے اور ایسے انتظام کے ساتھ قبرستان آئے تھے کہ اگر کوئی افراتفری کی صورت حال بھی پیش آجائے تو ہمیں اس سے نمٹاؤ میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔ سروس ریوالور بھی تیار حالت میں میرے پاس موجود تھا۔

خیرو گورکن نے میری جھنجلاہٹ کے جواب میں کہا۔ "تھانے دار جی! وہ ضرور آئے گی۔"

"تم اتنے وثوق سے تو یوں کہہ رہے ہو جیسے وہ تم سے کوئی وعدہ کر کے گئی ہو؟"

"بات وعدے کی نہیں جی۔" خیرو نے پلکیں جھپکائیں۔ "پچھلی جمعرات سے اب تک اس نے ایک ناغہ بھی نہیں کیا اور آج بھی جمعرات ہے۔ مجھے یقین ہے وہ آج بھی وزیراں کی قبر پر ضرور پہنچے گی۔ ہو سکتا ہے بارش کی وجہ سے رک گئی ہو۔"

گورکن کے کمرے میں اس وقت مریل روشنی والی ایک لالٹین جل رہی تھی۔ لالٹین کی ملگجی روشنی کمرے کی تاریکی کو پوری طرح نگلنے میں کامیاب تو نہیں تھی تاہم پھر بھی اچھا خاصا گزارہ ہو رہا تھا۔ اس کمرے کی واحد کھڑکی قبرستان کی جانب کھلتی تھی یعنی قبرستان کے اس حصے کی سمت جدھر چاچی وزیراں کی قبر واقع تھی۔ کھڑکی میں سے وہ قبر اور اس کا آس پاس وضاحت سے نظر آتا تھا۔

میں مذکورہ کھڑکی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ خیرو کا دعویٰ تھا کہ اس نے پچھلی جمعرات سے گزشتہ رات تک اس برقع پوش عورت کو بڑی باقاعدگی کے ساتھ وزیراں کی قبر پر آتے دیکھا تھا۔ وزیراں چاچی کو گزشتہ جمعرات کو عصر اور مغرب کے درمیان لحد میں اتارا گیا تھا اور اسی روز آدھی رات کے بعد وہ برقع پوش پراسرار عورت پہلی مرتبہ قبرستان کے اندر دکھائی دی تھی۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ خیر دین اسے وزیراں چاچی کی قبر کے نزدیک کھڑے دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اس رات وہ اپنے کمرے سے نکلنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ آنے والی دو راتوں کو بھی یہ واقعہ تواتر سے پیش آیا تو اس نے جی کڑا کر کے کمرے

PDF LIBRARY 0333-7412793

سے نکلنے کا فیصلہ کرلیا۔ وزیراں کی قبر کی طرف جاتے ہوئے اس نے وہ کدال اپنے ہاتھ میں لے لی جو قبروں کی کھدائی میں کام آتی تھی۔ یہ اس کے اندر کا خوف تھا۔ بہرحال وہ محتاط قدموں سے چلتے ہوئے ذرا طویل چکر کاٹ کر اس برقع پوش کے عقب میں پہنچ گیا اور وہیں کھڑے کھڑے للکار کر اس سے استفسار کیا۔

''اے بی بی! کون ہو تم ...... اور اس وقت قبرستان میں کیا کر رہی ہو؟''

خیر دین کو اپنی آواز میں ایک واضح لرزش محسوس ہوئی۔ دوسری جانب جب کامل خاموشی رہی تو اس نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''تم وزیراں کی کیا لگتی ہو اور آدھی رات کے بعد قبرستان میں کیوں آئی ہو؟ میری بات کا جواب دو ورنہ......''

خیر دین نے ''ورنہ'' پر جملہ ادھورا چھوڑ دیا لیکن اس برقع کے اندر بدستور خاموشی رہی۔ اس پراسرار سناٹے نے خیر دین کے خوف کو بڑھا دیا۔ بجائے اس کے کہ وہ آگے بڑھ کر اس برقع پوش سے مزید استفسار کرتا، اس نے قدم قدم پیچھے کھسکنا شروع کر دیا۔ اس کے ذہن نے سمجھایا کہ یہ کوئی عورت نہیں بلکہ اس برقع کی آڑ میں کوئی بہت بڑی آفت چھپی ہوئی ہے اس لئے اسے بڑی شرافت کے ساتھ اپنے کمرے میں چلے جانا چاہئے۔ کوئی عورت تن تنہا اتنی رات کو قبرستان میں قدم رکھنے کی ہمت نہیں کر سکتی۔ یہ یقیناً کوئی اور چکر ہے ...... پراسرار اور ماورائی چکر!''

وہ اپنے کمرے میں پہنچا اور دبک کر بستر میں سو گیا۔ اگلے روز اس نے تھانے آ کر مجھے اس عجیب و غریب عورت کے بارے میں بتایا تو مجھے یقین نہ آیا۔ میں نے خیر دین کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے اندر تھوڑا حوصلہ پیدا کر لے اور آئندہ اگر وہ عورت قبرستان میں دکھائی دے تو اس کا تعاقب کرنے کی کوشش کرے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ کہاں سے آتی ہے۔ پتہ نہیں میری بات خیر دین کی سمجھ میں آئی کہ نہیں تاہم وہ اپنے چہرے پر الجھن کا جال سجائے واپس چلا گیا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے خیر دین کی کہانی پر یقین نہیں آیا تھا۔ میں نے اسی لئے اسے ٹال دیا تھا۔ اول تو یہ کہ چاچی وزیراں کا دور یا نزدیک کا کوئی عزیز رشتے دار نہیں تھا۔ وہ ایک طویل عرصے سے بیوگی کی زندگی گزار رہی تھی اور اسی بیوگی کے عذاب نے بالآخر اس کی زندگی ختم کر دی۔ اس کی قبر پر آدھی رات کے بعد کسی برقع پوش عورت کا باقاعدہ آنا ایک غیر منطقی اور ناقابل یقین بات تھی۔ میرے خیال میں گورکن خیرو نے کوئی بھیانک خواب دیکھا تھا۔ یہ خواب کھلی آنکھوں کا بھی ہو سکتا تھا اور بند آنکھوں کا بھی!

دو روز بعد خیرو ایک مرتبہ پھر میرے پاس آیا۔ اس وقت اس کی گھبراہٹ دیدنی تھی۔ اس نے بڑے سراسیمہ انداز میں مجھے بتایا۔ ''تھانے دار صاحب! میں نے آپ کی ہدایت پر عمل کیا ہے لیکن......''

اس نے جملہ ادھورا چھوڑا اور وحشت بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے جلدی سے پوچھا۔ ''لیکن کیا خیر دین؟''

''مجھے تو جناب! یہ کوئی اور ہی معاملہ لگتا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''وہ نہ بولتی ہے اور نہ ہی قابو آتی ہے۔ میں اس کے سامنے بے بس ہو کر رہ جاتا ہوں۔ میں ...... میں محسوس کر رہا ہوں، اس برقع کے اندر کوئی پراسرار ہستی چھپی ہوئی ہے ...... کوئی روح......''

اس کی ذہنی حالت کو دیکھ کر مجھے سخت افسوس ہوا تھا۔ اس کا چہرہ ذہنی پریشانی کا غماز تھا۔ حرکات و سکنات سے بھی خوفزدگی جھلکتی تھی۔ میں سمجھ گیا اس برقع پوش کے حوالے سے وہ کسی گہرے وہم میں مبتلا ہو چکا تھا۔ میں کسی روح کی ایسی سرگرمیوں پر یقین نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا خوف دور کرنے کی خاطر میں نے بڑے نرم لہجے میں پوچھا۔

''تم نے میری ہدایت پر اس کا تعاقب کیا تو کیا نتائج برآمد ہوئے؟''

''میں دونوں مرتبہ اس کوشش میں ناکام ہو گیا۔'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''پہلی بار میں نے جیسے ہی اسے وزیراں کی قبر کے پاس کھڑے دیکھا، میں دبے قدموں اپنے کمرے سے نکل آیا اور پھر وہ ...... غائب ہو گئی۔''

''کہاں غائب ہو گئی؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''پتہ نہیں جی، وہ کہاں چلی گئی!'' وہ ہونقوں کی مانند گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے کمرے سے باہر آنے کے بعد جیسے ہی وزیراں کی قبر کی جانب نگاہ کی، وہ وہاں نہیں تھی۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ ایک لمحے میں وہ کہاں چلی گئی؟ میں نے اس کی تلاش میں سارا قبرسان چھان مارا لیکن یوں لگتا تھا اسے آسمان نے کھا لیا تھا یا پھر زمین نگل گئی تھی!''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوا پھر بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''جناب! دوسری مرتبہ میں نے ایک ترکیب آزمائی۔ میں اس کی آمد کے وقت سے تو واقف ہو گیا تھا۔ وہ عموماً آدھی رات کے بعد ہی آتی تھی۔ میں اس سے کافی دیر پہلے جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں جا چھپا۔ وہ جھاڑیاں وزیراں کی قبر کے نزدیک ہی ہیں اور ان کے اندر رہتے ہوئے مذکورہ قبر پر نگاہ رکھی جا سکتی ہے۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

PDF LIBRARY 0333-7412793

"وہ برقع پوش عورت اپنے مخصوص وقت پر وہاں پہنچ گئی۔ میں بڑی توجہ اور دلچسپی سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ بیس پچیس منٹ تک قبر کی پائنتی خاموش کھڑی رہی پھر جب وہ جانے کے لئے پلٹی تو میں حرکت میں آ گیا لیکن یہ کیا ...... میں نے جھاڑیوں سے باہر آنے کی کوشش کی تو مجھے یوں لگا جیسے میرے ہاتھ پاؤں کو کسی نے مضبوط رسیوں سے باندھ دیا ہو۔ وہ بالکل جڑ کر رہ گئے تھے۔ میں نے خود کو مکمل بے بس محسوس کیا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے بڑی بے یقینی سے اپنے سامنے بیٹھے خیرو کو دیکھا تو وہ بولا۔

"جناب! بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔" اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔ "میں خود اس وقت چکرا کر رہ گیا تھا۔ اپنے ہاتھ پاؤں کو ناکارہ پا کر میں نے اس آفت کی پرکالہ کی طرف ڈرتے ڈرتے نگاہ اٹھائی تو وہ غائب ہو چکی تھی۔ قبرستان اس کے وجود سے خالی تھا۔"

میں نے گہری نظر سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا تھا۔ "خیرو! تم نے ایک ناقابل یقین اور عجیب کہانی سنائی ہے۔ ایسا ہونا ممکن نہیں۔"

"جناب! مجھے پورا یقین ہے۔" وہ خوفزدہ مگر پُر وثوق لہجے میں بولا۔ "وہ عورت یا تو کوئی جادوگرنی ہے یا پھر کوئی روح ہے۔"

"میں تمہاری دونوں باتوں سے اتفاق نہیں کر سکتا!" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"آپ وہاں آ کر خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے تو آپ کو بھی یقین آ جائے گا۔"

"ہاں...... اب مجھے ایک رات قبرستان میں گزارنا ہی ہو گی۔" میں نے پُر سوچ انداز میں کہا۔ "تمہاری بیان کردہ کہانی خاصی دلچسپ اور سنسنی خیز ہے۔"

اور اس سے اگلی رات میں حوالدار فیض محمد کے ساتھ قبرستان پہنچ گیا تھا۔ نصف شب سے تھوڑا پہلے ہم ان جھاڑیوں میں چھپ گئے جو وزیراں چاچی کی قبر کے نزدیک تھیں لیکن بارش نے ہمیں وہاں سے کھدیڑ کر گورکن کے کمرے میں پہنچا دیا تھا۔

میں نے کمرے کی واحد کھڑکی سے باہر دور تک دیکھتے ہوئے خیر دین سے پوچھا۔ "خیرو! میں تو اب تک کی محنت کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ برقع پوش عورت اور اس کی پراسرار سرگرمیاں تمہارے منتشر ذہن کی پیداوار ہے۔ تم تنہائی کی بے کیف زندگی گزارتے ہوئے کسی دماغی مرض میں مبتلا ہو گئے ہو۔ تمہیں ایک مناسب علاج اور آرام کی ضرورت ہے۔"

"جناب! آپ مجھ پر جتنی مرضی بے اعتباری کر لیں لیکن جب آپ اسے اپنی آنکھوں

سے دیکھ لیں گے تو میری بات کا یقین آ جائے گا۔" وہ میرے عقب میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ "وہ پچھلے ایک ہفتے سے برابر مجھے نظر آ رہی ہے۔ آج بھی وہ ضرور آئے گی۔ لگتا ہے بارش نے کچھ گڑبڑ کر دی ہے۔"

میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ "خیرو! تم بھی عجیب باتیں کرتے ہو۔ ایک طرف تم اس برقع پوش کو جادوگرنی اور روح کہتے ہو، دوسری جانب اس پراسرار ہستی کو بارش کے سامنے مجبور بھی ظاہر کر رہے ہو۔ یہ کیسا تضاد ہے؟"

"آپ اُڑا لیں جی میرا مذاق۔ جتنا چاہیں، اُڑا لیں۔" وہ شاکی لہجے میں بولا۔ "میں جانتا ہوں آپ کو میری بات کا یقین نہیں آیا لیکن جب وہ نظر آئے گی تو آپ اس کے وجود کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

"لیکن وہ نظر کب آئے گی؟" میں نے جھلاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ "رات کا ایک بج رہا ہے۔ کیا ہم یونہی بے وقوف بنتے ہوئے ساری رات آنکھوں میں گزار دیں؟"

حوالدار نے کہا۔ "ملک صاحب! وہ تو بھلا ہو بارش کا جو ہمیں اس کمرے تک لے آئی ورنہ یہ رات ہمیں ان جھاڑیوں میں مچھروں سے کشتی کرتے ہوئے گزارنا پڑتی۔"

وہ اگست کا مہینہ تھا۔ گرمی اپنے عروج پر تھی اور ہر طرف مچھروں کی بھی بہتات تھی۔ تاہم خیر دین نے اپنے کمرے میں اپلوں اور کسی خاص لکڑی کو باہم جلا کر ایک دھونی کا بندوبست کر رکھا تھا یہ دھونی دافع مچھر تھی تاہم دھوئیں کے باعث ہمیں سانس لینے میں دشواری کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے حوالدار کے تبصرے کے جواب میں کہا۔

"بس، ہم بارش کے تھمنے کا انتظار کریں گے۔ اس کے بعد یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔ پھر خیر دین جانے اور اس کی برقع والی!"

خیر دین کی عمر پچپن اور ساٹھ کے درمیان رہی ہو گی۔ وہ ایک دُبلا پتلا اور مخدوش صحت کا مالک تھا۔ میں جب سے اس قصبے میں تعینات تھا، خیر دین سے یہ میرا پہلا واسطہ تھا۔ ویسے اس کے بارے میں سطحی طور پر معلومات رکھتا تھا۔ وہ سال ہا سال سے مذکورہ قبرستان سے وابستہ تھا۔ اس سے پہلے اس کا باپ اس قبرستان کا گورکن ہوا کرتا تھا۔

حوالدار بھی میرے نزدیک کھسک آیا اور کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے بولا۔ "ملک صاحب! اس بوندا باندی کے ارادے تو مجھے خاصے خطرناک دکھائی دیتے ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ صبح سے پہلے یہ ہمیں یہاں سے نکلنے کا موقع دے!"

"تمہاری زبان لاکھ اور کروڑ کالی سہی مگر میں اس کی پرواہ نہیں کروں گا۔" میں نے

PDF LIBRARY 0333-7412793

فیض محمد سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”اگر مزید آدھے گھنٹے تک اس برقع پوش کے آثار نمودار نہ ہوئے تو میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا، چاہے تھانے پہنچتے پہنچتے ہم شرابور ہی کیوں نہ ہو جائیں۔“

”جو حکم ملک صاحب!“ حوالدار فرمانبرداری سے بولا۔

فیض محمد اور خیر دین میرے عقب میں رہتے ہوئے پہلو بہ پہلو آن کھڑے ہوئے تھے۔ میری طرح اس وقت وہ بھی کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے۔ ہم سب کا مرکز نگاہ چاچی وزیراں کی قبر تھی جو اندھیرا ہونے کے باوجود بھی کم فاصلے کے باعث ہمیں بڑی واضح نظر آ رہی تھی۔

خیرو نے کہا۔ ”آپ تو چلے جائیں گے جناب!“ اس کا مخاطب میں تھا۔ ”آپ کے جانے کے بعد اگر وہ آ گئی تو پھر کیا ہو گا؟“

”ہونا کیا ہے!“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”وہ تو گزشتہ ایک ہفتے سے ادھر آ رہی ہے۔ اب تک اس نے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا تو آج کیا بگاڑ لے گی؟“

”آج تو بارش بھی ہو رہی ہے۔“ وہ سراسیمہ لہجے میں بولا۔ ”اگر اس نے میرے کمرے کا رخ کر لیا تو......؟“

اس نے سوالیہ انداز میں جملہ نامکمل چھوڑا اور وحشت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اس کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔ ”خیر دین! اس خیالی برقع پوش نے تمہارے دل اور ذہن کو بری طرح اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ افسوس کہ میں فی الحال تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ تم بھی ہمارے ساتھ تھانے چلو۔ میں کل سے یہاں ایک کانسٹیبل کی ڈیوٹی لگا دوں گا۔ وہ سورج غروب ہوتے ہی تمہارے پاس آ جایا کرے گا اور دوسری صبح یہاں سے رخصت ہو گا۔ جب تک اس برقع پوش کے حوالے سے تمہارا ذہن اور دل خوف سے خالی نہیں ہو جاتا، کانسٹیبل رات بھر تمہارے ساتھ رہا کرے گا۔ سر دست تمہارے مسئلے کا یہی مناسب حل نظر آ رہا ہے۔“

میں گورکن خیرو سے مخاطب تھا کہ اسی وقت مجھے اپنے کندھے پر ہاتھ کا مخصوص دباؤ محسوس ہوا۔ میں تیزی سے پلٹا۔ وہ حوالدار فیض محمد تھا جو ہمیں محو گفتگو دیکھ کر کھڑکی کے قریب چلا گیا تھا۔ میں نے جیسے ہی پلٹ کر دیکھا، میری سماعت سے اس کی سنسناتی ہوئی آواز متصادم ہوئی۔ وہ کھڑکی سے باہر ایک سمت انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”ملک صاحب! وہ دیکھیں...... وہ سفید سی کیا شے ہے؟“

میری نگاہ نے اس کے اشارے کا تعاقب کیا اور سفید شے پر جا کر ٹک گئی۔ سفید شے متحرک تھی اور دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی۔ میں نے پلک جھپکتے میں اندازہ لگا لیا کہ وہ کوئی انسان تھا جو سراپا کسی سفید پوشاک میں ملبوس تھا۔ اگلے ہی لمحے میرے کانوں میں خیر دین کی سرسراتی ہوئی آواز پہنچی۔

”یہ...... یہ...... یہی ہے...... وہ برقع پوش...... مم...... مم...... میں نے کہا تھا نا...... وہ ضرور آئے گی تھانے دار جی...... وہ آ گئی۔“

میں پوری توجہ سے اس پر نظر گاڑے کھڑا رہا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، بڑے محتاط قدموں سے وزیراں چاچی کی قبر کی سمت بڑھ رہا تھا۔ اس کے داخلی زاویے سے میں نے اندازہ قائم کیا کہ وہ فضل آباد کی طرف سے قبرستان میں داخل ہوا تھا اور یہ اور بھی حیران کن بات تھی۔ کیونکہ اس جانب پانچ میل تک کوئی آبادی نہیں تھی۔ فضل آباد کا علاقہ پانچ میل کے بعد شروع ہوتا تھا۔

نظر جمانے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ میں نے فوراً اندازہ لگا لیا اس پراسرار ہستی نے ٹوپی والا سفید (شٹل کاک) برقع پہن رکھا تھا۔ مذکورہ برقع کی حامل واقعی چاچی وزیراں کی قبر کی پائنتی پہنچ کر رک گئی۔ اتنے فاصلے سے یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا کہ اس وقت وہ خاموش تھی یا نہیں۔

خیر دین نے ہیجانی لہجے میں کہا۔ ”وہ بیس پچیس منٹ تک یونہی خاموش کھڑی رہے گی۔ اس کے بعد واپس چلی جائے گی۔“

”آج وہ واپس نہیں جا سکے گی۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ہم تمہاری آنکھوں کے سامنے اس کا برقع اتاریں گے...... اور مجھے یقین ہے تمہارے ہاتھ پاؤں میں رسیاں بھی نہیں بندھیں گی!“

پھر میں حوالدار کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”فیض محمد! تم قبرستان کی باؤنڈری کے ساتھ ساتھ فضل آباد کے رخ پر حرکت کرو گے۔ پھر وہاں پہنچ جاؤ گے جہاں قبرستان کے اندر داخل ہونے کا راستہ ہے۔ ادھر سے تم محتاط قدموں سے چلتے ہوئے وزیراں کی قبر کی طرف پیش قدمی کرنا اور چند گز کے فاصلے پر رک جانا۔ مجھے امید ہے یہ جس راستے سے قبرستان میں داخل ہوئی ہے، ادھر ہی سے واپس بھی جائے گی۔“ میں سانس لینے کی خاطر تھوڑا متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

PDF LIBRARY 0333-7412793

"میں جھاڑیوں والی سمت سے اس کی طرف بڑھتا ہوں۔ اس طرف کا سارا علاقہ میں کور کر لوں گا اور اگر وہ آمد کے راستے سے فرار ہونے کی کوشش کرے تو تم اسے دبوچ لینا۔" پھر میں نے خیر دین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس بات کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں کہ وہ بخت نگر کا رخ کرے۔ بالفرض محال اگر اس نے ایسی کوئی کوشش کی تو تم ہمت سے کام لینا اور اس کو پکڑ لینا۔ ٹھیک ہے؟"

"مم...... میں...... اس کو پکڑ لوں......؟"

"ہاں...... میں نے یہی کہا ہے۔" میں نے تاکیدی انداز اختیار کیا۔ "وہ تمہیں کھا نہیں جائے گی۔ ویسے مجھے یقین ہے میں اکیلا ہی اسے قابو کر لوں گا۔ بس تمہیں تھوڑی ہمت کا مظاہرہ کرنا ہو گا۔"

ٹھیک ایک منٹ بعد ہم گورکن خیرو کو اس کے کمرے میں شش و پنج میں مبتلا چھوڑ کر باہر نکل آئے، پھر اپنی اپنی راہ پر ہو لئے۔ تھوڑی دیر پہلے شروع ہونے والی بوندا باندی کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا۔ میں ریلوے لائن والی سمت میں قبرستان کا کنارہ پکڑ کر ان جھاڑیوں میں پہنچ گیا جہاں بارش شروع ہونے سے پہلے ہم نے پناہ لے رکھی تھی۔ یہ فاصلہ میں نے بہ مشکل تین منٹ میں طے کر لیا تھا۔ خیر دین نے بتایا تھا کہ وہ برقع پوش پراسرار عورت بیس پچیس منٹ تک وزیراں کی قبر کی پائنتی کھڑی رہتی ہے۔ اس حساب سے ابھی اچھا خاصا وقت باقی تھا۔ میں نے تھوڑی دیر جھاڑیوں میں رک کر اس کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ مذکورہ جھاڑیوں سے وزیراں کی قبر کا فاصلہ بہت کم تھا۔

برقع پوش عورت سنگ مرمر کے کسی بُت کی مانند خاموش اور ساکت کھڑی تھی۔ شٹل کاک برقع کے اندر اس کے جسمانی خطوط کی ناپ تول ممکن نہیں تھی۔ اس گھیر دار وسیع و عریض برقع نے سرتاپا اسے ایک اسرار میں بدل دیا تھا۔ تاہم یہ اندازہ لگانے میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا کہ وہ ایک قد آور عورت تھی۔ اس کا قد کسی بھی طور پر پانچ فٹ آٹھ انچ سے کم نہیں تھا!

میں لگ بھگ دس منٹ تک تنقیدی نظر سے اس کا جائزہ لیتا رہا۔ جب وہ ٹس سے مس نہ ہوئی تو مجھے ایک بے نام سی کوفت ہونے لگی۔ مسلسل جاری بوندا باندی نے میرے لباس کو پوری طرح بھگو دیا تھا۔ میں نے جھاڑیوں کو وداع کہنے کا فیصلہ کیا اور اگلے ہی لمحے میں جھاڑیوں سے باہر تھا۔ میں بغیر آواز پیدا کئے آہستگی سے اس کے عقب میں پیش قدمی کرنے لگا۔

میرا خیال تھا، وہ میری پیش قدمی سے آگاہ ہو جائے گی۔ کیونکہ ہزار احتیاط کے باوجود بھی قدموں کی جنبشوں سے ایک مخصوص آہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ اس کا ایک سبب تو رات کا سناٹا اور دوسری وجہ وہ بوندا باندی تھی جس نے قبرستان کی زمین کو کیچڑ زدہ بنا دیا تھا...... مگر میرا یہ خیال غلط ثابت ہو گیا۔ برقع پوش کو مطلق احساس نہ ہوا اور میں اس سے محض پانچ گز کے فاصلے پر عقب میں پہنچ گیا۔

اس کا سکوت اور انہماک دیکھ کر میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ وہ اس وقت ذکر خفی میں مصروف تھی۔ یہ ذکر نوری بھی ہو سکتا تھا اور ناری بھی، رحمانی بھی ہو سکتا تھا اور شیطانی بھی! جہاں تک میرا علم اور تجربہ کام کرتا تھا اس کے مطابق کسی بھی گندے یا شیطانی عمل کے لئے با آواز بلند یا کم از کم بڑبڑانے والے انداز میں پڑھائی کی جاتی ہے۔ برقع پوش کی خاموشی اور سکوت سے ثابت ہوتا تھا وہ دل ہی دل میں وہاں مدفون چاچی وزیراں کی بخشش اور نجات کے لئے کسی قسم کی کوئی دعا وغیرہ پڑھ رہی ہو گی۔

ایسا سوچنا تو بے جا تھا۔ تاہم اس سوچ کے ساتھ ہی دو بڑی الجھنیں سوالیہ صورت اختیار کر کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھیں۔ نمبر ایک یہ بیٹھے بٹھائے چاچی وزیراں کی اتنی ہمدرد اور خیر خواہ کہاں سے نمودار ہو گئی تھی؟ وزیراں کا تعلق بخت نگر سے تھا اور سب لوگ اس بات پر متفق تھے کہ اس دنیا میں اس کا قریبی کوئی نہیں اور پھر...... یہ برقع پوش فضل آباد کی طرف سے وارد ہوئی تھی۔ نمبر دو، اگر یہی فرض کر لیا جاتا کہ وہ چاچی وزیراں کی کوئی بھی خیر خواہ ہے تو بھی آدھی رات کے بعد ایک مخصوص وقت پر، اس کی قبر پر حاضری دینے کی کیا تک بنتی تھی؟ یہ تک آج تو اور بھی بے تکی ہو گئی تھی کہ برستی بارش میں بھی اس نے ناغہ نہیں کیا تھا۔

پتہ نہیں اس کا مخصوص وقت پورا ہو گیا تھا یا اس نے مقررہ وقت سے پہلے ہی اپنا "عمل" ختم کر دیا تھا۔ وہ جانے کے لئے پلٹی تو میں نے ریوالور نکال لیا اور دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

"رک جاؤ...... ورنہ بھیجے میں گولی اتار دوں گا۔"

وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ اس وقت میری جانب اس کی پشت تھی اور نہ ہی چہرہ بلکہ وہ پہلو کے بل کھڑی تھی۔ اس کا رخ فضل آباد کی سمت تھا۔ رکنے کے بعد بڑے اضطراری انداز میں اس نے میری جانب گردن موڑی لیکن منہ سے کچھ نہیں بولی۔

میں نے ریوالور والے ہاتھ کو اس کی "آنکھوں" کے سامنے لہراتے ہوئے سخت لہجے

PDF LIBRARY 0333-7412793

میں کہا۔ ”میرا نام ملک صفدر حیات ہے ...... میں اس علاقے کا تھانے دار ہوں اور تمہاری ایک جھلک دیکھنے کے لئے یہاں آیا ہوں۔ چہرے سے برقع اٹھا دو۔“

میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا، ان لمحات میں اس کے چہرے پر کس قسم کے تاثرات ہوں گے۔ اس کا چہرہ جالی دار ٹوپی کے عقب میں چھپا ہوا تھا جہاں تک میری نگاہ کی رسائی ممکن نہیں تھی۔ البتہ یہ بات یقینی تھی کہ وہ اس تہ در تہ نقاب کے پیچھے سے مجھے ضرور دیکھ رہی ہو گی ...... اور میرے ہاتھ میں موجود ریوالور بھی اس کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں رہا ہو گا۔

میری دھمکی اور مطالبے کے نتیجے میں اس نے جب مسلسل خاموشی اختیار کئے رکھی تو میں نے سفاکی سے کہا۔ ”میں صرف تین تک گنوں گا ...... اگر تم نے گنتی ختم ہونے سے پہلے مجھے اپنا چہرہ نہ دکھایا تو میں گولی چلا دوں گا۔ یہ سوچے بغیر کہ اس گولی سے تم محض زخمی ہوتی ہو یا جان سے جاتی ہو۔ اب تمہاری بربادی اور سلامتی تمہارے ہاتھ میں ہے۔ ایک......!“

یہ میری ایک چال تھی۔ میں اس پر فائر کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اگر اس کی جگہ مجھے کسی مرد کو چھاپنا ہوتا تو میں یہ ”ایک، دو، تین“ کے تکلفات میں نہ پڑتا اور ”جن جپھا“ ڈال کر اسے قابو کر لیتا۔ لیکن عورت کے معاملے میں بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔ یہ میں نے اپنا ذاتی اصول بیان کیا ہے ورنہ بہت سے پولیس والے ان تکلفات میں نہیں پڑتے اور مرد و زن کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں۔

میں نے برقع پوش عورت کو دھمکی دیتے ہی گنتی بھی شروع کر دی تھی۔ ایک کے بعد دو کی باری آئی اور پھر اس سے پہلے کہ میں اپنی زبان سے تین کا ہندسہ ادا کرتا اس نے ایک عجیب حرکت کی۔

اس نے قدرے جھک کر برقع کے گھیر کو تھام لیا۔ میں یہی سمجھا کہ وہ برقع اٹھا کر مجھے اپنا چہرہ دکھانے والی ہے مگر اگلے ہی لمحے میرا اندازہ غلط ہو گیا۔ اس نے برقع کو تھامتے ہی ایک جانب دوڑ لگا دی۔ یہ وہی سمت تھی، پانچ میل دور جس طرف فضل آباد، آباد تھا۔

میں للکارتے ہوئے اس کے پیچھے لپکا۔ ”رک جاؤ ...... ورنہ گولی چلا دوں گا۔“

اس نے فائرنگ کی پرواہ نہیں کی اور بڑی پھرتی سے دوڑتی چلی گئی۔ اس کی مستعدی نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔ ایک عورت ذات سے ایسی چوبندی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

میری دھمکی کا جب اس پر مطلق اثر نہ ہوا تو میں نے ہوائی فائر کر دیا۔ ادھر میرے ریوالور سے گولی نکلی ادھر وہ مردہ چھپکلی کی مانند قبرستان کی زمین پر گری۔ میں یہی سمجھا کہ شاید میری فائرنگ نے اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا، میری فائرنگ کا زاویہ اس کے لئے قطعاً مہلک نہیں تھا۔ میرے ریوالور سے نکلنے والی گولی اس کی مزاج پرسی کی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔

وہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ میں اس کے قریب آ گیا اور اکڑوں بیٹھ کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ اسی لمحے حوالدار فیض محمد بھی سامنے آ گیا۔ فائر کی آواز نے اسے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ پھر زمین پر پڑی اس برقع پوش کو دیکھ کر اس کی تشویش میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

”ملک صاحب! لگتا ہے آپ نے اس کا کام پورا کر دیا!“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے بڑے وثوق سے کہا۔ ”یہ خود ہی الجھ کر گری ہے۔ اسے گولی نہیں لگ سکتی۔ میں نے ہوائی فائر کیا تھا۔ اگر یہ فائرنگ کی زد میں آئی ہوتی تو اب تک اس کے جسم کے متاثرہ حصے سے خون جاری ہو چکا ہوتا!“

”کہتے تو آپ ٹھیک ہیں۔“ حوالدار نے تائیدی انداز میں کہا۔ ”میرے خیال میں یہ فائر کی دہشت سے بے ہوش ہو گئی ہے!“

”خیر یہ ایسی کمزور دل بھی نہیں۔“ میں نے زمین پر پڑی اس برقع پوش عورت کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر یہی بات ہوتی تو پھر وہ آدھی رات کے بعد تن تنہا اس قبرستان میں قدم رکھنے کا خیال بھی دل میں نہ لاتی۔ بہرحال......“ میں ایک لمحے کے لئے متوقف ہوا پھر تحکمانہ انداز میں حوالدار سے کہا۔

”تم اس کے چہرے سے برقع ہٹاؤ ...... ذرا پتہ تو چلے یہ آخر ہے کون؟“

حوالدار نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کی اور اگلے ہی لمحے ہم دونوں ششدر ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ برقع کی اوٹ میں سے کوئی عورت نہیں بلکہ ایک مرد کا چہرہ برآمد ہوا تھا!

اس انکشاف کے بعد کہ وہ کوئی بہروپیا تھا اور برقع اوڑھ کر اس قبرستان میں کوئی خفیہ سرگرمی جاری رکھے ہوئے تھا، میں فوری طور پر ایکشن میں آ گیا۔ پھر میری ہدایت پر حوالدار فیض محمد نے اس کا برقع پوری طرح اتار پھینکا۔ اس کے قد و قامت کو دیکھ کر مجھے

PDF LIBRARY 0333-7412793

ہلکا سا شبہ تو ہوا تھا تاہم اس وقت میرا ذہن یہ اندازہ لگانے سے قاصر رہا تھا کہ اس گھیر دار شٹل کاک برقع کے اندر عورت کی بجائے کوئی مرد چھپا ہوگا۔

سفید برقع کے اندر سے برآمد ہونے والا وہ شخص قبرستان کی زمین پر بے ہوش پڑا تھا۔ پھر اگلے ہی لمحے اس کی بے ہوشی کا سبب بھی میری سمجھ میں آ گیا۔ وہ جس جگہ گرا تھا وہاں ایک پختہ قبر موجود تھی۔ بھاگتے ہوئے کسی وجہ سے اس کا پاؤں رپٹ گیا ہوگا اور اغلب امکان یہی تھا کہ گرتے وقت اس کا سر پختہ قبر کے کنارے سے ٹکرایا ہوگا۔ کھوپڑی پر لگنے والی اس شدید چوٹ نے اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا تھا۔

میں نے چند لمحات میں اس ''برقع پوش'' زمین بوس، بے ہوش شخص کا جائزہ لیا۔ اس کی عمر پچیس سے زیادہ نہیں رہی ہوگی۔ قد پانچ فٹ آٹھ انچ کے قریب۔ متناسب جسم اور مناسب صحت۔ پاؤں میں اس نے زنانہ چپل پہن رکھی تھی جو یقیناً دوسروں کو دھوکا دینے کے لئے تھی۔ اس کے باقی جسم کو تو وسیع وعریض برقع نے ڈھانپ رکھا تھا۔ آ جا کر پاؤں ہی بچتے تھے جن سے اسے پکڑا جا سکتا تھا اور ...... اس نے زنانہ چپل کے ذریعے اپنی اس مردانہ شناخت کو بھی ختم کر دیا تھا۔ اس کے بدن پر بڑا سادہ لباس تھا۔ کورے لٹھے کی شلوار اور کاٹن کا کلیوں والا کرتہ!

اس دوران میں گورکن خیر دین بھی جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔ مذکورہ ''برقع نشین'' پر اس کی نگاہ پڑی تو حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''یہ ...... یہ ...... مرد ہے......'' وہ لکنت زدہ انداز میں ہکلایا۔

میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''خیر دین! ہم نے تمہاری برقع والی کے ساتھ کوئی اونچ نیچ نہیں کی۔ پتہ نہیں یہ عورت سے مرد کیسے بن گئی۔ بہرحال جو بھی ہے، تمہارے سامنے ہے!''

''مجھے یقین نہیں آ رہا!'' وہ آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے بولا اور لالٹین لے کر ایک مرتبہ پھر اس شخص کی جانب بڑھا۔ ''میں تو اب تک اسے کوئی پردہ دار بی بی ہی سمجھ رہا تھا۔''

خیر دین نے عقل مندی کا ایک کام یہ کیا تھا کہ کمرے سے نکلتے وقت وہ لالٹین اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے اس بے ہوش شخص کا تفصیلی معائنہ کیا تھا۔ اس میں لالٹین کی روشنی کی مدد شامل حال رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''باقی سمجھنے سمجھانے کے معاملات ہم ادھر کمرے میں جا کر بھی طے کر سکتے ہیں۔ ادھر کھڑے رہ کر بارش میں بھیگنا سراسر حماقت ہوگی۔''

اس شخص کے فوری طبّی معائنے سے میں نے یہ یقین کر لیا تھا کہ وہ زندہ تھا اور اس کی زندگی کو کوئی بڑا خطرہ لاحق نہیں تھا۔ میں نے خیر دین کے ہاتھ سے لالٹین لے لی پھر میری ہدایت پر ان دونوں نے باہمی تعاون سے اس بے ہوش شخص کو گورکن کے کمرے میں پہنچا دیا۔

میں نے گورکن سے پوچھا۔ ''کیا تم اس بہروپیے کو جانتے ہو؟''

اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بولا۔ ''میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا ہے اور مجھے پورا یقین ہے یہ بخت نگر کا رہنے والا نہیں۔ یہاں کے تو میں بندے بندے سے واقف ہوں۔''

''ملک صاحب! اگر ہم اس بدبخت کو ہوش میں لے آئیں تو یہ خود اپنی زبان سے سب کچھ بک دے گا۔'' حوالدار نے مشورتاً کہا۔ ''پھر اس کی شناخت کوئی مسئلہ نہیں رہے گی۔''

''تم پہلے اسے آہنی زیور پہناؤ۔'' میں نے حوالدار کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کہیں ہوش میں آنے کے بعد پھر اس کے ذہن میں مہم جوئی یا فرار کا خیال نہ پیدا ہو جائے۔ یہ پہلے بھی ایسی ایک کوشش کر چکا ہے اور جہاں تک اسے ہوش میں لانے کا تعلق ہے تو خیر دین کے کمرے میں اس کا مکمل بندوبست موجود ہے۔''

بات ختم کرتے ہی میں نے کمرے کے ایک کونے میں موجود دھونی کے اس ماخذ کی جانب اشارہ کیا جہاں سے مچھروں کو بھگانے والا دھواں اٹھ رہا تھا۔

حوالدار نے میری ہدایت پر مذکورہ شخص کو الٹی ہتھ کڑی لگائی پھر خیر دین کی مدد سے اسے ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے کسیلے دھوئیں کے ماخذ کے قریب پٹخ دیا۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد اس نے کسمساتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے ساتھ ہی اسے شدید نوعیت کی کھانسی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کڑوا دھواں بھاری مقدار میں اس کے پھیپھڑوں میں سرایت کر گیا تھا جس کے سبب وہ کھانسی اٹھی تھی۔

چند لمحات میں وہ کھانستے کھانستے پوری طرح ہوش میں آ گیا۔ میرے اشارے پر ان دونوں نے اسے اٹھایا اور کھڑکی والی دیوار کے قریب فرش پر ڈال دیا۔ میں لالٹین لے کر اس کے قریب بیٹھ گیا اور سخت لہجے میں استفسار کیا۔

''کون ہو تم؟''

وہ چند لمحات تک اجنبی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔ ''میں کون ہوں؟''

PDF LIBRARY 0333-7412793

”تھوڑی دیر پہلے تم ایک برقع پوش، پردہ نشین عورت تھیں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے زہرخند لہجے میں کہا۔ ”پھر تم ٹھوکر کھا کر گریں، بے ہوش ہوئیں اور عورت سے مرد بن گئیں۔ اب تم مرد ہو اور ہوش میں آ چکے ہو۔ تم مجھے ...... اپنے علاقے کے تھانے دار کو بتاؤ گے کہ تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو اور وہاں وزیراں کی قبر کے پاس کھڑے کیا کر رہے تھے؟ صرف آج ہی نہیں بلکہ پچھلے ایک ہفتے سے تمہارا یہی وطیرہ ہے۔“

اس کے چہرے پر فکر کے سائے لہرائے اور وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ”تھانہ انچارج، برقع پوش، مرد، عورت، ٹھوکر، ہوش، بے ہوش ...... پتہ نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامنے کی کوشش کی لیکن الٹی ہتھ کڑی نے اس کی ابتدائی کوشش کو ابتدائی مرحلے پر ہی ناکام بنا دیا اور وہ سٹپٹا کر رہ گیا۔

حوالدار فیض محمد نے کہا۔ ”ملک صاحب! یہ کم بخت یادداشت کھونے کا بہانہ کر رہا ہے۔“

”کرنے دو ...... ہمارے پاس ایسے تمام بہانوں کا علاج موجود ہے۔“ میں نے سپفا کی سے کہا۔ ”ہم اسے اپنے ساتھ تھانے لے کر جا رہے ہیں۔ ان شاء اللہ ایک آدھ گھنٹے کے ٹریٹمنٹ سے اسے شافی فائدہ ہو گا۔“

زیر حراست اس شخص نے ہراساں نظر سے مجھے دیکھا لیکن یادداشت کی گمشدگی کا تسلسل قائم رکھتے ہوئے ڈرامہ جاری رکھا۔ ”پتہ نہیں، میں کون ہوں ...... کہاں ہوں اور آپ لوگ کون ہیں، مجھ سے اس قسم کے سوالات کیوں کر رہے ہیں۔ آپ لوگ میرے ساتھ بہت برا سلوک کر رہے ہیں۔“

”تم نے برے سلوک کا نام سنا ہے لیکن دیکھا نہیں ہو گا۔“ میں نے زہریلے انداز میں کہا۔ ”میں تمہیں دیکھنے کا موقع فراہم کروں گا۔ دیکھنا کیسے پلک جھپکتے میں تمہاری گمشدہ یادداشت واپس آتی ہے۔ تم دنیا کے وہ باخبر شخص بن جاؤ گے جو بڑے دعوے سے بتا سکے گا کہ پہلے انڈا پیدا ہوا تھا یا مرغی۔“

وہ خاموش رہ کر ناقابل فہم نظر سے مجھے تکتا چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے گورکن کے تعاون سے اسے تھانے پہنچا دیا۔ برستی بارش میں ہم سب کی حالت بھیگے مرغوں جیسی ہو گئی تھی۔ خیر دین واپس چلا گیا تو میں نے حوالدار سے کہا۔

”یہ بندہ اب تمہارے حوالے ہے۔ میں اپنے کوارٹر میں جا رہا ہوں۔ اگر تم اس کی

زبان پر پڑا قفل کھولنے میں کامیاب ہو جاؤ تو مجھے جگا دینا، ورنہ صبح ملاقات ہو گی۔“

اس وقت رات کے تین بج رہے تھے اور مجھے شدید نیند آ رہی تھی۔ برقع کی آڑ میں سات روز تک گورکن کو دہشت زدہ کرنے والا ہماری گرفت میں آ چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی زبان کھلوانے کے لئے حوالدار کو زیادہ محنت نہیں کرنا پڑے گی۔

میری بات کے جواب میں فیض محمد نے کہا۔ ”ملک صاحب! آپ اس بندے کی طرف سے بالکل بے فکر ہو جائیں اور سکون سے اپنی نیند پوری کریں۔ آپ کی دعا سے میں اس کی یادداشت کو واپس لانے کے لئے الٹا چرخہ گھمانے والا عمل کروں گا۔ آپ جب صبح تیار ہو کر اپنی کرسی پر بیٹھیں گے تو میں آپ کے حسب منشا رپورٹ پیش کروں گا۔“

میں مطمئن ہو کر اپنے کوارٹر کی جانب بڑھ گیا جو تھانے سے ملحق عقبی جانب واقع تھا۔ اگرچہ پچھلے دو تین گھنٹے ایک عجیب و غریب کارروائی میں گزرے تھے تاہم بستر پر پہنچتے ہی مجھے فوراً نیند آ گئی۔ میں گزشتہ رات کار سرکار کے سلسلے میں ٹھیک طرح سو نہیں پایا تھا لہٰذا نیند تو میری آنکھوں میں رچی بسی تھی۔ اس پر آج کی برساتی کارروائی نے اس نیند میں شدت کا بگھار لگا دیا تھا۔ پھر دوسری صبح ہی میری آنکھ کھلی۔

حوالدار نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ اگلے روز میں اپنے کمرے میں پہنچا تو اس نے بڑی خوش آئند رپورٹ پیش کی۔ وہ زیر حراست بندے کی کھوپڑی پر دستک دے کر اس کی یادداشت کو واپس لا چکا تھا۔ وہ میرے کمرے میں آیا اور مسرور کن لہجے میں بولا۔

”ملک صاحب! میں نے بندے کی بولتی کھول دی ہے۔ اس کا نام سلیم ہے اور وہ موضع نجیب پورہ کا رہنے والا ہے۔ وہی گاؤں جو ادھر نہر کی دوسری طرف واقع ہے۔ سلیم نے وہ ٹوپی برقع والا سارا ڈراما کسی سائیں جی کی ہدایت پر کیا ہے۔ بتا رہا ہے، سائیں جی نے اسے ایک خاص وظیفہ کرنے کو کہا تھا جو کسی تازہ تازہ بننے والی قبر کی پائنتی کھڑے ہو کر کیا جاتا ہے۔“ وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بولا۔ ”ٹھہریں ...... میں اسے آپ کے پاس لے کر آتا ہوں۔ باقی باتیں آپ اس سے خود ہی پوچھ لیں۔“

میں نے پُر معنی انداز میں استفسار کیا۔ ”فیض محمد! اس کی زبان کھلوانے کے لئے تم نے کہیں زیادہ ”محنت“ تو نہیں کی؟“

”نہیں ملک صاحب!“ وہ میری بات کی تہہ میں اترتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ ”اس بڑھاپے میں مجھ سے اب محنت کب ہوتی ہے۔“

فیض محمد ایک ادھیڑ عمر شخص تھا لیکن حسب موقع وہ اپنی عمر کو گھٹاتا بڑھاتا رہتا تھا۔ جب

PDF LIBRARY 0333-7412793

خود کو بہت زیادہ چاق و چوبند ظاہر کرنا ہوتا تو کہتا، ابھی تو میں جوان ہوں۔ اور جب کسی طرف سے آنکھ چرانا ہوتی تو معصوم سی صورت بنا کر کہہ دیتا، اب اس بڑھاپے میں، میں کیا کروں گا۔ جیسا کہ اس نے ابھی کہا تھا!

تھوڑی دیر بعد حوالدار فیض محمد، سلیم نامی اس شخص کو لے کر میرے کمرے میں آ گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر ایک نظر میں مجھے اندازہ ہو گیا، حوالدار نے اپنے ''بڑھاپے'' میں بھی اچھی خاصی ''محنت'' کر ڈالی تھی۔ فیض محمد اسے میرے پاس چھوڑ کر چلا گیا تو میں نے سلیم سے کہا۔ ''آرام سے ادھر کرسی پر بیٹھ جاؤ۔'' اس کے ساتھ ہی میز کے سامنے رکھی کرسیوں کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔

تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد وہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا پھر مریل سی آواز میں بولا۔ ''تھانے دار جی! آپ تو بہت اچھے ہیں۔'' پھر اس نے گردن گھما کر کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا اور شکایتی لہجے میں کہا۔ ''آپ کے حوالدار نے میرے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ وہ بڑا ظالم آدمی ہے جی!''

''میں حوالدار سے بھی زیادہ ظالم ہوں۔'' میں نے اس کے چہرے پر نظر گاڑتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ ''اگر تم نے میرے سوالات کے جواب میں کوئی گڑبڑ کرنا چاہی تو میں تمہارے ساتھ جو زیادتی کروں گا اس کا احوال سنانے کی تم ہمت نہیں کر سکو گے۔''

وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ ''جناب! میں کوئی گڑبڑ نہیں کروں گا۔ جب ساری بات کھل ہی گئی ہے تو پھر کچھ چھپانے کا کیا فائدہ۔ میری قسمت ہی خراب ہے، ہر کام بنتے بنتے بگڑ جاتا ہے۔ اگر آج کا سورج طلوع ہونے سے پہلے میں اپنے گھر پہنچ جاتا تو میرا کام بن جاتا لیکن......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑا اور افسوس ناک انداز میں گردن جھٹکنے لگا۔

میں چند لمحے بہ غور اس کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ عام سی شکل و صورت کا مالک ایک پچیس چھبیس سالہ شخص تھا لیکن اس وقت وہ نا امیدی اور مایوسی کے تنگ حلقے میں جکڑا نظر آتا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''مجھے پتہ چلا ہے تم ادھر قبرستان میں کوئی خاص قسم کا عمل کر رہے تھے؟''

''جی ہاں!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''کل اس عمل کی آخری رات تھی۔ اگر میں رات کے اندھیرے ہی میں واپس اپنے گھر پہنچ جاتا تو میرا مسئلہ حل ہو جاتا۔ مگر

پہلے تو بارش نے گڑبڑ کی اور پھر بعد میں آپ لوگوں نے تو میرا کباڑا ہی کر دیا۔'' وہ ایک مرتبہ پھر بڑی مایوسی سے گردن ہلانے لگا۔

''تم اپنا کون سا مسئلہ حل کرنے کے لئے وہ عمل کر رہے تھے؟'' میں نے کڑے لہجے میں استفسار کیا۔ ''اور اس نوعیت کا بے ہودہ عمل تمہیں کس نے بتایا تھا جس کے لئے شٹل کاک برقع پہن کر ہفتے بھر کے لئے آدھی رات کے بعد ایک عورت کے بھیس میں کسی ویران اور سنسان قبرستان میں وقت گزارنا پڑے؟''

وہ تھوڑے تامل کے بعد گویا ہوا۔ ''تھانے دار صاحب! ایک ہفتے کا یہ وظیفہ مجھے سائیں جی نے بتایا تھا۔ اور برقع والا مشورہ بھی انہی کا تھا۔ انہوں نے کہا تھا، یہ بہت ضروری ہے۔ میں نے ان کی ہدایت پر پورا پورا عمل کیا۔ انہوں نے مجھے تاکید کی تھی کہ قبرستان میں داخل ہونے کے بعد میں کسی سے کوئی بات نہیں کروں گا، اسی طرح عمل کے بعد جب تک میں قبرستان سے باہر نہ آ جاؤں، زبان سے ایک لفظ ادا نہیں کروں گا۔ برقع کا استعمال بھی قبرستان کی حدود کے اندر ہی کروں گا۔ چنانچہ......'' وہ سانس لینے کو متوقف ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''میں گھر سے برقع ساتھ لے کر نکلتا اور قبرستان میں داخل ہونے سے پہلے اسے پہن لیتا۔ اسی طرح قبرستان سے باہر نکلنے کے بعد میں برقع اتار دیا کرتا تھا۔ میں سائیں جی کی ہدایت کے مطابق وہ عمل بڑے ٹھیک ٹھاک طریقے سے کر رہا تھا۔ انہوں نے مجھے چند الفاظ بتائے تھے جو قبرستان میں کسی تازہ تازہ دفن ہونے والے مردے کی پائنتی کھڑے ہو کر مجھے پڑھنا تھے۔ وظیفہ مکمل ہوتے ہی میرا کام بھی ہو جاتا۔ میں نے اپنے حصے کی ذمے داری نبھا دی تھی۔ بس سورج طلوع ہونے سے پہلے مجھے اپنے گھر پہنچنا تھا...... اور یہی نہیں ہو سکا۔''

وہ ایک مرتبہ جھنجلاہٹ آمیز انداز میں خاموش ہوا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے شکایتی انداز میں بولا۔ ''آپ لوگوں نے وظیفے کے آخری مرحلے پر گڑبڑ مچا کر میرے کام کا ستیاناس مار دیا۔ کیا آپ ایک آدھ دن کے لئے رک نہیں سکتے تھے؟''

سلیم کے استفسار میں زمانے بھر کی شکست خوردگی بھری ہوئی تھی۔ اس کی پریشانی اپنی جگہ لیکن میں اپنے کام کے پیش نظر اس سے کوئی رو رعایت کے حق میں نہیں تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے برہمی سے کہا۔

''تم ایک آدھ دن رکنے کی بات کر رہے ہو، ہم تو پہلے ہی دو تین دن لیٹ ہو چکے

PDF LIBRARY 0333-7412793

تھے۔ مجھے اسی رات تمہاری گردن دبوچ لینا چاہئے تھی جب پہلی مرتبہ گورکن نے تھانے آ کر تمہاری شکایت درج کرائی تھی۔ بہرحال ......'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر اسے کھا جانے والی نظر سے گھورتے ہوئے اضافہ کیا۔

''ابھی تو تمہارے کام کا ستیاناس ہوا ہے، اگر تم نے آئندہ پندرہ سیکنڈ کے اندر مجھے اپنے اس کام کی نوعیت نہ بتائی تو میں تمہیں آنے والے چوبیس گھنٹے کے لئے حوالدار فیض محمد کے سپرد کر دوں گا ...... اور پورے اختیارات کے ساتھ۔ پھر وہ تمہارے ساتھ جو سلوک کرے گا اس سے تمہارا سوا ستیاناس ہو جائے گا۔ تم اپنے رہو گے اور نہ ہی اپنے کام کے!''

میری دھمکی کا اس پر خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ ایک جھرجھری لے کر رہ گیا۔ یہ جھرجھری اس شاندار سلوک کی یاد میں تھی جو گزشتہ رات کے آخری پہر حوالدار نے اس کے ساتھ روا رکھا تھا۔ وہ جھرجھری کے اختتام پر سراسیمہ لہجے میں بولا۔

''خدا کے واسطے مجھے اس جلاد کے حوالے نہ کریں ...... آپ جو پوچھیں گے میں بتانے کو تیار ہوں۔''

حوالدار کی دہشت نے اس کے دل و دماغ کو اپنی جکڑ میں لے رکھا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نے تم سے جو سوال پوچھا تھا، ابھی تک مجھے اس کا جواب نہیں ملا۔ تمہاری آسانی کے لئے میں ایک مرتبہ پھر تم سے پوچھتا ہوں کہ تم اپنا کون سا مقصد حاصل کرنے کے لئے ان وظیفوں وغیرہ کے چکر میں پڑے ہو؟''

''وہ جی ...... یہ ساری گڑبڑ بشریٰ کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔'' وہ نگاہ چراتے ہوئے بولا۔ ''میں اسے اپنے قابو میں کرنا چاہتا ہوں۔''

میں نے چونک کر اسے دیکھا اور پوچھا۔ ''یہ بشریٰ کون ہے؟''

اس کی کہانی اب کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگی تھی۔ مگر سلیم کے جواب نے میرے اندازے پر خط تنسیخ کھینچ دیا۔ اس نے نہایت ہی گہری سنجیدگی سے بتایا۔

''بشریٰ میری بیوی ہے جناب!''

''کیا......؟'' میں تقریباً اچھل کر رہ گیا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں جناب۔'' اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا۔

''کیا تم اپنی ...... خود اپنی بیوی کو قابو کرنے کے عملیات وغیرہ کا سہارا لے رہے ہو؟'' میں نے تعجب خیز انداز میں استفسار کیا۔

وہ سادگی سے بولا۔ ''سائیں جی نے مجھے یقین دلایا تھا اگر میں ان کی ہدایت کے مطابق ایک ہفتے کا عمل پورا کرلوں گا تو بشریٰ میرے پاؤں کی دھول بن جائے گی۔ پھر وہ میرے سامنے اکڑ نہیں دکھائے گی، ایک کنیز کی طرح میری ہر قسم کی خدمت میں لگی رہے گی۔ میرے ہر مطالبے پر گردن جھکا دے گی۔''

''تو تم اپنی بیوی کو کوئی زر خرید لونڈی بنا کر رکھنا چاہتے ہو؟'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔ ''اور وہ بھی الٹے سیدھے وظائف کے ذریعے۔''

وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''تھانے دار جی! آپ میری بیوی کو نہیں جانتے۔ وہ مجھے کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ ہماری شادی کو ایک سال ہونے والا ہے اور آج تک اس نے مجھے ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ میں قریب جاتا ہوں تو وہ شور مچاتی ہے۔ میں اپنی عزت کے ڈر سے پیچھے ہٹ جاتا ہوں۔ لوگ سنیں گے تو پوچھیں گے ہمارے گھر سے شور کیوں اٹھا؟ میں انہیں کیا جواب دوں گا؟'' وہ چند لمحات کے لئے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''میں نے سائیں جی کو اپنے مسئلے کے بارے میں بتایا تو انہوں نے کہا بشریٰ پر کسی ہوائی مخلوق کا سایہ ہے۔ جب تک وہ سایہ اس کی جان نہیں چھوڑے گا، یہ تمہیں قریب بھی نہیں پھٹکنے دے گی۔ وہ تو اس کی مہربانی ہے کہ شور مچا کر تمہیں دور کر دیتی ہے ورنہ اگر کبھی زبردستی تم اسے چھونے میں کامیاب ہو گئے تو وہ نادیدہ مخلوق تمہیں ختم کر دے گی۔ میں نے پریشانی کے عالم میں سائیں جی سے پوچھا کہ اس مسئلے کا حل کیا ہے؟ انہوں نے کافی دیر سوچنے کے بعد کہا کہ اس مسئلے کے صرف دو ہی حل ہیں۔ نمبر ایک بشریٰ سے دست بردار ہو جاؤ۔ اسے طلاق دے دو یا پھر اپنے ساتھ اس طرح رکھو کہ کبھی اسے چھونے کی غلطی نہ کرنا۔ تم دو اچھے بہن بھائیوں کی طرح زندگی گزارو گے۔ سائیں جی کی یہ بات سن کر میں تڑپ اٹھا اور احتجاجی لہجے میں کہا، یہ کیسے ممکن ہے جناب! بشریٰ میری بیوی ہے۔ میں اسے بہن کیسے سمجھ لوں؟ اس کے وجود پر میرا پورا پورا حق ہے۔ ایک شوہر ہونے کی حیثیت سے میں اسے چھو بھی سکتا ہوں اور اس کے ساتھ ازدواجی تعلقات بھی قائم کرنے کا حق رکھتا ہوں۔ میں اس سے کیسے دست بردار ہو جاؤں؟ سائیں جی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا، بس تو پھر تم اس نادیدہ سائے سے اپنی گردن تڑوانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ میں محسوس کر رہا ہوں، تم بشریٰ کی طرف پیش قدمی سے باز نہیں آؤ گے۔ تم بھی کیا کرو، تمہاری بیوی چیز ہی ایسی ہے کہ راہ چلتے کی رال ٹپک جائے۔ بلاشبہ تم خوش قسمت بھی ہو اور بدبخت بھی۔ بشریٰ جیسی حسین اور شاداب عورت تمہاری منکوحہ ہے لیکن تم اس پر اپنا

PDF LIBRARY 0333-7412793

جائز حق نہیں جتا سکتے۔ اگر ایسا کرو گے تو جان سے جاؤ گے۔

میں نے سائیں جی کی بات سنی اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں اور بشریٰ کے ساتھ میاں بیوی والی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ میرے مسئلے کا آپ نے جو پہلے حل بتایا ہے وہ میرے لئے قابل قبول نہیں۔ دوسرا حل آپ کے نزدیک کیا ہے؟ سائیں جی نے ایک طویل سانس کھینچی اور بولے۔ علاج...... تمہارا موجودہ مسئلہ علاج سے بھی حل ہوسکتا ہے۔ میں تمہارے لئے علاج تجویز کروں گا۔ تمہیں میری ہدایت پر عمل کرنا ہوگا۔

میں نے کہا، علاج میں دیر نہ کریں سائیں جی۔ انہوں نے کہا، دیر کس بات کی۔ تم کل ہی سے وظیفہ شروع کردو۔ پھر میں نے ان کی ہدایت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس قبرستان میں آنا شروع کردیا۔ میرا ظیفہ مکمل ہو چکا تھا۔ بس آپ لوگوں نے میرے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ اگر آج صبح میں اپنے گھر میں ہوتا تو پھر بشریٰ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری ہو جاتی۔ وہ خبیث سایہ اس کی جان چھوڑ دیتا۔ مجھے رات کی تاریکی ہی میں اپنے گھر پہنچنا تھا مگر......"

جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ شکایتی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں سمجھ گیا، سائیں نے اسے بے وقوف بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ میں نے طنزیہ لہجے میں سلیم سے پوچھا۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ مسئلہ تو تمہاری بیوی کے ساتھ تھا اور علاج تمہارا ہوا...... یہ کس قسم کا علاج تھا؟ تم نے بتایا ہے نا، یہ وظیفہ تمہارے علاج کے طور پر تجویز کیا گیا تھا؟"

"سائیں جی نے کہا تھا، میرے وظیفے سے بشریٰ ٹھیک ہو جائے گی۔" وہ کمزور آواز میں بولا۔ "اگر پھر بھی کوئی کسر باقی رہ گئی تو پھر وہ اس کا علاج کریں گے۔"

میں سلیم کی سادگی نما حماقت پر تلملا کر رہ گیا اور بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

"میرا خیال ہے تمہارے اس سائیں جی نے اس وظیفے کے نتائج کا انتظار نہیں کیا اور وہ مکار شخص تمہاری بے خبری میں بشریٰ کا علاج بھی کر رہا ہے!"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب؟" وہ متذبذب نظر سے مجھے تکنے لگا۔

مجھے خود بھی اپنے کہے پر قدرے حیرت ہوئی۔ وہ الفاظ بے ساختہ میری زبان سے ادا ہوئے تھے۔ میں نے قدرے سنبھلتے ہوئے اس سے پوچھا۔ "سلیم! تمہارا یہ سائیں جی کہاں رہتا ہے؟"

"ہمارے گاؤں نجیب پورہ ہی میں رہتے ہیں وہ۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا نجیب پورہ میں کوئی قبرستان نہیں؟"

"ہے جی!" وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ "پھر تم اس خرافات کے لئے اس قبرستان میں کیوں نہیں گئے؟"

"سائیں جی نے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ میں بخت نگر والے قبرستان میں۔ وزیراں چاچی والی قبر پر کھڑے ہو کر وہ وظیفہ پڑھوں۔ میں نے بڑی مشکل سے وہ قبر تلاش کی تھی لیکن آپ نے میرا کام بگاڑ دیا۔"

"اوئے کام بگاڑ کی اولاد!" اس کی فضول تکرار سن کر مجھے غصہ آ گیا۔ "تم روزانہ آدھی رات کو گھر سے نکلتے ہو۔ کیا تمہارے گھر والے اس بات پر اعتراض نہیں کرتے؟"

"میرے گھر میں ہے کون جو میرے کہیں آنے جانے پر اعتراض کرے گا۔" وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔

"ایک بشریٰ ہی تو ہے...... اور اسے مجھ سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔"

"کیا تم اپنی بیوی کے ساتھ پورے گھر میں اکیلے رہتے ہو؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "میرا مطلب ہے تم دونوں کے سوا اس گھر میں اور کوئی بھی نہیں؟"

"جی...... ہم دونوں ہی اس گھر میں رہتے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"یہ تو اور بھی تشویش کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "میرے خیال میں نجیب پورہ سے بخت نگر کے قبرستان تک پہنچنے میں تمہیں کم از کم آدھا گھنٹہ تو لگتا ہی ہوگا۔ کم وبیش اتنا ہی وقت واپسی میں بھی صرف ہوتا ہوگا۔ لگ بھگ آدھا گھنٹہ وزیراں چاچی کی قبر کی پائنتی کھڑے وظیفہ پڑھتے رہتے ہو۔ اس طرح تمہارے گھر سے غائب رہنے کا کل وقت تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ بن جاتا ہے اور...... یہ ڈیڑھ گھنٹہ بھی آدھی رات کے بعد کا! تمہاری اس غیر حاضری سے بشریٰ کو اکیلے گھر میں ڈر نہیں لگتا؟"

"ڈر کس بات کا جی!" وہ عجیب سے انداز میں بولا۔ "سائیں جی ہمارے پڑوس ہی میں تو رہتے ہیں۔ پھر انہوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ بشریٰ کو کچھ نہیں ہوگا۔" وہ لمحے بھر کو رکا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگا۔

"سائیں جی کا کہا ہوا ایک ایک لفظ بالکل درست ثابت ہوا۔ واقعی بشریٰ نے ایک بھی دن میری غیر حاضری پر کوئی اعتراض کیا اور نہ ہی واپسی پر کسی ڈر خوف کی شکایت کی۔"

میں تصور میں اس کی بے وقوفی پر سر پیٹ کر رہ گیا اور کہا۔ "تم بشریٰ کی بے خوفی اور اعتراض نہ کرنے کو سائیں جی کا کوئی کمال سمجھ رہے ہو؟"

PDF LIBRARY 0333-7412793

''اس میں کیا شک ہے جناب!''

''تم زبردست دھوکا کھا رہے ہو احمق انسان!'' میں نے غصیلے انداز میں کہا۔

وہ بولا۔ ''میں محسوس کر رہا ہوں آپ سائیں جی کی نیت پر شک کر رہے ہیں۔''

''تم بالکل صحیح محسوس کر رہے ہو۔'' میں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھ سے کہا تھا...... آپ میری بیوی کو نہیں جانتے! تم نے بالکل ٹھیک کہا تھا سلیم۔ میں تمہاری بیوی کو جانتا ہوں اور نہ ہی تم اپنی بیوی کو جانتے ہو بلکہ بشریٰ کو اگر کوئی صحیح طور پر جانتا ہے تو وہ ہے تمہارا سائیں جی اور ...... اور میں اس سائیں کے بچے کو بڑی اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔''

''سائیں جی جلالی بابا ہیں۔'' وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ ان کے لئے ایسے الفاظ استعمال نہ کریں ورنہ نقصان اٹھائیں گے۔''

میں نے اس کے کانوں کے کیڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ایسے فراڈ اور ہوس پرست سائیں بہت دیکھے ہیں۔ تم فکر نہ کرو، میں تمہارے سائیں جی کا سارا جلال اس کی ناک کے راستے نکال دوں گا۔''

''توبہ، توبہ!'' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے کانوں کو چھوتے ہوئے بولا۔ ''تھانے دار جی! آپ بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں۔ آپ سائیں جی کی طاقت سے واقف نہیں ہیں۔''

''میں اس کی طاقت سے واقف ہونے جا رہا ہوں۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''اور اس دوران میں تم میرے تھانے کی حوالات میں رہو گے۔''

وہ احتجاجی لہجے میں بولا۔ ''جناب! یہ تو میرے ساتھ ظلم ہوگا ...... زیادتی ہوگی......!''

''فی الحال تم اسی سلوک کے قابل ہو۔'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''جو شخص اندھی عقیدت میں آدھی رات کو اپنی بیوی کو کسی پیر سائیں کے رحم و کرم پر چھوڑ آئے اس کے ساتھ بار بار زیادتی ہونی چاہئے۔ پتہ نہیں تم کیسے بے غیرت اور بودے مرد ہو؟''

وہ بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تھانے دار جی! آپ سائیں جی کے کردار پر کیچڑ اچھال رہے ہیں۔ بعد میں جب آپ کو ان کی شان کا پتہ چلے گا تو آپ بہت پچھتائیں گے۔ اب بھی وقت ہے اگر آپ اپنے دل میں سائیں جی کے خلاف کسی کارروائی کا خیال رکھتے ہیں تو اس خیال کو جھٹک دیں۔''

''تم یہ مشورے اپنے ہی جیسے کسی عقل کے اندھے اور کردار کے گندے شخص کو دینا۔'' میں نے کہا۔ ''میں تمہاری دھمکیوں سے خوف زدہ ہونے والا نہیں۔ تمہاری کہانی سے مجھے

اندازہ ہو گیا ہے کہ تمہارا وہ سائیں کتنے پانی میں ہے ...... اور بشریٰ کس سائے کے ''تسلط'' میں تمہارے ساتھ کون سا کھیل، کھیل رہی ہے۔''

وہ بے بسی سے مجھے گھور کر رہ گیا۔ اس کا بس چلتا تو شاید اپنے سائیں جی کی اندھی عقیدت میں مجھے قتل کر دیتا۔ میں چند لمحات تک جائزہ نظر سے اسے گھورتا رہا پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میری بات دھیان سے سنو سلیم! تمہاری بیوی پر کسی قسم کا کوئی سایہ وغیرہ نہیں ہے۔ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے، بشریٰ اور سائیں کی ملی بھگت کا نتیجہ ہے۔ بیوی کو قابو کرنے کا سب سے بڑا وظیفہ اس کا شوہر ہوتا ہے۔ جو لوگ اس مقصد کے حصول کے لئے قبرستانوں میں جا کر چلّہ وظیفہ کرتے ہیں ان کی بیویاں عامل کامل جلالی باباؤں اور نام نہاد معالجوں کے ہاتھوں کا کھلونا بن جاتی ہیں۔ یہ لوگ کسی سائے، کسی نادیدہ ہوائی مخلوق اور کسی عفریت کے مانند بے وقوف شوہروں کی بیویوں کو اپنی جھوٹی قوتوں کا راگ سنا کر اس طرح فریب دیتے ہیں کہ وہ کہیں کی نہیں رہتیں اور اس میں قصور سراسر شوہروں کا ہوتا ہے کہ شوہر بیوی کا ذمے دار ہوتا ہے ...... یہی ذمے دار شخص خود ان ڈبا پیروں کو اپنے گھر کی راہ دکھاتا ہے جیسا کہ تم کر رہے ہو۔''

میری بات ختم ہوئی تو سلیم نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ پھر بے حد الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''پتہ نہیں آپ کس قسم کی عجیب و غریب باتیں کر رہے ہیں؟''

''سب پتہ چل جائے گا بچّو!'' میں نے تنبیہی انداز میں کہا۔ ''میں تمہارے سائیں کی خیر خیریت معلوم کرنے جا رہا ہوں۔ ذرا پتہ تو چلے وہ کیسی کیسی اور کتنی قوتوں کا مالک ہے۔ تمہیں ایک واہیات وظیفے میں الجھا کر وہ ادھر نجیب پورہ میں کیا گل کھلا رہا ہے؟''

''میں ایک مرتبہ پھر یہی کہوں گا......''

سلیم نے اپنے سائیں جی کی صفائی میں کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے دبکا مار کر اسے خاموش کرا دیا۔ ''نہ ایک مرتبہ ...... نہ دو مرتبہ ...... اور نہ تین مرتبہ!'' میں نے کڑک کر خالص تھانے دارانہ انداز میں کہا۔ ''تمہیں جو کچھ بھی کہنا ہے میری واپسی پر کہنا۔ عین ممکن ہے، میں تمہارے پیر سائیں کو بھی ادھر ہی لے آؤں۔''

پھر میں نے سلیم کو حوالدار فیض محمد کے سپرد کیا اور اے ایس آئی جاوید مغل کو اپنے کمرے میں بلا کر نجیب پورہ جانے کی تیاری کا حکم دیا۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد میں جاوید مغل کے ساتھ ایک تانگے میں بیٹھا نجیب پورہ کی طرف جا رہا تھا۔

PDF LIBRARY 0333-7412793

سلیم نے مجھے جو کہانی سنائی تھی اس میں میرے لئے چونکنے والے دو اہم نکات تھے۔ اول بشریٰ کا آدھی رات کو سلیم کی گھر سے غیر حاضری پر اعتراض نہ کرنا! دوئم، سائیں کا بیوی کو قابو کرنے کے لئے سلیم کو مشورہ ...... اور مشورہ بھی ایسے وظیفے کا جو دور دراز قبرستان میں پڑھا جائے تاکہ سلیم زیادہ سے زیادہ دیر کے لئے گھر سے دور رہ سکے۔ اس مشورے سے سائیں کی نیت کھلتی تھی۔

ہم ٹھیک ساڑھے دس بجے نجیب پورہ میں داخل ہوئے اور سائیں جی کے آستانے تک رسائی حاصل کرنے میں ہمیں کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا۔ مگر وہاں پہنچ کر معلوم ہوا آستانے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ یہ ایک غیر متوقع صورتِ حال تھی۔

جس شخص نے آستانے تک ہماری راہ نمائی کی تھی، میں نے اس سے پوچھا۔ ”یہ سائیں کہاں چلا گیا؟ اس کا آستانہ تو بند پڑا ہے۔“

میں نے محسوس کیا، سائیں کے لئے میرا یہ انداز اس شخص کو قطعی پسند نہیں آیا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات نے مجھے بتا دیا، وہ بھی سلیم کی طرح سائیں کا کوئی اندھا عقیدت مند تھا۔ اندھی عقیدت رنگ بہ رنگ گل کھلاتی ہے۔ بہرحال، بزرگی کا سوانگ بھرنے والے نقلی پیروں کی شخصیت کا ایک اپنا تاثر ہوتا ہے۔ سادہ لوح اور احمق الاحمقین قسم کے لوگ بڑی آسانی سے ان کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں۔ وہ بھی کوئی ایسا ہی بدقسمت تھا!

میں اور اے ایس آئی اس وقت یونیفارم میں تھے لہٰذا اس شخص نے ہمیں سائیں کے جلال سے ڈرانے کی کوشش نہیں کی اور بد دلی سے بولا۔ ”میں سائیں جی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ تالا تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے۔“

سائیں کے آستانے کے برابر میں جو گھر تھا اس کے دروازے پر بھی مجھے تالا دکھائی دیا تو میں نے اس شخص سے پوچھ لیا۔ ”یہاں کون رہتا ہے؟“

”یہ سلیم کا گھر ہے جی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”دونوں میاں بیوی ادھر رہتے ہیں۔“

اس کے جواب نے مجھے گہری تشویش میں مبتلا کر دیا۔ سلیم کے مطابق وہ اپنی بیوی بشریٰ کو گھر میں اکیلا چھوڑ کر قبرستان گیا تھا۔ وہ خود تو اس وقت میرے تھانے کی حوالات میں بند تھا، پھر بشریٰ کہاں چلی گئی؟ یہ بہت ہی خطرناک سوال تھا ...... اور اس کی خطرناکی اس صورت میں اور بھی بڑھ جاتی تھی کہ پیر فرتوت، نازیبا کرتوت وہ سائیں بھی غائب تھا۔ سلیم کا گھر آستانے سے مشرقی سمت میں واقع تھا۔ پہلو بہ پہلو ان دونوں گھروں کے بیرونی دروازوں پر جھولتے ہوئے تالے ایک ہی کہانی سنا رہے تھے کہ...... سلیم کو اُلو بنانے

والا وہ جلالی بابا اس کی بیوی کو لے اُڑا تھا!

ان سنسنی خیز خیالات کے ہجوم میں، میں نے سلیم کے گھر کی سمت اشارہ کیا اور اس شخص سے پوچھا۔ ”کیا تمہیں یہ بھی معلوم نہیں سلیم کی بیوی بشریٰ کہاں چلی گئی؟“

”اپنے خاوند کے ساتھ ہی گئی ہو گی جناب!“

میں نے اسے حالات کی حقیقت سے آگاہ کرنا ضروری نہ سمجھا اور اِدھر اُدھر دوسرے لوگوں سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔ آدھے گھنٹے کی تفتیش و تحقیق کے بعد یہی پتہ چلا کہ گزشتہ شام تک وہ تینوں کردار نجیب پورہ ہی میں موجود تھے۔

پولیس جس گاؤں دیہات میں پہنچتی ہے، وہاں سنسنی پھیل جاتی ہے۔ نجیب پورہ کے باسیوں کو بھی تشویش تھی کہ ہماری آمد کا مقصد کیا ہے۔ ایک سراسیمگی کی سی فضا تھی۔

میں نے ان لوگوں میں شیخ لطیف نامی ایک شخص کو خاصا معقول پایا تو اس سے کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ شیخ لطیف کا گھر آستانے کی مغربی سمت واقع تھا۔ نجیب پورہ کے مین بازار میں اس کی کپڑے کی ایک دکان تھی، شیخ کلاتھ ہاؤس!

میں لطیف کے ساتھ اس کے گھر میں آ بیٹھا اور صورت حال سے اسے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اندازے کے بارے میں بھی بتا دیا۔ اس نے پوری بات توجہ سے سنی اور گہری سنجیدگی سے بولا۔

”ملک صاحب! میں اپنے کام سے کام رکھنے والا ایک سیدھا سادہ آدمی ہوں۔ دکان داری کے بعد جو وقت مل جاتا ہے اس میں حسب توفیق اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یاد کر لیتا ہوں۔ ان پیری مریدی والے معاملات سے مجھے زیادہ دلچسپی نہیں اس لئے سائیں کے بارے میں بھی میں زیادہ نہیں جانتا، البتہ......“ وہ لمحے بھر کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”آپ نے بتایا ہے سلیم اس وقت آپ کی گرفت میں ہے اور اس نے سائیں کے حوالے سے آپ کو جو کہانی سنائی ہے اس کی روشنی میں، میں بھی اس نتیجے پر پہنچا ہوں جو آپ کا اندازہ ہے!

شیخ لطیف بہت ہی نستعلیق اور سلجھا ہوا انسان تھا۔ اس کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔ ”شیخ صاحب! بشریٰ اور سائیں کے بارے میں کیسے کھوج لگایا جائے۔ وہ کہاں گئے ہیں؟ اگر ایک ساتھ نہیں گئے تو پھر غائب کیوں ہیں؟“

وہ چند لمحات کے لئے گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

PDF LIBRARY 0333-7412793

"سائیں کے بارے میں تو حاجی صاحب سے بھی پوچھا جا سکتا ہے۔"

"کون حاجی صاحب؟" میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"حاجی سلیمان۔" اس نے بتایا۔ "جس گھر میں سائیں کا آستانہ ہے وہ حاجی صاحب کی ملکیت ہے۔ سائیں اس کا کرایہ دار ہے۔ ہو سکتا ہے، سائیں نے حاجی صاحب کو کچھ بتایا ہو۔"

اس کا مشورہ مفید ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "حاجی سلیمان کہاں ملے گا؟"

"ادھر بازار میں حاجی صاحب کا کریانہ سٹور ہے۔" شیخ لطیف نے بتایا۔ "وہ سٹور پر ہی ہو گا۔ میں تو جمعہ کے دن دکان بند رکھتا ہوں اس لئے گھر میں موجود ہوں۔"

میں اس کے گھر سے اٹھا اور اسے ساتھ لے کر حاجی سلیمان کے کریانہ سٹور پر پہنچ گیا۔ حاجی سلیمان میانہ قد کا مالک ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس نے اپنے چہرے پر دراز ریش سجا رکھی تھی جو اس کی شخصیت سے بہت لگا کھاتی تھی۔ حاجی کی آنکھوں میں ایک خاص چمک پائی جاتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، اس کی آنکھوں کے اندر دو بلور رکھے ہوں۔

حاجی سلیمان نے ہمارا پُر تپاک استقبال کیا اور جب میں نے اپنی آمد کی غرض و غایت سے اسے آگاہ کیا تو وہ گہری تشویش میں مبتلا ہو گیا۔

"تھانے دار صاحب! یہ تو آپ عجیب بات بتا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے، سائیں جی کسی کام سے گاؤں سے باہر چلے گئے ہوں۔ ویسے انہوں نے اس بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ ابھی کل شام ہی تو میری ان سے بات ہوئی تھی۔" ایک لمحے کو متوقف ہو کر اس نے کہا۔ "ویسے آپ نے سلیم کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، اس کا مجھے یقین نہیں آیا!"

وہ الجھن زدہ انداز میں خاموش ہوا تو میں نے کہا۔

"کیا یقین نہیں آیا؟"

"یہی کہ سائیں جی کا اس کی بیوی سے کوئی تعلق ہو۔" وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ "میں تو سائیں جی کو بہت نیک آدمی سمجھتا ہوں۔"

حاجی سلیمان نے سائیں کا دفاع کیا تو میں نے طنزیہ انداز مین کہا۔ "کوئی نیک آدمی کسی شخص کو اپنی بیوی کو قابو کرنے کے لئے ایسے واہیات قبرستانی دھندوں میں نہیں ڈالتا۔ میں اس سائیں کو بڑی حد تک سمجھ گیا ہوں۔ وہ ہتھے چڑھے تو میں اس کے اندر سے سارے راز اُگلوا لوں گا۔"

حاجی سلیمان کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے، جیسے میں نے اسے کوئی جھوٹی

کہانی سنا دی ہو۔ وہ سائیں کو کوئی بہت ہی پہنچی ہوئی ہستی سمجھ رہا تھا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے گمبھیر آواز میں کہا۔

"بشریٰ اور سلیم کا کیا معاملہ ہے، اس کا تو مجھے کچھ پتہ نہیں لیکن سائیں جی کو میں ایسا نہیں سمجھتا۔ وہ ایسی حرکت نہیں کر سکتے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے بشریٰ سلیم کو بتائے بغیر کہیں چلی گئی ہو۔"

"مجھے آپ کی بات سے پورا اتفاق ہے حاجی صاحب!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہ سلیم کو بتائے بغیر ہی کہیں گئی ہے۔ سلیم بے چارہ تو اپنی بے وقوفی میں ادھر قبرستان کے اندر کھڑا اسے قابو کرنے کے لئے وظیفہ پڑھ رہا تھا اور اس وقت حوالات کے فرش پر بیٹھا اپنی حماقت کے بارے میں سوچ رہا ہو گا۔ اسے تو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کہ یہاں کیا قیامت برپا ہو چکی ہے۔ وہ بدبخت تو یہی سمجھ رہا ہو گا، بشریٰ گھر میں بیٹھی اس کے واپس نہ آنے پر پریشان ہو رہی ہو گی۔ اس کے تو تصور میں بھی نہیں ہو گا، اس کے مرشد سائیں نے کون سا ہاتھ دکھا دیا ہے۔"

حاجی سلیمان بے اعتباری سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس سے پوچھا۔ "سائیں آپ کو کرایہ تو باقاعدگی سے دے رہا تھا نا؟"

"بس کبھی دے دیتے تھے اور کبھی نہیں۔" وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ "ان کی آمدنی کا کوئی خاص ذریعہ تو تھا نہیں۔ بس کسی نے جو دے دیا، وہ لے لیا۔ اس لئے بھی میں ان پر زیادہ دباؤ نہیں ڈالتا تھا۔ میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ چلو، میں ایک نیک بندے کے کام آ رہا ہوں۔ اس کے صدقے اللہ مجھ پر مہربان ہو گا۔"

"اللہ سب پر مہربان ہے حاجی صاحب!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور اس نے انسان کو عقل و شعور بھی دے رکھا ہے۔ کسی ضرورت مند کی مدد کرنا یقیناً ایک قابل تعریف عمل ہے لیکن اس فعل کو کاروباری انداز میں نہیں لینا چاہئے۔ آپ تو ماشاء اللہ سمجھدار ہیں، مجھ سے زیادہ جانتے ہوں گے کہ گن گن کر نیکیاں کرنا اور اس کا اس طرح حساب رکھنا، گویا آپ نے اللہ پر کوئی قرض چڑھا دیا ہو...... اور گاہے بہ گاہے اس قرض کی واپسی کا "مطالبہ" بھی کرتے رہنا کسی بھی طور درست نہیں۔ وہ ذات پاک تو انسان کی نیت کو سمجھتا ہے اور اجر کے لئے بھی اسی کسوٹی کو استعمال کرتا ہے۔"

وہ میری باتوں سے بہت متاثر ہوا اور دراز ریش پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "آپ

PDF LIBRARY 0333-7412793

PDF LIBRARY
0333-7412793

بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب۔"

میں نے کہا۔"حاجی صاحب! اگر سائیں آج رات تک واپس نہیں آیا اور کہیں سے اس کی یا بشریٰ کی کوئی اطلاع بھی نہیں ملتی تو میں اس کے آستانے کی تلاشی لوں گا اور یہ کام کل صبح آپ کی نگرانی میں ہوگا۔"

"لیکن سائیں جی کے آستانے پر تو تالا پڑا ہوا ہے!" اس نے میری فراہم کردہ اطلاع کی روشنی میں کہا۔ اس کا انداز سوالیہ تھا۔

میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔"ایسے حالات میں تالا توڑا بھی جا سکتا ہے۔ اسی لئے تو میں نے آپ کی موجودگی کی بات کی ہے۔"

وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا اور میں شیخ لطیف کے ساتھ اس کے کریانہ سٹور سے باہر نکل آیا۔ تاہم قبل ازیں میں نے اسے ہدایت کر دی کہ اگر اسے بشریٰ یا سائیں کے بارے میں کوئی بھی خیر خبر معلوم ہو تو وہ فوراً تھانے آ کر مجھے اطلاع دے۔ ایسی ہی تاکید میں نے شیخ لطیف کو بھی کر دی تھی۔

میں مزید ایک گھنٹے تک نجیب پورہ میں مختلف لوگوں سے مل کر پوچھ تاچھ کرتا رہا۔ سائیں، بشریٰ اور سلیم کے سوا گاؤں کے باقی تمام افراد اپنے اپنے گھروں میں یا اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ سلیم کو تو میں حوالات میں چھوڑ آیا تھا۔ ان حالات میں بشریٰ اور سائیں کی پراسرار "گمشدگی" ایک ہی جانب اشارہ کرتی تھی ...... اور یہ وہ اشارہ تھا جو عقل مندوں کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے!

دوپہر کے بعد میں اے ایس آئی جاوید مغل کے ساتھ واپس تھانے آ گیا اور یہاں پہنچتے ہی میں نے سلیم کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ وہ خاصا متفکر اور گھبرایا ہوا تھا۔ میں نے ایک کرسی پر بیٹھنے کو کہا اور پوچھا۔

"کہیں حوالدار فیض محمد نے تمہیں دوبارہ "تنگ" تو نہیں کیا؟"

"نہیں جی۔" وہ سراسیمہ لہجے میں بولا پھر منت کرنے لگا۔"تھانے دار صاحب! آپ نے کل رات میرے عمل کا تو بیڑا غرق کر دیا، اب مجھے گھر تو جانے دیں۔ آخر میرا قصور کیا ہے؟"

سلیم کو تازہ ترین حالات کا علم نہیں تھا اور میں سوچ رہا تھا، جب اسے اپنے پیر سائیں کی حقیقت کا پتہ چلے گا تو اس احمق کی کیا حالت ہو گی۔ اندھی عقیدت اکثر انسان کو اندھے کنوئیں میں لا پھینکتی ہے۔ میں نے ہمدردی بھری نظر سے سلیم کو دیکھا اور کہا۔

"قصور صرف انہی لوگوں کا نہیں جو قصور میں رہتے ہیں۔ یہ قصور سے باہر والوں کا بھی ہو سکتا ہے۔ علاقائی لحاظ سے تم بے شک بے قصور ہو لیکن اعمال کی روشنی میں تم سراسر قصوروار ہو۔ آج تم جس مقام پر کھڑے ہو یہاں تک تمہیں تمہاری نادانی ہی لائی ہے۔"

"جناب! آپ مجھے کسی بھی مقام پر کھڑا نہ کریں اور گھر جانے کی اجازت دے دیں۔" وہ اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔"بشریٰ میرے لئے پریشان ہو رہی ہو گی۔ گھنٹے، دو گھنٹے کی بات تو الگ ہے لیکن اب تو پوری رات گزر گئی اور دن بھی آدھے سے زیادہ بیت گیا۔"

میں نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کرنا ضروری جانا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔"سلیم! تم ایک نمبر کے کھوتے کے پُتر ہو ...... کھوتے کا پُتر بھی چونکہ کھوتا ہی ہوتا ہے اور کچھ نہ کچھ کھوتا رہتا ہے، ایسے ہی تم بھی سمجھ لو، اپنا سب کچھ کھو چکے ہو!"

میری بات نے اسے بری طرح الجھا دیا۔ متذبذب نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔"پتہ نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔"میں یہ کہہ رہا ہوں کہ بشریٰ تمہارے لئے پریشان ہے اور نہ ہی گھر بیٹھی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ اب تمہیں ساری زندگی اس کے لئے پریشان ہونا ہے، اس کا انتظار کرنا ہے۔"

"کیا مطلب جی؟" اس نے عجیب سی نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔"اوئے مطلب کے گھوڑے! تمہارا وہ جلالی بابا، تمہاری بیوی کے ساتھ کہیں فرار ہو گیا ہے۔ تم خواہ مخواہ بشریٰ کو قابو کرنے کے لئے چلّہ وظیفہ کرتے رہے۔ وہ تو اول آخر سائیں کے قبضے میں تھی۔"

ابھی تک مجھے کوئی ایسا ٹھوس ثبوت حاصل نہیں ہوا تھا جس کی بناء پر دعوے سے کہا جا سکتا کہ بشریٰ کو سائیں ہی بھگا لے گیا تھا البتہ واقعاتی شواہد اسی جانب اشارہ کرتے تھے اور میرا تجربہ اس پر دلالت بھی کرتا تھا۔ سائیں جیسے ہوس پرست ڈبا پیروں پر میں نے ڈاکٹریٹ کر رکھا تھا۔ پیشہ ورانہ زندگی میں کئی بار مجھے ایسے کرداروں سے واسطہ پڑا تھا اور میں نے انہیں بہ زور قانون "سیدھی راہ" دکھائی تھی۔ سلیم کا یہ رفو چکر جلالی بابا بھی مجھے اسی نوعیت کا کیس نظر آ رہا تھا۔ سلیم کی زبانی مجھے جو کچھ پتہ چلا تھا، وہ سائیں کی نیت اور کرتوت کو سمجھنے کے لئے کافی تھا۔

میرے انکشاف نے سلیم کو ہلا کر رکھ دیا۔ بکھرے ہوئے لہجے میں اس نے کہا۔"یہ

PDF LIBRARY 0333-7412793

آپ کیا کہہ رہے ہیں ...... یہ نہیں ہوسکتا۔ سائیں جی ایسے تو نہیں......''

''یہ ہو چکا ہے اوئے نا معقول!'' میں نے اس کی عقل پر ماتم کرنے والے انداز میں کہا۔ ''ادھر نجیب پورہ میں تمہارے اور سائیں کے گھر پر تالا پڑا ہوا ہے!''

وہ بے انتہا حیرت اور بے یقینی سے مجھے تکنے لگا۔ اس کی گردن ہولے ہولے نفی میں حرکت کر رہی تھی۔ میں ایسے عقیدت کے اندھے افراد کی نفسیات سے بہ خوبی واقف ہوں۔ یہ بھی ایک طرح سے آئیڈیل ازم کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ جس پر بھروسہ کرتے ہیں، اگر اسے اپنی آنکھوں کے سامنے بھی کوئی غلط کام کرتے دیکھ لیں تو انہیں یقین نہیں آتا، یہ اسے معصوم اور بے خطا جانتے ہوئے اس کے عمل کو اپنی نظر کا دھوکا اور ذہن کا بہکاوا سمجھتے ہیں۔ ایسے افراد کی عقل پر ماتم ہی کیا جا سکتا ہے کیونکہ انہیں سمجھانا ممکن نہیں ہوتا۔ شخصیت پرستی سب سے پہلے انسان کی سوجھ بوجھ چھینتی ہے، پھر اپنی زندگی خود جینے کا ڈھنگ بھی اس کے پاس نہیں رہتا۔ وہ کسی کٹھ پتلی کی مانند کسی اور ہی کے اشاروں پر سانس لے رہا ہوتا ہے۔

میں نے بھی اس حوالے سے سلیم پر زیادہ دباؤ نہ ڈالا اور ایک دوسرے زاویے سے اسے گھیرنے کی کوشش کی۔ ''مجھے تو یہ لگتا ہے کہ تم نے ہی ان دونوں کو کہیں غائب کر دیا ہے۔''

وہ پھٹ پڑا۔ ''میں تو کل رات سے آپ کے رحم و کرم پر ہوں ...... انہیں کیسے غائب کر سکتا ہوں؟''

''اس کا مطلب ہے تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ دونوں باہمی رضامندی سے غائب ہوئے ہیں؟'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے کہا۔ ''شکر ہے، تم مجھ سے متفق تو ہوئے؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''میں کیا کہہ سکتا ہوں جی ...... یہ بات تو آپ ہی نے مجھے بتائی ہے۔ مجھے تو یقین نہیں آ رہا۔''

''اگر میں نے یہ بات بتائی ہے تو تمہیں یقین بھی دلا دوں گا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں تھوڑی دیر بعد تمہیں اپنے ساتھ لے کر نجیب پورہ جاؤں گا۔ پھر تم سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔''

میں نے سلیم کو دوبارہ حوالات میں بھیج دیا۔ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں ایک مرتبہ پھر نجیب پورہ کی طرف جا رہا تھا۔ میرے ساتھ حوالدار فیض محمد اور سلیم

بھی تھا۔ سلیم کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگی ہوئی تھی جس کی زنجیر حوالدار نے تھام رکھی تھی۔

سلیم نے جب اپنے اور سائیں کے دروازے پر تالا جھولتا ہوا دیکھا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ بے یقینی سے کبھی مجھے اور کبھی تالوں کو دیکھنے لگا۔ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''بات سمجھ میں آئی یا کوئی کسر باقی ہے؟''

وہ ہونقوں کی طرح آئیں بائیں شائیں کرنے لگا تو میں نے کڑک کر کہا۔ ''اس تالے کی چابی کہاں ہے؟'' میرا اشارہ سلیم کے گھر والے تالے کی سمت تھا۔

''میرے پاس تو نہیں ہے جی۔'' وہ سہم کر بولا۔

میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''پھر تو تمہارا تالا توڑنا ہوگا!''

آئندہ پندرہ منٹ کے اندر ہم تالا توڑ کر سلیم کے گھر میں داخل ہو چکے تھے۔ ہماری دوبارہ نجیب پورہ میں آمد نے کھلبلی سی مچا دی تھی۔ لطیف شیخ اور چند مزید افراد بھی موقع پر جمع ہو گئے۔ میں نے شیخ لطیف کے سوا کسی کو گھر میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی۔

سلیم کا گھر دو کمروں پر مشتمل تھا۔ کمروں کے آگے چھوٹا سا صحن تھا۔ میری ہدایت پر فیض محمد نے تھوڑی دیر کے لئے سلیم کی ہتھ کڑی کھول دی۔ میں نے سلیم کو حکم دیا کہ وہ اپنے قیمتی سامان کو چیک کر کے بتائے کہ کون کون سی چیز کم ہے۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد اس نے شکست خوردہ انداز میں اعلان کر دیا۔

''نقدی اور زیورات کے علاوہ سب کچھ موجود ہے جی......''

''نقدی اور زیورات کی تفصیل بتاؤ؟''

اس نے بتایا۔ ''لگ بھگ پانچ تولے سونے کے زیورات تھے جناب اور نقد رقم چھ سو روپے سے کچھ زیادہ ہی تھی۔''

اس زمانے میں سلیم جیسی حیثیت کے شخص کے لئے پانچ تولے سونا اور چھ سو روپے سے زیادہ رقم اہمیت کی حامل تھی۔ میں نے اسے دوبارہ ہتھ کڑی لگوائی اور پوچھا۔

''یہ رقم اور زیورات تمہارے پاس رہتے تھے یا بشریٰ کے قبضے میں؟''

اس نے بتایا۔ ''زیور تو بشریٰ نے اپنے پاس ہی رکھا ہوا تھا لیکن رقم میرے صندوق میں تھی۔ بشریٰ کو اس رقم کے بارے میں پتہ تھا۔''

''اور اب یہ دونوں چیزیں غائب ہیں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''جس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ تمہاری بیوی اپنی مرضی سے سائیں کے ساتھ فرار ہوئی ہے۔''

PDF LIBRARY 0333-7412793

وہ ایک بار پھر اپنے مرشد سائیں کی حمایت میں بولا۔ ''بشریٰ تو قیمتی سامان کے ساتھ واقعی غائب ہے مگر سائیں جی پر الزام لگانا ٹھیک نہیں۔''

میں نے برہمی سے کہا۔ ''میں ابھی تمہارے سائیں جی کا تالا بھی توڑنے والا ہوں۔ پھر اس بندے کا کچا چٹھا بھی کھل کر سامنے آجائے گا۔ ویسے تو اس کے آستانے میں داخل ہونے کے لئے یہ دیوار بھی کافی ہے۔'' میں نے دونوں گھروں کے درمیان واقع دیوار کی جانب اشارہ کیا۔

مذکورہ دیوار کی اونچائی پانچ فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ گویا ایک گھر کے صحن میں کھڑے ہو کر با آسانی دوسرے گھر میں جھانکا جا سکتا تھا۔ یہ ایک نامعقول اور بے پردگی والی صورت حال تھی۔ پتہ نہیں سلیم ان حالات میں کیسے رہ رہا تھا۔ سائیں تو چلو، چھڑا چھانٹ تھا مگر سلیم کے ساتھ تو اس کی بیوی بھی تھی۔ مجھے اس احمق انسان کی بے وقوفی اور اس کے طرزِ زندگی پر شدید غصہ آیا اور میں نے ایک بندے کو بھیج کر سلیمان کو وہاں بلا لیا۔ میں حاجی سلیمان کی موجودگی میں آستانے کا تالا توڑنا چاہتا تھا۔

پانچ فٹی دیوار کے اوپر سے میں آستانے کے صحن میں جھانک چکا تھا۔ اس طرف صرف ایک ہی کمرا بنا ہوا تھا۔ صحن خاصا کشادہ اور درختوں سے آباد تھا۔ حاجی سلیمان کی آمد پر اس گھر میں رسائی حاصل کی گئی اور بیرونی دروازے کے تالے کی طرح اکلوتے کمرے کا تالا بھی توڑ دیا گیا۔

اندر سے وہ کمرا ویسا ہی تھا جیسے عام طور پر آستانے ہوا کرتے ہیں۔ فرشی نشست، ایک کونے میں سائیں جی کی مسند، ان کی مخصوص صندوقچی اور دیوار گیر چھوٹی الماریوں میں مختلف نوعیت کی واہیات اور بے ہودہ اشیاء جن کے ''زور'' پر وہ اپنی پیری چمکائے بیٹھا تھا۔ اگر آپ کو کسی فراڈ آستانے میں جانے کا اتفاق ہوا ہو تو آپ اس ماحول کو اچھی طرح پہچانتے ہوں گے!

میں نے حوالدار کی مدد سے پندرہ منٹ کے اندر اندر سائیں کے آستانے کو کھنگال ڈالا اور وہاں سے مجھے صرف کام کی دو چیزیں مل سکیں۔ ایک تو تہ شدہ پرچہ تھا جس پر کسی گاؤں کا ایڈریس لکھا ہوا تھا اور دوسری طرف ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر تھی۔

تصویر پر نگاہ پڑتے ہی وہاں موجود افراد نے تصدیقی انداز میں کہا۔ ''یہ تو سائیں جی کی تصویر ہے۔''

میں نے اس اہم انکشاف کو اپنے ذہن میں نوٹ کر لیا اور ایڈریس والا پرچہ بھی انہیں

دکھایا لیکن وہ اس سے اپنی ناواقفیت ظاہر کر کے رہ گئے۔ مذکورہ پرچے میں کسی چوہدری نور عالم کا نام لکھا تھا اور اس کے نیچے ایڈریس موضع ''ککر والی'' کا تھا۔ ضلع یا تحصیل وغیرہ کہیں درج نہیں تھا۔ میں نے وہ تصویر اور پرچہ اپنی جیب میں رکھ لیا اور سلیم کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

''کیا اب بھی تم کسی بے یقینی کا شکار ہو؟''

کوئی جواب دینے کی بجائے وہ بڑی فکرمندی سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے دوٹوک لہجے میں اس پر واضح کر دیا۔

''دیکھو، بے قابو بیوی کے قابو شوہر! حالات و واقعات تو یہی بتا رہے ہیں کہ پیر سائیں تمہاری بیوی کو بھگا لے گیا۔ بالفرض، اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہی نتیجہ نکلتا ہے تم نے ان دونوں کے ساتھ کوئی گڑبڑ کی ہے۔ لہٰذا جب تک مفرور اور گم شدہ افراد کا کوئی سراغ نہیں ملتا، تم ہمارے ''مہمان'' رہو گے اور تمہاری ''آؤ بھگت'' حوالدار فیض محمد کے ذمے ہوگی۔''

وہ میرے قدموں میں گرنے کے لئے لپکا لیکن حوالدار نے زنجیر کھینچ کر اسے اس کی اوقات کا احساس دلایا۔ سلیم گڑگڑا کر منت سماجت کرنے لگا تھا لیکن میں نے اس کی ایک نہ سنی اور پنے ساتھ تھانے لا کر حوالات میں بند کر دیا۔ چند لمحات کے بعد میں اپنے کمرے میں بیٹھا حالات پر غور کر رہا تھا۔

سائیں کے آستانے اور سلیم کے گھر کی تلاشی کے بعد جو حقائق سامنے آئے تھے وہ تو یہی بتاتے تھے، سائیں نے سلیم کو اُلّو بنا کر اس کی خوب صورت بیوی سے راہ و رسم پیدا کر لی تھی۔ اس مقصد کے لئے دونوں گھروں کے درمیان واقع دیوار بھی بہت معاون ثابت ہوئی ہوگی۔ سلیم کی زبانی بشریٰ کے بارے میں سائیں کے جو خیالات مجھ تک پہنچے تھے وہ خاصے خطرناک اور بدنیتی پر مبنی تھے۔ سائیں نے سلیم کو بشریٰ سے دور رہنے کی ہدایت کرتے ہوئے اس کی مجبوری کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا...... تم بھی کیا کرو، تمہاری بیوی چیز ہی ایسی ہے کہ راہ چلتے کی رال ٹپک جائے۔ بلاشبہ تم خوش قسمت ہو کہ بشریٰ جیسی حسین اور شاداب عورت تمہاری منکوحہ ہے!

اس قسم کا تبصرہ کسی روحانی مددگار کو تو زیب نہیں دیتا اور سائیں نے ایسا کہا تھا تو پھر اس کے فراڈ میں کسی قسم کی گنجائش باقی نہیں رہتی تھی۔ اس پر مستزاد، سائیں کی وہ ''حرکت'' جس کی ''برکت'' سے آٹھ دن کے وظیفے کے بعد بشریٰ سلیم کے قبضے میں آنے والی تھی۔ سائیں نے سلیم کو بے وقوف بنایا۔ وہ بن گیا...... اور اب وہ اس کی حماقت کا نتیجہ بھگت رہا

PDF LIBRARY 0333-7412793

تھا۔

میں نے اس امکان کو ایک لمحے کے لئے بھی ذہن سے خارج نہیں کیا کہ اگر واقعی سائیں اور بشریٰ اپنی مرضی سے غائب نہیں ہوئے تو پھر یقیناً انہیں غائب کیا گیا ہے ...... اور غائب کرنے والا سلیم کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ سلیم چونکہ حوالدار کی ''مہمان داری'' میں تھا اس لئے میں نے فیض محمد کو بلا کر اس کے بارے میں خصوصی ہدایات دے دیں۔

آئندہ روز میں نے ایک فوٹو گرافر کی دکان پر جا کر سائیں کی تصویر کی چند کاپیاں بنوا لیں۔ میں نے ایک تصویر کو اپنے پاس رکھا اور باقی ضلع کے مختلف تھانوں کو بھجوا دیں اور درخواست کی کہ اس شخص کو جہاں بھی دیکھا جائے فوراً گرفتار کر لیا جائے۔ اس درخواست کے ساتھ ہی میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں سائیں کے ''کارنامے'' کو بھی ''فلیش'' کر دیا تھا۔ میں تو سائیں کی تصویر کے ساتھ ایک اور تصویر کا بھی اضافہ کرنا چاہتا تھا لیکن افسوس کہ بشریٰ کی کوئی تصویر دستیاب نہ ہو سکی البتہ میں نے اس کا حلیہ (سلیم سے پوچھنے کے بعد) بڑی حد تک واضح کر دیا تھا۔

سائیں کے آستانے سے اس کی تصویر کے ساتھ ہی ایک تہہ شدہ پرچہ بھی ملا جس میں چوہدری نور عالم آف ککر والی کا نام درج تھا۔ ہمارے ضلع میں ''ککر والی'' نامی کوئی قصبہ یا دیہات واقع نہیں تھا۔ اے ایس آئی جاوید مغل نے مجھے بتایا کہ ضلع جھنگ میں اور ضلع سرگودھا میں اس نام کا ایک گاؤں موجود تھا۔ سائیں کا چوہدری نور عالم سے کوئی گہرا تعلق ہو سکتا تھا لہٰذا میں نے یہ کام جاوید مغل ہی کو سونپا کہ وہ دو کانسٹیبلز اپنے ساتھ لے جائے اور دونوں اضلاع کے گاؤں ککر والی کو چیک کرے۔ یہ تو ممکن نہیں تھا، چوہدری نور عالم بھی دونوں گاؤں میں پایا جائے! البتہ وہ جہاں بھی ملتا، مجھے قوی امید تھی کہ اس سے سائیں کے بارے میں مفید معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ سائیں کے پاس اس کا نام پتہ خالی از علت نہیں ہو سکتا تھا۔

جب جاوید مغل میرے بتائے ہوئے مشن پر روانہ ہو گیا تو میں نے بخت نگر کی ایک تجربہ کار عورت رسولاں پھپھو کو تھانے بلوا لیا۔ یہ عورت گاہے بہ گاہے پولیس کے لئے مخبری وغیرہ کیا کرتی تھی۔ اس کا تعلق اسی علاقے سے تھا جہاں میرا تھانہ واقع تھا۔

میں نے رسولاں کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بعد کہا۔ ''تم وہاں نجیب پورہ میں کام شروع کر دو۔ میں بشریٰ اور سائیں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ وہاں کے مردوں کو میں نے کھنگال لیا ہے لیکن کوئی اشارہ نہیں مل سکا۔ تم عورتوں کے ساتھ

گھلو ملو اور گھروں کے اندر رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ عورتوں کو ایسے معاملات کی زیادہ ٹوہ ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے، تم کوئی مفید خبر لے کر آؤ گی!''

''میں آپ کے یقین پر پورا اترنے کی کوشش کروں گی ملک صاحب!'' رسولاں پھپھو نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ ''اس گاؤں میں میری رشتے کی ایک بھتیجی رہتی ہے۔ کافی دنوں سے اس سے ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ میں دو چار دن کے لئے اس کے پاس چلی جاتی ہوں۔ وہ بھی خوش ہو جائے گی اور اپنا کام بھی آسان ہو جائے گا۔''

رسولاں پھپھو، جگت پھپھو ٹائپ کی عورت تھی۔ اس قسم کے افراد کی رشتے داریاں ہر گاؤں اور شہر میں ہوتی ہیں۔ میں نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا اور ضروری ہدایات کے بعد اسے رخصت کر دیا۔

آئندہ دن بغیر کسی پیش رفت کے گزر گیا۔ مجھے سب سے زیادہ شدت سے اے ایس آئی کا انتظار تھا۔ میں نے جاوید مغل کو تاکید کی تھی کہ وہ چوہدری نور عالم کا سراغ لگائے بغیر واپس نہ آئے چاہے اس کام میں دو چار دن ہی کیوں نہ لگ جائیں۔ سائیں کی ایک تصویر میں نے اسے بھی دے دی تھی۔ اگر نور عالم تک رسائی حاصل ہو جاتی اور یہ بھی پتہ چل جاتا کہ سائیں اسی کے پاس ہے تو اے ایس آئی نے میرے حکم کے بموجب اسے گرفتار کر کے فوراً بخت نگر لانا تھا۔

اس سے اگلے روز پیر کو حالات میں تھوڑی تبدیلی پیدا ہوئی۔ میں تیار ہو کر اپنے کمرے میں پہنچا ہی تھا کہ ایک کانسٹیبل نے آ کر بتایا۔ ''ملک صاحب! نجیب پورہ سے شیخ لطیف آپ سے ملنے آیا ہے۔''

''فوراً اسے میرے پاس بھیجو۔'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

میری چھٹی حِس بتا رہی تھی کہ شیخ لطیف کوئی اہم خبر لایا ہو گا۔ اس نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد مجھے سلام کیا۔ میں نے اس کے سلام کا جواب دیا تو وہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''تھانے دار صاحب! ایک مسئلے نے مجھے ذہنی طور پر بری طرح الجھا دیا ہے۔''

''ایسا کیا مسئلہ ہے شیخ صاحب؟'' میں پوری طرح اس کی جانب متوجہ تھا۔

اس نے تھوڑا تامل کیا اور بولا۔ ''آپ بھی کہیں گے میں کیا بچوں والی بات کر رہا ہوں۔''

''نہیں کہوں گا......'' میں نے رسانیت سے کہا۔ ''آپ اپنی الجھن بیان کریں۔''

PDF LIBRARY 0333-7412793

چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔ ''دراصل میری بیوی نے اس جانب توجہ دلائی تو مجھے یقین نہ آیا۔ پھر جب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ پتہ نہیں یہ بات کسی حوالے سے اہم ہے یا نہیں لیکن میں آپ کو بتاؤں گا ضرور!''

شیخ لطیف کا انداز بہت ہی پیچ دار اور مبہم سا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

''اہم اور غیر اہم کا فیصلہ میں خود کرلوں گا۔ آپ وہ بات بتائیں جس کی طرف آپ کی بیوی نے توجہ دلائی ہے بلکہ توجہ دلائی تھی۔ اب تو آپ کو بھی یقین آ گیا ہے!''

شیخ لطیف نے مجھے بتایا کہ جمعہ کی رات یعنی بشریٰ اور سائیں کے غائب ہونے کے بعد والی رات کو اس کی بیوی نے سائیں کے صحن میں کسی بلی کو بڑے دردناک انداز میں بین کرتے ہوئے سنا تھا۔ اگلی صبح اس نے اپنے شوہر کو بتایا اور یہ خدشہ بھی ظاہر کیا کہ شاید بلی کے روپ میں کوئی دوسری مخلوق سائیں کے صحن میں موجود تھی۔ شیخ لطیف نے بیوی کی بات کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا۔

یہی واقعہ جب آئندہ روز بھی بیوی نے سنایا تو وہ تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ اس کی بیوی بلی کے بین والا قصہ سناتے ہوئے خاصی دہشت زدہ نظر آئی۔ شیخ لطیف نے بلی کی آہ و بکا کو تو کوئی اہمیت نہ دی البتہ بیوی کا خوف و ہراس اور وہم دور کرنے کے لئے اس سے کہہ دیا، اگر آج رات بھی تم اس بلی کو ماتمی راگ سناتے ہوئے سنو تو مجھے اسی وقت جگا دینا۔ میں چھت پر جا کر دیکھوں گا کہ ادھر کیا معاملہ ہے!

سائیں کا آستانہ سلیم اور لطیف کے گھروں کے درمیان واقع تھا۔ وہ دونوں اپنے گھروں کی چھتوں سے سائیں کے صحن کو بڑی وضاحت سے دیکھ سکتے تھے۔ سلیم تو نگاہ اٹھا کر دیوار کے اوپر سے بھی ادھر جھانک سکتا تھا۔

بہر حال اگلی رات یعنی گزشتہ رات بیوی نے جھنجھوڑ کر شیخ لطیف کو جگا دیا۔ اس نے پڑوس میں سماعت مرکوز کر کے سننے کی کوشش کی تو چونک اٹھا۔ دیوار کی دوسری جانب سے واقعی کسی بلی کی مخصوص ماتمی دردناک آواز ابھر رہی تھی۔

شیخ لطیف بلی سے منسوب توہمات پر یقین نہیں رکھتا تھا چنانچہ وہ بیوی کا خوف دور کرنے کے لئے بستر سے نکل آیا۔ ان کے گھر کی دیوار آٹھ فٹ سے زیادہ بلند تھی۔ اس کے اوپر سے سائیں کے صحن کو دیکھنا ممکن نہیں تھا لہٰذا وہ سیڑھی کے ذریعے مکان کی چھت

پر پہنچ گیا۔

جب اس نے اپنی چھت پر رہتے ہوئے سائیں کے صحن میں نگاہ دوڑائی تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔ وہ آدھی رات کا عمل تھا لیکن وسطی راتوں کے چاند نے صحن کو بڑی حد تک روشن کر دیا تھا۔ شیخ کے ششدر رہ جانے کا سبب وہ کالی بلی تھی جو نیم کے ایک پیڑ تلے ماتم کناں تھی۔ اس کی حرکات وسکنات میں ایک مفہوم پنہاں تھا۔

مذکورہ بلی تھوڑی تھوڑی دیر بعد آسمان کی جانب منہ اٹھا کر بڑے کرب ناک انداز میں بین کرنے لگتی۔ پھر باقاعدہ کسی انسان کی طرح سینہ کوبی میں مصروف ہو جاتی۔ درمیانی وقفے میں وہ صحن میں موجود نیم کے پیڑ کا طواف کرنے لگتی۔

اس منظر نے شیخ لطیف کو مبہوت کر دیا۔

بات ختم کرنے کے بعد اس نے ایک جھرجھری لی اور خاموش نظر سے مجھے تکنے لگا۔ اس کی بیان کردہ داستان خاصی دلچسپ تھی۔ میں نے آگے کا احوال جاننے کی خاطر پوچھ لیا۔ ''اس کے بعد کیا ہوا؟''

اس نے بتایا۔ ''میں تھوڑی دیر تک بلی کی حرکات کو دیکھتا رہا پھر میں نے ہشکار کر اسے وہاں سے بھگا دیا۔ بلی کے جانے کے بعد میں چند لمحات تک اس انتظار میں چھت پر موجود رہا کہ کہیں وہ دوبارہ سائیں کے صحن میں آ کر ماتم نہ کرنے لگے۔ یہ انتظار بھی میں نے اپنی بیوی کے اطمینان کے لئے کیا تھا تاکہ اس کے ذہن میں موجود خدشات کا خاتمہ ہو سکے۔ مگر جب کالی بلی واپس نہیں آئی تو میں چھت سے اتر آیا۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ کی وضاحت کے بعد آپ کی بیوی کا خوف دور ہو گیا؟''

''اس بارے میں، میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''آج رات کو پتہ چل سکے گا۔ اگر وہ کالی بلی اپنی حرکات سے باز آ گئی تو اچھی بات ہے ورنہ اس کا کوئی اور بندوبست کرنا ہوگا!''

''شیخ صاحب! بلی کو آپ نے جو کچھ بھی کرتے دیکھا، کیا آپ کو اس سے خوف محسوس ہوا تھا؟''

''نہیں......'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''لیکن یہ سب کچھ مجھے بہت عجیب لگا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ماتم کناں ہو۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''ملک صاحب! آپ کو اس واقعے میں کوئی خاص بات نظر آ رہی ہے؟''

PDF LIBRARY 0333-7412793

"ہاں ...... میرا ذہن اس وقت ایک خاص زاویے پر سوچ رہا ہے۔" میں نے پُر خیال انداز میں کہا۔

اس نے بے چینی کا مظاہرہ کرتے ہوئے استفسار کیا۔ "کس زاویے پر؟"

"میں ابھی تمہارے ساتھ نجیب پورہ جاتا ہوں۔" میں نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "باقی بات وہیں جا کر کریں گے۔"

ٹھیک نو بجے میں ایک مرتبہ پھر نجیب پورہ میں تھا۔ میں اپنے ساتھ تھانے سے ایک کانسٹیبل کو بھی لے آیا تھا۔ اس وقت میرا ذہن تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ سائیں کے آستانے کا تالا توڑنے کے بعد میں نے وہاں سرکاری تالا ڈال دیا تھا۔ ہم شیخ لطیف کے ساتھ آستانے کے اندر داخل ہو گئے۔ میری متلاشی نظر صحن میں اِدھر سے اُدھر گھومنے لگی۔

مجھے کسی کدال، پھاوڑے یا اسی قسم کے آلے کی تلاش تھی۔ صحن میں مجھے کچھ نہ ملا تو میں نے آستانے والے کمرے کا کونا کونا بھی جھانک ڈالا۔ پھر بانس کی سیڑھی کی مدد سے میں آستانے کی چھت پر پہنچ گیا۔ ان تمام گھروں کی چھتیں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ جب میری مطلوبہ شے چھت پر بھی کہیں دکھائی نہ دی تو میں دوسری جانب سلیم کے گھر میں اتر گیا۔ اس تلاش میں وہاں بھی مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو میں واپس آستانے پر آ گیا۔

"تھانے دار صاحب! آپ کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟" شیخ لطیف نے پوچھا۔

"ابھی بتاتا ہوں۔" اتنا کہہ کر میں نیم کے پیڑ کا جائزہ لینے لگا۔

مذکورہ درخت صحن کے وسط میں ایستادہ تھا۔ وہ خاصا گھنا درخت تھا جس کی چھاؤں صحن کے ایک بڑے حصے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس درخت کے علاوہ بھی صحن میں چھوٹے موٹے کئی پودے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ میں نیم کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا اور وہاں کی زمین کا جائزہ لینے لگا۔ پورا صحن کچی زمین پر مشتمل تھا۔ مجھے زمین کے اس حصے کی تلاش تھی جہاں چند روز پہلے کھدائی کی گئی ہو مگر پورے صحن کا معائنہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کے کسی بھی حصے میں پچھلے دنوں کسی قسم کی کوئی کھدائی نہیں کی گئی۔ ذہین قارئین سمجھ گئے ہوں گے، اس وقت میرے ذہن میں کس نوعیت کے خیالات چل رہے ہوں گے!

میری کارروائی کو شیخ لطیف حیرت بھری نظر سے دیکھتا رہا اور پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"تھانے دار صاحب! کچھ مجھے بھی تو بتائیں؟"

میں نے مختصر الفاظ میں اسے اپنے خیالات سے آگاہ کیا تو وہ متاسفانہ انداز میں بولا۔

"مجھے تو نہیں لگتا کہ یہاں ایسا کوئی کام کیا گیا ہو۔ اگر وقوعہ کی رات (جمعرات کی رات، جس کے بعد سے سائیں اور بشریٰ غائب تھے) سائیں کے صحن میں کوئی کھدائی کی گئی ہوتی تو ہمارے گھر میں اس کی مخصوص آواز ضرور پہنچتی۔ پھر صحن کی حالت سے بھی یہی اندازہ ہو رہا ہے کہ یہاں اس قسم کی کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہو شیخ صاحب!" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آپ کی طرح میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔ خیر......" میں نے ایک لمحے کا توقف کیا اور اس سے پوچھا۔ "کیا آپ کی بیوی اس وقت گھر میں موجود ہے؟"

شیخ لطیف نے چونک کر مجھے دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے کہا۔ "میں آپ کی بیوی سے دو چار باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں گردن ہلائی اور دو منٹ بعد میں اس کی بیٹھک میں بیٹھا تھا۔ کانسٹیبل کو میں نے گھر سے باہر ہی روک دیا تھا۔ شیخ لطیف نے اپنی بیوی کو بیٹھک ہی میں بلا لیا۔

رسمی کلمات کے بعد میں نے زلیخا بی بی سے پوچھا۔ "پہلی مرتبہ بلی کے رونے کی آواز تم نے کب سنی تھی؟"

"جمعے کی رات کو۔" اس نے بتایا۔ "یعنی سائیں کے غائب ہونے کے بعد جو رات آئی تھی۔"

"اس وقت رات کا کون سا پہر تھا؟"

"آدھی رات تھی جناب۔" اس نے سراسیمہ لہجے میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ "کیا اگلی رات کو بھی اسی وقت بلی نے بین شروع کیا تھا؟"

"جی ہاں ...... بارہ اور ایک بجے کے درمیان ہی وہ ادھر ادھم مچاتی ہے۔"

"اور یہ ادھم کتنی دیر جاری رہتا ہے؟"

"یہی کوئی آدھا پونا گھنٹہ۔"

"کیا جمعہ، ہفتہ اور اتوار تینوں راتوں کو انہی اوقات میں یہ واقعہ پیش آیا ہے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے پوچھا۔ "کیا دن کے کسی حصے میں بھی تم نے سائیں کے صحن کی طرف سے اس قسم کی آوازیں سنیں؟"

"نہیں جی۔" اس نے نفی میں سر ہلایا پھر سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔ "تھانے دار صاحب! مجھے تو یہ کوئی اور ہی چکر لگتا ہے۔ لیکن شیخ صاحب ایسی باتوں پر یقین نہیں

PDF LIBRARY 0333-7412793

کرتے۔''

بات ختم کر کے زلیخا نے شاکی نظر سے اپنے شوہر کو دیکھا۔

میں نے کہا۔''زلیخا! میں تمہاری بات میں اچھا خاصا وزن محسوس کر رہا ہوں۔ کالی بلی اور سائیں کے آستانے کا واقعی کوئی پراسرار تعلق ہے...... اور یہ تعلق آج رات میں معلوم کر لوں گا۔'' پھر ایک لمحہ توقف کرنے کے بعد میں نے شیخ لطیف کی طرف دیکھا اور کہا۔

''آنے والی رات کو میں کچھ وقت آپ کے گھر میں گزارنا چاہتا ہوں شیخ صاحب! خصوصاً وہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ جب سائیں کے صحن میں کالی بلی بین کرنے آتی ہے۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟''

شیخ نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔''بڑے شوق سے جناب، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''دراصل میں اپنی آنکھوں سے بلی کی کارکردگی کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

زلیخا بولی۔''تھانے دار جی! ذرا ہاتھ پاؤں بچا کر۔ یہ ہوائی مخلوق کسی کا خیال نہیں کرتی۔ سائیں پتہ نہیں اپنے آستانے پر کیسے کیسے الٹے سیدھے عمل کرتا رہا ہے۔ اس بلی کا رونا دھونا تو مجھے کسی گہرے عمل کا نتیجہ ہی لگتا ہے۔ میں نے سن رکھا ہے، کالی بلی کے اندر ہمیشہ بری چیزیں ہی چھپی ہوتی ہیں۔ پتہ نہیں، یہ ہمارے پڑوس میں کیا خطرناک سلسلہ چل پڑا ہے۔'' اس کی آنکھوں سے خوف جھلکتا تھا۔

''تم فکر نہ کرو زلیخا بی بی!'' میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔''میں ہاتھ پاؤں بچا کر ہی کام کرنے کا عادی ہوں۔ اور جب میرے سامنے بری چیزیں ہوں تو میں ان سے بھی زیادہ برا ہو جاتا ہوں۔ آج رات کو اگر وہ کالی بلی سائیں کے صحن میں آ جاتی ہے تو سمجھو پھر اس کا راز، راز نہیں رہے گا۔ میں اس کی حقیقت اور اس کے بین کے مقصد تک رسائی حاصل کر لوں گا۔ آج کے بعد وہ تم لوگوں کو پریشان کرنے کے لئے ادھر کا رخ نہیں کرے گی۔''

زلیخا کی آنکھوں میں موجود خوف و ہراس میں ذرا کمی واقع نہ ہوئی۔ وہ کچھ حد سے زیادہ ہی توہم پرست عورت تھی۔

شیخ لطیف نے میرا شکریہ ادا کیا اور میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں سے رخصت ہوتے وقت میں نے انہیں سختی سے ہدایت کر دی کہ وہ اس واقعے کا کسی سے ذکر نہ کریں۔ کم از

کم آج کی رات کو گزر جانے دیں۔ مجھے یقین تھا، میں آدھی رات کے بعد کسی حتمی نتیجے پر ضرور پہنچ جاؤں گا۔

اسی شام اے ایس آئی جاوید مغل واپس آ گیا۔ وہ اکیلا ہی تھا۔ اس کے ساتھ میں نے جن دو کانسٹیبلز کو روانہ کیا تھا، وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں نے اسے خاصا الجھا ہوا پایا تو اس کی الجھن کا سبب دریافت کر لیا۔

اس نے بتایا۔''ملک صاحب! میں یہ پتہ چلانے میں کامیاب ہو گیا ہوں کہ چوہدری نور عالم کا تعلق جس موضع ککر والی سے ہے وہ ضلع جھنگ میں واقع ہے۔''

''پھر اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے؟'' میں نے اس کی حالت کے پیش نظر کہا۔''کیا تم نے چوہدری سے سائیں کے بارے میں استفسار کیا؟''

''میں نور عالم سے ملا ہوں جناب!'' اے ایس آئی نے بتایا۔''لیکن وہ اس بات سے انکاری ہے کہ چند روز پہلے کوئی سائیں اس کے پاس پہنچا ہے۔ میں نے اسے وہ پرچہ بھی دکھایا۔ اس نے پرچے اور سائیں سے لاتعلقی کا اظہار کیا ہے۔ چوہدری نے بڑے واضح الفاظ میں کہا ہے وہ کسی سائیں کو نہیں جانتا مگر......''

اے ایس آئی جملہ نامکمل چھوڑ کر ذرا دیر کو خاموش ہوا پھر متذبذب انداز میں بولا۔

''مگر میرا خیال ہے چوہدری سراسر جھوٹ بول رہا ہے۔ سائیں ککر والی پہنچا ضرور ہے۔''

''تمہارے اس خیال کا سبب کیا ہے؟'' میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

اس نے بتایا۔''میں نے چوہدری کی حویلی کی طرف جانے سے پہلے ککر والی میں اِدھر اُدھر گھوم پھر کر بھی تھوڑی تفتیش کی تھی اور اس تفتیش کا نتیجہ یہ ہے کہ سائیں اس گاؤں میں پہنچا ہے۔''

''اوہ!'' میں نے ایک طویل سانس خارج کی۔''اس کا مطلب ہے چوہدری دانستہ سائیں کو کور دے رہا ہے۔ گویا وہ اس کے جرم سے واقف ہے۔ مجھے امید ہے سائیں کو چوہدری نے کہیں روپوش کر دیا ہوگا!''

''مجھے بھی یقین ہے۔ کیونکہ سائیں ککر والی میں کہیں نظر نہیں آیا۔'' جاوید مغل نے کہا۔ ''میں نے چوہدری کو سائیں کی تصویر بھی دکھائی تھی۔ تصویر دیکھنے کے بعد وہ تھوڑا چونکا تھا، پھر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے چہرے کے تاثرات پر قابو پاتے ہوئے سائیں سے ناواقفیت کا اظہار کر دیا۔''

''اس کا مطلب ہے چوہدری نور عالم کو کسی زبردست طریقے سے گھسنا پڑے گا۔'' میں

PDF LIBRARY 0333-7412793

نے سنجیدگی سے کہا۔ "وہ آسانی سے ہاتھ آنے والی مچھلی نہیں۔"

اے ایس آئی نے کہا۔ "میں نے چوہدری کے تیور دیکھتے ہوئے ایک چال چلی۔ میں نے یہی ظاہر کیا جیسے مجھے اس کی بات کا اعتبار آ گیا ہو۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اب سیدھا موضع ککر والی آف سرگودھا جاؤں گا۔ شاید ہمارا مطلوب سائیں اس گاؤں میں مل جائے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ میں پہلے سرگودھا اور پھر جھنگ گیا تھا۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا۔" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ "اس طرح وہ بہت زیادہ احتیاط کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔ سوچے گا، بلا ٹل گئی۔ میں اسی دوران میں اس کی اور سائیں کی خبر گیری کے لئے جھنگ پہنچ جاؤں گا۔" ایک لمحے کو متوقف رہ کر میں نے اس سے پوچھا۔ "جاوید! تمہارے ساتھ جو دو کانسٹیبلو گئے تھے انہیں کہاں چھوڑ آئے ہو؟"

"میں انہیں ککر والی کے آس پاس ہی چھوڑ آیا ہوں اور ہدایت کر دی ہے کہ وہ گاؤں میں آنے جانے والوں پر گہری نگاہ رکھیں۔ اگر سائیں وہیں کہیں چھپا بیٹھا ہے تو اسے گاؤں چھوڑنے کا موقع نہ مل سکے۔ اے ایس آئی نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "میں یہاں آنے سے پہلے ککر والی سے متعلقہ تھانے بھی گیا تھا اور تھانہ انچارج سے مل کر اسے صورتِ حال سے آگاہ کر دیا ہے۔ انچارج نے اپنے تعاون کا بھرپور یقین دلاتے ہوئے کہا ہے کہ وہ اپنے عملے سے بھی ککر والی کی نگرانی کروائے گا۔"

میں نے ستائشی نظر سے جاوید مغل کو دیکھا اور خوش ہو کر کہا۔ "تم نے بڑا پکا کام کر دیا ہے۔ میں کل صبح ہی جھنگ روانہ ہو جاؤں گا۔ آج کی رات کالی بلی کا نتیجہ بھی سامنے آ جائے گا۔"

"کالی بلی......؟" اے ایس آئی نے چونک کر حیرت سے مجھے دیکھا۔

جواب میں، میں نے اسے مختصر الفاظ میں سائیں کے صحن میں پیش آنے والے واقعے سے آگاہ کیا۔ میرے خاموش ہوتے ہی اس نے بھی وہی خدشہ ظاہر کیا جیسا میں نے سوچا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے صحن کے ایک ایک انچ کو ٹھونک بجا کر دیکھ لیا ہے لیکن کہیں بھی کھدائی کے آثار دکھائی نہیں دیئے۔

"میں نے بھی سائیں کی تلاش میں لوگوں سے استفسار کرتے ہوئے ایک خوب صورت عورت کا بھی ذکر کیا تھا مگر جس نے بھی سائیں کی ککر والی میں موجودگی کی حامی بھری اس نے بشریٰ کے بارے میں قطع لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔" اے ایس آئی متفکر لہجے میں بولا۔ "اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے بشریٰ اس کے ساتھ نہیں تھی۔ وہ اکیلا ہی ککر والی پہنچا

ہے!"

میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "ایک مرتبہ اس مردود سائیں کی گردن ہاتھ آ جائے تو پھر بشریٰ کے بارے میں اس کی زبان کھلوانا کچھ مشکل نہ ہو گا۔ اس بات کا تو مجھے پورا یقین ہے، بشریٰ کی گمشدگی میں سراسر اسی کا ہاتھ ہے۔"

"چلیں دیکھتے ہیں آج رات وہ کالی بلی کیا تماشا دکھاتی ہے۔" اے ایس آئی نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "ملک صاحب! میں بھی آپ کے ساتھ یہ تماشا دیکھنے جاؤں گا۔"

اے ایس آئی کی فرمائش میں گہری دلچسپی رچی بسی تھی۔

اسے اپنے ساتھ رکھنے کے لئے میں نے ہامی بھر لی۔

ہم لگ بھگ گیارہ بجے رات شیخ لطیف کے گھر پہنچ گئے۔ ہم کھانا کھا کر گئے تھے اس لئے صاف منع کر دیا تاہم وہ چائے پانی سے ہماری تواضع کئے بنا نہ رہا۔ وہ گرمیوں کا سیزن تھا لہٰذا ہم نے شیخ لطیف کے مکان کی چھت پر ڈیرا لگا لیا۔ اس مقام سے سائیں کا پورا صحن بہ خوبی نظر آتا تھا۔ میں تھانے سے روانہ ہوتے وقت ایک طاقت ور ٹارچ بھی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اگرچہ ان دنوں چاندنی راتیں تھیں تاہم ٹارچ کی ضرورت کسی بھی وقت پیش آ سکتی تھی۔ پتہ نہیں وہ کالی بلی ہمیں کون سا کرتب دکھانے والی تھی۔

میرے اور اے ایس آئی جاوید مغل کے علاوہ شیخ لطیف بھی وہیں چھت پر موجود تھا۔

ہم نے کوئی ساڑھے گیارہ بجے سے سائیں کے صحن کی نگرانی شروع کر دی جس کے وسط میں نیم کا ایک چھتنادر درخت ایستادہ تھا۔ شیخ لطیف کی بیوی زلیخا کے مطابق وہ کالی بلی آدھی رات کے بعد ہی اپنا بین شروع کرتی تھی اور شیخ نے اس بات کی تصدیق کی تھی کہ وہ اپنا "تماشا" نیم کے درخت تلے دکھاتی تھی۔

ساڑھے گیارہ سے بارہ بجے اور پھر دیکھتے دیکھتے رات کا ایک بج گیا۔ ہم بڑی توجہ سے اس کالی بلی کا انتظار کر رہے تھے جو گزشتہ تین راتوں سے نیم کے پیڑ تلے آہ و بکا کا ایک بازار گرم کرتی رہی تھی۔ لیکن اس رات دور دور تک اس کی آمد کے آثار نظر نہیں آئے۔

جب رات کا ڈیڑھ بج گیا تو میں نے اُکتاہٹ آمیز لہجے میں شیخ لطیف سے کہا۔ "شیخ صاحب! کہاں رہ گئی وہ کالی بلی؟ کہیں اسے کسی ہوائی مخلوق نے ہمارے مورچے کی اطلاع تو نہیں دے دی ...... اور احتیاطاً اس نے ادھر آنے کا ارادہ ترک کر دیا ہو! بھئی ہماری طرح ان لوگوں میں بھی تو مخبر قسم کی چیزیں ہوتی ہوں گی۔"

PDF LIBRARY 0333-7412793

میرے انداز میں ہلکا سا طنز شامل تھا۔ شیخ لطیف نے ندامت آمیز لہجے میں کہا۔

''تھانے دار صاحب! مجھے اس وقت آپ کے سامنے بہت شرمندگی محسوس ہو رہی ہے۔ اگر میں نے اپنی آنکھوں سے اسے ماتم کرتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو اپنی بیوی کی بات کا کبھی یقین نہ کرتا۔'' وہ چند لمحات کے لئے خاموش ہوا پھر خجالت بھرے انداز میں سر جھکتے ہوئے بولا۔

''اس کم بخت کو بھی آج ہی ناغہ کرنا تھا۔ مجھے آپ کی نظر میں خواہ مخواہ جھوٹا بنا دیا!''

شیخ لطیف کو میں نے حد درجہ معقول پایا تھا۔ اس کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو میں سوچ سکتا تھا، اس نے ہمیں کوئی چکر دینے کے لئے کالی بلی والا وہ ڈھونگ رچایا ہوگا۔ شیخ کی طرف سے مجھے ایسی حماقت کی توقع نہیں تھی۔ آج کی غیر حاضری میں سراسر اسی بلی کا قصور تھا۔

میں نے شیخ لطیف کی طرف دیکھتے ہوئے دل جوئی والے انداز میں کہا۔ ''شیخ صاحب! خواہ مخواہ دل چھوٹا نہ کریں۔ ایک چھوٹے سے جانور کا کیا بھروسہ۔ اسے کیا معلوم تھا، اس کی غیر حاضری سے آپ کی سبکی ہو جائے گی۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے مذاق کے رنگ میں کہا۔

''شیخ صاحب! آپ نے گزشتہ رات اس بے چاری کو بڑے غصے میں ہشکار بھی تو دیا تھا۔ دم دبا کر کہیں بھاگ گئی ہوگی!''

اس کے لبوں پر خفت آمیز مسکراہٹ ابھری تاہم وہ خاموش ہی رہا۔ ہم نے اسے خدا حافظ کہا اور اس کے گھر سے نکل آئے۔ وہ تانگے تک ہمیں چھوڑنے آیا اور جب ہم تانگے میں سوار ہو گئے تو اس نے لجاجت بھرے لہجے میں کہا۔

''تھانے دار صاحب! میں ایک مرتبہ پھر آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ......''

''بس بس، شیخ صاحب! اتنی زیادہ شرمندگی بھی ظاہر نہ کریں۔'' میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ٹوک دیا۔ ''یہ تو اچھا ہی ہوا، وہ سائیں کے صحن کا راستہ بھول گئی ورنہ خواہ مخواہ آپ کی بیوی کے واہموں میں اضافہ ہو رہا تھا۔'' میں ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر رازدارانہ انداز میں کہا۔

''آپ زلیخا سے جا کر یہ کہیں کہ تھانے دار نے ایک مخصوص عمل سے بلی کو بھگا دیا ہے۔ اب وہ بھول کر بھی ادھر کا رخ نہیں کرے گی۔ اس طرح اس کا خوف دور ہو جائے گا۔''

دو بجے سے تھوڑا پہلے ہم واپس تھانے پہنچ گئے۔

اگلی صبح میں دیر سے سو کر اٹھا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ گزشتہ رات سوتے سوتے تین بج گئے تھے۔ میں عموماً عشاء کی نماز کے بعد بستر پر لیٹ جاتا ہوں اور علی الصباح اٹھنے کا عادی ہوں۔ بہرحال، لگ بھگ دس بجے میں گکر والی جانے کے لئے تھانے سے روانہ ہونے ہی والا تھا کہ شیخ لطیف ایک مرتبہ پھر ہمارے پاس پہنچ گیا۔

وہ اس وقت خاصا پُرجوش دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اس کا سبب پوچھا تو وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ''تھانے دار صاحب! کالی بلی کا راز کھل گیا ہے۔''

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھ لیا۔ ''کیا رات کو وہ ہمارے رخصت ہونے کے بعد سائیں کے صحن میں آئی تھی؟''

''نہیں جی ......'' وہ جلدی سے بولا۔ ''اب تو وہ کہیں بھی آنے جانے کے قابل نہیں رہی۔'' اس نے خاصے دل گرفتہ انداز میں بتایا۔ ''ہماری گلی کے آخری سرے پر جو کچرے کا ڈھیر ہے نا وہ ادھر مری پڑی ہے۔ میں صبح اپنی دکان کی طرف جا رہا تھا تو اسے دیکھا۔''

''اوہ!'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''اسی لئے وہ گزشتہ رات سائیں کے صحن میں ''حاضری'' نہیں دے سکی۔ بہرحال، بلی کم، خوف دور!'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''کالی بلی کی موت سے آپ کی پریشانی تو ختم ہوئی!''

''ان عورتوں کی پریشانیاں کبھی ختم نہیں ہوتیں جناب۔'' وہ مایوسانہ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اب زلیخا کو ایک اور وہم نے آ گھیرا ہے ...... وہ کہتی ہے، اس بلی کو باہر کی شے نے قتل کیا ہے۔ سائیں کا آستانہ بہت بھاری جگہ ہے۔ ہمیں اپنی رہائش تبدیل کر لینی چاہئے ورنہ بیٹھے بٹھائے کسی لپیٹے میں آ جائیں گے۔''

میں نے اس کا کندھا تھپکا اور تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں شیخ صاحب! ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔''

''مجھے تو کوئی فکر نہیں جناب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''بس میری گھر والی......''

''گھر والی سے جا کر کہہ دو، کالی بلی تو اپنے انجام کو پہنچ گئی۔'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''اس کا انجام اچھا ہوا ہے یا برا اس کو بھول جاؤ لیکن میں اس باگڑ بلّے کا انجام بہت بھیانک کرنے والا ہوں۔ اس کے بعد آپ کے پڑوس سے ہر قسم کا ''سایہ'' جاتا رہے گا۔''

میں نے ابھی تک شیخ لطیف کو یہ نہیں بتایا تھا کہ ہم سائیں کا سراغ لگا چکے ہیں اور میں

PDF LIBRARY 0333-7412793

موضع کگر والی جانے کے لئے تیار بیٹھا ہوں۔ اس نے چونک کر حیرت بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا۔

''باگڑ بلاّ؟''

''میں سائیں کی بات کر رہا ہوں۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے تو بہ نفسِ نفیس اسے کئی بار دیکھا ہو گا۔ میں نے تو اس کی صرف تصویر ہی دیکھی ہے۔ وہ کسی جنگلی بلّے کی مانند ہی تو دکھائی دیتا ہے۔''

''کیا آپ نے اس سائیں کا پتہ لگا لیا؟''

''پتہ بھی اور ٹھکانہ بھی۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میں اسے لینے ہی جا رہا ہوں۔ شام سے پہلے وہ آپ کو اس تھانے کی حوالات میں ملے گا۔''

اس نے ہمدردی بھرے لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیا بشریٰ کا بھی سراغ مل گیا؟''

''اس کے بارے میں فی الحال کوئی اطلاع نہیں ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''سائیں ایک مرتبہ قابو آ جائے، پھر بشریٰ کی تفصیل معلوم ہو جائے گی۔''

شیخ لطیف کو رخصت کرنے کے بعد میں موضع کگر والی روانہ ہو گیا۔ میں نے صرف ایک کانسٹیبل صفدر علی کو اپنے ساتھ رکھا تھا۔ دو کانسٹیبلز پہلے سے وہاں موجود تھے۔ سائیں کو قابو کرنے کے لئے اتنی نفری بہت تھی۔

میں سیدھا متعلقہ تھانے پہنچا اور تھانہ انچارج سے ملا۔ ملک مبین نے بڑی گرم جوشی سے میرا استقبال کیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں موضوع کی طرف آ گیا اور پوچھا۔

''میرے مطلوبہ افراد کے بارے میں کیا خبریں ہیں ملک صاحب؟''

''میں نے نہایت ہی رازدارانہ انداز میں تحقیق کی ہے اور صرف ایک شخص کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔'' ملک مبین نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ کے مطلوبہ سائیں کو چوہدری نور عالم نے اپنی حویلی میں پناہ دے رکھی ہے۔ لیکن آپ نے بشریٰ نامی جس عورت کا ذکر کیا ہے وہ حویلی کے اندر موجود نہیں بلکہ میری تفتیش کے مطابق سائیں اکیلا ہی کگر والی پہنچا ہے۔''

''اوہ!'' میں نے ایک طویل سانس خارج کی۔ ''بشریٰ کے بارے میں اب سائیں ہی سے پوچھنا پڑے گا۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''چوہدری نور عالم کو تو کسی قسم کا کوئی شک نہیں ہوا نا؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ملک صاحب!'' ملک مبین نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے

ہوئے کہا۔ ''میں نے اس سلسلے میں بہت احتیاط برتی ہے کیونکہ یہ صرف آپ ہی کا نہیں بلکہ میرا بھی مشن ہے۔'' وہ چند لمحات کے لئے سانس لینے کو رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''یہ چوہدری نور عالم بھی بندہ ٹھیک نہیں۔ گاہے بہ گاہے اس کی شکایات مجھ تک پہنچتی رہتی ہیں۔ لیکن اس پر ہاتھ ڈالنے کا مجھے موقع نہیں ملا۔ اتفاق سے یہ موقع اب ہاتھ لگا ہے۔ آپ سائیں کے معاملے سے نمٹنا، میں ایک مجرم کو پناہ دینے کے جرم میں چوہدری کو دھر لوں گا۔''

''آئیڈیا اچھا ہے۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''اس نیک کام میں ایک لمحے کی تاخیر بھی مناسب نہیں ہو گی۔''

آئندہ دس منٹ کے اندر ہم تینوں تھانے سے نکل کر چوہدری کی حویلی کی سمت روانہ ہو گئے۔ تین کانسٹیبلز میرے عملے کے تھے، تین ملک مبین نے اپنے تھانے کی نفری میں سے لے لئے۔ کگر والی پہنچتے ہی ہم نے ان چھ کانسٹیبلز کو چوہدری کی حویلی کے چاروں طرف پھیلا دیا۔ وہ سب سادہ لباس میں تھے لہٰذا کسی کو ان کی سرگرمی پر شک نہیں گزر سکتا تھا۔ انہوں نے اس طرح حویلی کو اپنے نرغے میں لے لیا کہ حویلی کے کسی بھی حصے سے اندر باہر جانے والا ان کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا۔ انہیں ہدایت کر دی گئی کہ کسی بھی شخص کو قابو کرنے کے لئے وہ کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا سکتے ہیں۔ میں ملک مبین کے ساتھ حویلی کے اندر چلا گیا۔

چوہدری نور عالم نے بڑی بے دلی سے ہمارا استقبال کیا۔ وہ مبین کا صورت آشنا تھا، اسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔ میں سادہ لباس میں تھا لہٰذا اس نے مجھ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور ملک مبین کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! خیریت تو ہے ...... آپ کو مجھ جیسے ناچیز سے کیا کام پڑ گیا؟''

چوہدری کے انداز میں گہرا طنز بھرا ہوا تھا۔ اس سے مجھے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوئی کہ وہ اپنے علاقے کے تھانے انچارج سے خوش نہیں تھا اور یہ صورت حال یک طرفہ نہیں تھی۔ نور عالم مجھے ایک مغرور اور اجڈ قسم کا چوہدری محسوس ہوا۔ ایسے لوگ اپنی طاقت کے گھمنڈ میں کسی کو کچھ نہیں سمجھتے۔ ملک مبین کی برگشتگی بجا تھی۔ اس نے چوہدری کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''کام مجھے نہیں، بلکہ ان ملک صاحب کو ہے۔'' اس نے میری طرف اشارہ کیا اور

PDF LIBRARY 0333-7412793

بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''ان کے دو بندے کھو گئے ہیں جن کی تلاش میں یہ ٹکر والی آئے ہیں۔ میں تو خواہ مخواہ اپنی تھانے داری چمکانے ان کے ساتھ چلا آیا ہوں۔''

''اوہو...... دو دو ملک صاحب۔ کیا یہ آپ کے رشتے دار ہیں؟''

چوہدری نے طنزیہ لہجے میں ملک مبین سے سوال کیا تھا لہٰذا جواب بھی اسی نے دیا اور بڑا مدلل جواب دیا۔ اس نے کہا۔ ''پیشے کے لحاظ سے یہ میرے پیٹی بھائی ہیں۔ میری طرح یہ بھی ادھر اپنے تھانے کے انچارج ہیں۔''

چوہدری نے چونک کر مجھے دیکھا اور سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کو جن دو بندوں کی تلاش ہے، ان سے میرا کیا تعلق واسطہ۔ آپ میرے پاس کیوں آئے ہیں؟''

اس کے بدلتے ہوئے تیور نے مجھے بتا دیا، کوئی گڑبڑ ہے۔ چوہدری کے ہاتھ صاف نہیں ہیں۔ وہ سائیں اور بشریٰ کے معاملے میں پوری طرح ملوث ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے کہا۔

''چوہدری صاحب! آپ کا میرے مطلوبہ بندوں سے بڑا گہرا تعلق واسطہ ہے۔ آپ نے انہیں اپنی حویلی میں پناہ دے رکھی ہے۔ میرا اشارہ سائیں اور بشریٰ کی طرف ہے!''

''سائیں ...... بشریٰ......؟'' اس نے اپنے تئیں لاعلمی کی اداکاری کرنے کی پوری کوشش کی لیکن اس کوشش میں کوئی دم نہیں تھا۔ وہ منہ بگاڑ کر بولا۔ ''یہ کس کھیت کی مولیاں ہیں؟''

''اس وقت تو یہ مولیاں آپ کے کھیت میں بہار دکھا رہی ہیں۔'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں تکتے ہوئے کہا۔ ''اور میں انہیں اکھاڑنے کے لئے یہاں پہنچا ہوں۔''

''آپ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں۔'' وہ بھپر گیا۔ ''کیا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ میں نے دو مجرموں کو اپنی حویلی میں پناہ دے رکھی ہے؟''

برہمی اور غصے کی شدت نے چوہدری کی زبان کو ہمارے حق میں پھیر دیا تھا۔ میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ الزام نہیں بلکہ حقیقت ہے نور عالم! اور تم نے دو مجرموں کا ذکر کر کے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ تم سائیں اور بشریٰ سے واقفیت رکھتے ہو۔ کیونکہ میں نے تو ابھی تک انہیں مجرم نہیں کہا۔ میں نے تو صرف دو بندوں کا حوالہ دیا تھا۔''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ تاثرات سے مجھے اندازہ ہوا وہ اپنی غلطی پر خاصا بوکھلا گیا تھا۔ معاملات کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے قدرے نرمی سے پوچھا۔ اس کا مخاطب میں تھا۔

''آخر سائیں اور بشریٰ کا معاملہ کیا ہے؟''

''معاملہ بہت سادہ ہے ...... اور آپ اس معاملے میں انجان بننے کی کوشش نہ کریں۔'' میں نے بھی نرمی کا جواب نرمی ہی سے دیا۔ ''تین دن پہلے میرے تھانے کا ایک اے ایس آئی جاوید مغل بھی آپ کے پاس آیا تھا لیکن آپ نے بڑی خوب صورتی سے اسے ٹال دیا۔'' میں نے ایک لمحے کا توقف کیا اور کہا۔ ''چوہدری نور عالم! میں ٹلنے والا نہیں ہوں۔ میرے مطلوبہ بندے آپ کی حویلی ہی سے برآمد ہوں گے اور آپ کی آنکھوں کے سامنے برآمد ہوں گے!''

نور عالم نے پُرتشویش نظر سے باری باری ہم دونوں کو دیکھا پھر مجھ پر نگاہ ٹکا کر بولا۔ ''ہاں، مجھے یاد آ رہا ہے، کوئی اے ایس آئی پوچھتا پاچھتا ادھر آیا تو تھا لیکن میں نے اس سلسلے میں اپنی لاعلمی ظاہر کی تھی ...... اور آپ لوگوں سے بھی معذرت ہی چاہوں گا!''

نور عالم کی ڈھٹائی کے پیش نظر میں نے ملک مبین کی طرف دیکھا۔ اسی نے مجھے یقین دلایا تھا کہ سائیں کو چوہدری نے پناہ دے رکھی ہے۔ ملک مبین نے چوہدری سے کہا۔

''ٹھیک ہے، اگر آپ کا سائیں اور بشریٰ سے کوئی تعلق نہیں تو پھر پریشان کیوں ہو رہے ہیں؟ ہم آپ کی حویلی کی تلاشی لیں گے اور اپنا اطمینان کر کے واپس چلے جائیں گے۔''

''آپ میری حویلی کی تلاشی لیں گے؟'' وہ بے یقینی سے بولا۔

''اس میں حرج ہی کیا ہے!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے ہاتھ صاف ہیں، پر تلاشی پر کیوں معترض ہیں؟ آپ کے انداز سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے......''

''نہیں، نہیں ...... ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''آپ لوگ ذرا بیٹھک ہی میں ٹھہریں، میں ابھی آتا ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

ہم دونوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور ہم بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''چوہدری نور عالم! تمہیں کہیں آنے جانے کی ضرورت نہیں۔ ہم ہیں نا!''

وہ پلٹا اور منافقت بھرے انداز میں بولا۔ ''او بادشاہو! آپ تو خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔ میں تو بیبیوں کو ذرا پردے کا کہنے جا رہا ہوں۔''

PDF LIBRARY 0333-7412793

بات ختم کرتے ہی وہ بیٹھک سے نکل کر حویلی کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا۔

میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ''بیبیوں کے پردے کی بات تو ایک بہانہ ہے۔ چوہدری ادھر کوئی گڑبڑ کرنے گیا ہے۔ وہ سائیں کو کہیں اِدھر اُدھر نہ کر دے۔''

''باہر ہمارے سادہ پوش موجود ہیں۔'' ملک مبین نے کہا۔ ''اگر سائیں نے فرار ہونے کی کوشش کی تو وہ لوگ اسے پکڑ لیں گے۔''

میں نے عمل پر آمادہ لہجے میں کہا۔ ''وہ چھ افراد تو حویلی کے باہر ہیں نا! ہمیں اندر سے کوشش کرنا ہوگی۔ یہ ضروری نہیں چوہدری سائیں کو کسی چور راستے سے باہر ہی نکالے۔ وہ حویلی ہی کے اندر بھی ایسی کسی جگہ چھپا سکتا ہے جہاں تک ہماری نظر کی رسائی نہ ہو۔'' رک کر میں نے اضافہ کیا۔ ''آپ تو کافی سمجھ دار ہیں ملک صاحب! حویلیوں میں تو ایسے پوشیدہ اور ناقابل رسائی مقامات خاص طور پر بنائے جاتے ہیں۔''

اس نے پُر معنی انداز میں سر ہلایا اور بولا۔ ''چوہدری کی واپسی کا انتظار کرنا وقت ضائع کرنے بلکہ موقع گنوانے کے مترادف ہوگا۔ ہمیں فوراً ایکشن میں آنا ہوگا!''

پھر ہم نے پل بھر میں آنکھوں ہی آنکھوں میں لائحہ عمل تیار کیا اور بیدار مغزی کے ساتھ حویلی کے اندرونی حصے میں داخل ہو گئے۔ یہ اگرچہ ایک غیر شریفانہ حرکت تھی تاہم بعض اوقات حالات کا تقاضا ایسی ناشائستہ اور غیر مہذب حرکات پر مجبور کر دیتا ہے۔

ہم دو مختلف زاویوں سے حویلی کے اندونی حصے میں گھسے اور مختلف کمروں اور راہداریوں سے ہوتے ہوئے حویلی کے عقبی حصے میں نکل آئے اور اسی وقت میری نظر ایک ایسے منظر پر پڑ گئی کہ میں چونکے بنا نہ رہ سکا۔ میں نے ایک شخص کو عقبی دیوار پھلانگتے ہوئے دیکھا۔

ریوالور کو میرے ہاتھ میں پہنچنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ ہوئی اور میں نے للکارنے والے انداز میں کہا۔ ''رک جاؤ...... ورنہ گولی مار دوں گا۔''

وہ میری دھمکی میں نہ آیا اور بڑی افراتفری میں دیوار کی دوسری جانب کود گیا۔

میں نے اسی سمت ایک ہوائی فائر کر دیا۔ میں نے مفرور شخص کو نشانہ بنانے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ گولی چلانے کا مقصد یہ تھا کہ حویلی کے عقبی حصے کی نگرانی کرنے والے کانسٹیبلز ریڈ الرٹ ہو جائیں اور بھاگنے والے کے لئے کوئی چانس باقی نہ رہے۔

اس کے بعد میں نے ملک مبین سے کہا۔ ''ملک صاحب! آپ حویلی کے اندر چوہدری سے نمٹیں، اتنی دیر میں، میں باہر کی صورت حال جانچ کر آتا ہوں۔ لگتا ہے میرا شکار ادھر

ہی گیا ہے۔''

ملک مبین نے اثبات میں سر ہلایا اور ریوالور نکال کر دوبارہ حویلی کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے حویلی کے مین گیٹ پر پہنچا اور پھر باہر نکل آیا۔ حویلی کے عقب تک رسائی حاصل کرنے میں مجھے بہ مشکل ایک منٹ لگا ہوگا۔

فرار ہونے والا شخص اپنی وضع قطع اور حلیے سے سائیں کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس وقت وہ دو کانسٹیبلز کے قابو میں تھا۔ میں ان کے نزدیک پہنچا تو ان میں سے ایک نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا۔

''ملک صاحب! اس کمبخت میں کسی سانڈ کی سی طاقت ہے۔ ہمیں تو گھما کر رکھ دیا ہے!''

اس دوران میں دوسرے چار کانسٹیبلز بھی وہاں پہنچ گئے۔ میں نے فوراً سائیں کو الٹی ہتھکڑی لگائی اور اس کے منہ پر ایک زناٹے دار طمانچہ رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''اس نے جتنا گھمانا تھا، گھما لیا۔ اب اس کے گھومنے کی باری ہے...... اور میں تو اس کو ایسا گھماؤں گا کہ......''

میں نے جملہ ادھورا چھوڑا اور اس پیر فرتوت کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بشریٰ کہاں ہے؟''

''کون بشریٰ؟'' اس نے چونکنے کی اداکاری کی۔

میں نے اس کے منہ پر ایک اور تھپڑ مارا اور غصیلے لہجے میں کہا۔ ''تمہاری یادداشت واپس لانے کے لئے تھانے لے جانا پڑے گا۔ ادھر حوالات میں وہ گدھا بھی موجود ہے جس کی بیوی کے بارے میں، میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔''

''پتہ نہیں، آپ کن لوگوں کا ذکر کر رہے ہیں!'' وہ بیزاری سے بولا۔

''میں سلیم اور اس کی بیوی بشریٰ کا ذکر کر رہا ہوں۔'' میں نے زہر بھرے لہجے میں کہا۔ ''وہی میاں بیوی جو تمہارے پڑوسی ہیں اور تم دونوں کو الگ الگ محاذ پر بے وقوف بناتے رہے ہو۔''

اس نے ایک مرتبہ پھر تجاہل عارفانہ سے کام لینا چاہا اور جواباً میں نے وہیں لات مُکا کر کے اس کا حلیہ ٹائٹ کر دیا۔ میرے اس ''سلوک'' پر وہ مجھے بڑی بڑی دھمکیاں دینے لگا۔ وہ مجھے اپنے جلال سے ڈرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

PDF LIBRARY 0333-7412793

میں نے اس کی درگت کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم جب میرا کمال دیکھو گے تو اپنے جلال کو بھول جاؤ گے کم بخت! سیدھی طرح بتا دو، بشریٰ کہاں ہے ورنہ مجھے ادھر ہی تھانہ لگانا پڑے گا۔''

وہ مسلسل پٹتا رہا لیکن بشریٰ کے سلسلے میں اس نے زبان کھول کر نہیں دی۔ شاید وہ اس خوش گمانی میں تھا کہ چوہدری اسے بچالے گا۔ میں اسے دھکیلتے ہوئے حویلی میں لے آیا تا کہ وہ اپنے پشت پناہ کا شاندار حشر دیکھ سکے۔

اس دوران میں ملک مبین نے چوہدری نور عالم پر قابو پالیا تھا۔ اسے باقاعدہ ہتھکڑی تو نہیں لگائی گئی تھی تاہم وہ گرفتاری ہی کی حالت میں تھا۔ حویلی کی تفصیلی تلاشی کے باوجود بھی کہیں سے بشریٰ کا سراغ نہ مل سکا۔ پتہ نہیں اس ذلیل انسان نے ایک بے وقوف شوہر کی حسین اور شاداب بیوی کے ساتھ کیا کیا تھا۔ سائیں کی ناپاک زبان کا زنگ آلود قفل تھانے پہنچ کر ہی کھولا جا سکتا تھا۔

میں نے ملک مبین سے کہا۔ ''ملک صاحب! آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ۔ میرے مطلوبہ افراد میں سے ایک بندہ تو ہاتھ لگ گیا۔ دوسری بندی میں اس کے اندر سے نکال لوں گا۔ آپ اپنے چوہدری صاحب کو سنبھالیں اور مجھے جانے کی اجازت دیں۔''

اس نے تشکرانہ انداز میں کہا۔ ''ملک صاحب! آپ کی وجہ سے مجھے بھی موقع مل گیا ورنہ چوہدری صاحب تو پلّے پر ہاتھ ہی نہیں رکھنے دیتے تھے۔ اب ان کی مزاج پرسی لازمی ہو گئی ہے۔ اس میں تو کسی شک و شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ انہوں نے ایک مجرم کو پناہ دی ہے۔ کسی مجرم کو پناہ دینا اعانت جرم میں شمار ہوتا ہے اور اس کے لئے کڑی سزا بھی قانون کی کتابوں میں رقم ہے!''

چوہدری نور عالم معاندانہ انداز میں ملک مبین کو گھور کر رہ گیا تاہم زبان سے کچھ نہ بولا۔ مجھے یقین تھا ہمارے جانے کے بعد وہ ملک مبین سے سودے بازی کی کوشش ضرور کرتا۔ اب اس کا دارومدار ملک مبین پر تھا کہ وہ کہاں آ کر ٹھہرتا ہے۔ ویسے جتنے خلوص اور جان ماری سے مبین نے ہم سے تعاون کیا تھا اس کے پیش نظر بڑے وثوق سے کہا جا سکتا تھا وہ اصولوں پر سودے بازی نہیں کرے گا۔

میں اپنے ''اسٹاف'' اور سیاہ کرتوت پیر فرتوت کے ساتھ ککر والی سے واپس لوٹ آیا۔ راستے بھر سائیں کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے وہ کوئی عمل کر رہا ہو جس کے نتیجے میں وہ مجھے بھاپ بنا کر اُڑا دے گا یا پھر مکھی بنا کر بس کی

چھت پر بٹھا دے گا۔ اس پراسرار خاموشی کے دوران وہ گاہے بہ گاہے اپنی سرخ آنکھوں سے مجھے گھور بھی لیتا تھا۔ دیکھنے کا انداز ظاہر کرتا تھا جیسے وہ بہ زبانِ خاموشی مجھ سے کہہ رہا ہو...... بچو! مجھ سے ٹکرانے کا انجام بہت بھیانک ہوگا۔

میں سائیں کی ان خاموش دھمکیوں سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا اور بہ خیر و عافیت اسے اپنے تھانے کی حوالات میں پہنچا دیا۔ میں نے ایسے جلالی نقلی بابا بہت دیکھ رکھے تھے جو چرس کے سُوٹے لگا لگا کر اپنی آنکھوں کو سرخ کر لیتے ہیں۔ میں اس قسم کے مسٹنڈوں سے نمٹنا بہ خوبی جانتا تھا۔ میں نے لات جوتے کی مدد سے سائیں کی تھوڑی بہت پیری تو وہیں ککر والی ہی میں ناک کے راستے نکال دی تھی۔ رہی سہی کسر ''تفتیش'' کے دوران نکل جاتی اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ صرف ناک ہی کے راستے نکلے گی۔

حوالدار فیض محمد بہت خوش تھا۔ وہ ہٹے کٹے سائیں کو دیکھ کر مچل گیا۔

''ملک صاحب! اسے ایک رات کے لئے میرے حوالے کر دیں۔ پھر دیکھیں، میں کس طرح اس کی زبان سے بشریٰ کے بارے میں اُگلواتا ہوں۔''

''ماشاء اللہ! اس قسم کے عزائم سے تو تم خاصے جوان لگ رہے ہو۔'' میں نے تیکھے انداز میں کہا۔ ''ورنہ جب بڈ حرامی کا موڈ ہو تو تم بڈھے بابے بن جاتے ہو؟''

وہ خجالت آمیز انداز میں ہنسا اور کہنے لگا۔ ''ملک صاحب! میں بڈھا تو ہو گیا ہوں۔ اسی لئے کہہ رہا ہوں کہ اس آخری حصے میں مجھے سائیں جیسے ''روحانی بزرگ'' کی تھوڑی ''خدمت'' کر لینے دیں۔ ہو سکتا ہے اس طرح میری عاقبت سنور جائے!''

عاقبت سنوارنے کا حق ہر انسان کو حاصل ہے۔ لہٰذا میں نے حوالدار فیض محمد کو ایک پیر فرتوت کی ''مٹھی چاپی'' پر مامور کر دیا۔

اس ''خدمت گزاری'' سے پتہ نہیں حوالدار کی عاقبت سنوری یا نہیں البتہ سائیں کی آخرت ضرور خراب ہو گئی۔ فیض محمد نے رات بھر سائیں کی وہ ''خاطریں'' کیں کہ صبح تک وہ کسی ریکارڈ کی مانند بجنے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔

میں نے اس ننگ انسانیت کا اقبالی بیان نوٹ کیا جس کے مطابق وہ میرے قائم کردہ اندازے پر پورا اترا تھا۔ اس نے اقرار کیا کہ بشریٰ کے ساتھ اپنے معاملات کو آگے بڑھانے کے لئے ہی اس نے سلیم کو قبرستانی چکر میں ڈالا تھا۔ وہ بے قوف یہی سمجھتا رہا کہ سائیں کے بتائے ہوئے عمل سے بشریٰ اس کے قابو میں آ جائے گی اور وہ ''خبیث پیشوا'' اس کی بیوی پر قبضہ مضبوط کرتا گیا۔ بشریٰ کو اس نے اپنی لچھے دار جلالی باتوں میں اس

PDF LIBRARY 0333-7412793

طرح الجھایا کہ وہ ایک ہوس پرست شخص کے ہاتھوں کھلونا بن کر رہ گئی۔

کھلونا، کھیلنے کے لئے ہوتا ہے۔ یہ جس کے ہاتھ میں ہو، وہی اس سے کھیلتا ہے اور بعض اوقات کھیل ہی کھیل میں کھلونے ٹوٹ بھی جایا کرتے ہیں۔ ٹوٹے ہوئے کھلونوں کو کچرے کے ڈھیر پر پھینک دیا جاتا ہے۔

بشریٰ بھی ٹوٹ گئی ......ٹوٹ کر بکھر گئی مگر سائیں نے اپنے جرم کے ثبوت کو کہیں پھینکنے کی بجائے ایک محفوظ جگہ چھپادیا تاکہ کوئی اس کی خباثت سے واقف نہ ہوسکے۔ اگر وہ میرے ہتھے نہ چڑھتا تو شاید بشریٰ کی اکڑی ہوئی لاش خزاں سے پہلے کسی کی نگاہ میں نہ آتی!

میں سائیں کی نشاندہی پر ایک مرتبہ پھر اس کے آستانے پہنچ گیا۔ اس مرتبہ سرکاری فوٹو گرافر بھی میرے ہمراہ تھا۔ ہم نے بانس والی سیڑھی کو چھت سے ہٹا کر نیم کے درخت کے تنے سے لگا دیا۔ پھر گھنے درخت کے اوپری سرے تک پہنچنے میں ہمیں کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا جہاں بشریٰ کی بے حرمت لاش مختلف شاخوں کے بیچ میں اس طرح پھنسائی گئی تھی کہ ازخود اس کے نیچے گرنے کا امکان نہیں تھا البتہ موسم خزاں میں جب پت جھڑ کے بعد وہ درخت ٹنڈ منڈ رہ جاتا تو بشریٰ کا بے گور وکفن لاشہ ہر خاص و عام کی توجہ کا مرکز بن جاتا۔

بشریٰ کی لاش کی دریافت کے بعد بلی کے بین کی حقیقت بھی کھل گئی۔ بلی اور اسی جیسے دوسرے حیوان بہت زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ ان کے حواس حیوانِ ناطق سے کہیں زیادہ طاقت ور ہوتے ہیں اور وہ بہت سی ایسی باتوں کو محسوس کر لیتے ہیں جدھر بھولے سے بھی انسان کا دھیان نہیں جاتا۔ یا تو اس کالی بلی نے سائیں کو وہ مذموم کارروائی کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور جانتی تھی بشریٰ کی ستم رسیدہ لاش کو کہاں چھپایا گیا ہے یا پھر یہ اس کا حیوانی وجدان تھا۔ بہرحال وہ ماتم گری سے بالکل صحیح جانب اشارہ کر رہی تھی۔ اس کی زندگی نے دفانہ کی ورنہ میں اسی رات اس راز تک پہنچ جاتا جب شیخ لطیف کی چھت پر ہم نے مورچا لگایا تھا۔

سائیں نے پانچ تولے سونے کے زیورات اور چھ سو روپے نقدی کی خرد برد کا بھی اقبال کرلیا۔ میں نے مالِ مسروقہ برآمد کر کے بدنصیب سلیم کے حوالے کر دیا۔ بشریٰ تو اس کے ''قابو'' سے بہت دور چلی گئی تھی۔ اسے واپس نہیں لایا جا سکتا تھا لہٰذا میں نے سلیم '' کو ڈانٹ پھٹکار کے بعد آزاد کر دیا۔ وہ اگر حوالات میں بند رہتا تو بشریٰ کی تجہیز و

تکفین کون کرتا!

شیطان کوئی ایک ذات، ایک شخصیت نہیں۔ یہ بدی کی علامت ہے اور یہ اتنا زیادہ ''صاحب اولاد'' ہے کہ ہر گلی کوچے میں اس کی نسل گردش میں ہے۔ یہ ابنِ شیطان بعض اوقات سائیں جیسے جعلی پیر کا روپ دھار لیتا ہے اور سادہ لوح، احمق افراد کو اپنے چنگل میں پھانس کر شیطانیت کا بازار گرم کرتا ہے۔

کاش ہمارے قانون کی کتابوں میں سائیں جیسے معاشرتی ناسوروں کے لئے بھی کوئی ایکٹ درج ہو جائے تاکہ ان کی مجرمانہ سرگرمیوں سے پہلے ہی ان کی سرکوبی ممکن ہو سکے۔

کاش ...... اے کاش!

☼☆☼

PDF LIBRARY 0333-7412793

مرغی انڈا دینا بند کر دے تو مالک کی نظر کا خار بن جاتی ہے۔ اس کا دانہ پانی، دیکھ ریکھ ایک بوجھ سا محسوس ہوتا ہے۔ مالک کی بے اعتنائی اور بیزاری کو دیکھتے ہوئے ڈربے کی دوسری مرغیاں بھی اس سے امتیازی سلوک پر اتر آتی ہیں۔ مالک کی ''شہ'' پر وہ سب مل کر اس کی وہ درگت بناتی ہیں کہ دیکھنے والوں کو عبرت ہونے لگتی ہے۔ پھر ہر گزرتے دن کے ساتھ چھری اور اس کی گردن کے بیچ فاصلہ کم ہوتا چلا جاتا ہے۔

عابدہ بھی کچھ اسی قسم کی صورتِ حال سے دوچار تھی!

کریم نے دھمکی دینے والے انداز میں کہہ دیا تھا۔ ''بس ...... مجھے بچہ چاہئے اور وہ بھی ایک سال کے اندر۔ تمہارے پاس صرف ایک سال کی مہلت ہے۔ اگر تم نے بیٹے کو جنم نہ دیا تو میری طرف سے چھٹی سمجھنا۔ میں تین لفظ بولنے میں ایک لمحے کی دیر نہیں کروں گا۔''

یہی عابدہ اس وقت میرے سامنے بیٹھی زار و قطار رو رہی تھی۔ ''تھانے دار صاحب!'' اس نے فریادی لہجے میں کہا۔ ''آپ ہی بتائیں، میرا قصور کیا ہے۔ میں نے کریم کے گیارہ بچوں کو جنم دیا ہے۔ چھ لڑکیاں اور پانچ لڑکے۔ اب اگر پچھلے دو تین سال سے یہ سلسلہ رک گیا ہے تو اس میں میرا کیا دوش ہے۔ وہ ہر رات میری ہڈیوں کا سُرمہ بناتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے ایک لڑکا اور چاہئے۔ پوری درجن ہو جائے گی تو میں لوگوں کے سامنے فخر سے اپنی مونچھ اونچی کر کے چلوں گا ...... اور مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ بھی ہوگا۔'' اس نے دوپٹے کے پلّو سے اپنے آنسو صاف کئے اور روہانسی آواز میں سلسلۂ فریاد کو جاری رکھتے ہوئے بولی۔

''تھانے دار جی! گیارہ اولادیں پیدا کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ آپ ماشاء اللہ سمجھ دار ہیں۔ ان معاملات کو بڑی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ میں کریم کا لات جوتا کھا کر اس کا مطالبہ پورا کرنے کے لئے اس سے پورا پورا تعاون کرتی ہوں مگر شاید قدرت ہی کو منظور

نہیں کہ میں کوئی اور بچہ پیدا کرسکوں!''

عابدہ نے بڑے مایوسانہ انداز میں بات ختم کی تو میں نے کہا۔ ''اگر قدرت کو منظور نہیں تو اس میں بھی تم لوگوں ہی کی کوئی بھلائی پوشیدہ ہوگی۔ گیارہ بچے ایک بہت بڑی تعداد ہے۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے عابدہ سے پوچھ لیا۔ ''ویسے تمہارا خاوند کرتا کیا ہے؟''

اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے فوراً وضاحت کر دی۔ ''کریم کا ذریعہ آمدنی کیا ہے؟''

دراصل میں یہ جاننا چاہتا تھا، کریم کے پاس گیارہ بچوں کو پالنے کا کیا بندوبست ہے جو وہ بارہویں کے لئے اتنا بے چین ہے۔ یہ ٹھیک ہے جو اولاد دیتا ہے، وہ بچے کے ساتھ ہی اس کا رزق بھی اتارتا ہے۔ لیکن اس رزق کو تلاش کرنے کی ذمے داری تو بہرحال بچے کے والدین ہی کی ہوتی ہے۔

عابدہ نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''کریم سائیکلوں کا مستری ہے جی۔ ادھر لاری اڈے پر اس کی ''کریم سائیکل ورکس'' کے نام سے دکان ہے۔ سائیکلوں کی مرمت کے ساتھ ساتھ وہ کرائے پر سائیکلیں بھی دیتا ہے۔''

مجھے کریم پر بہت غصہ آیا۔ میں نے عابدہ سے پوچھا۔ ''کیا اس کی اتنی آمدنی ہو جاتی ہے کہ تیرہ افراد آرام سے زندگی گزار سکیں؟''

''بس جی، گھر کا چولہا ایک دن بھی نہیں بجھا!'' وہ بے چارگی سے بولی۔

میں نے کہا۔ ''صرف چولہا جلنے سے ہی زندگی نہیں گزرتی۔ انسان کی حیثیت سے زندہ رہنے کے لئے ہمیں اور بھی بہت کچھ چاہئے ہوتا ہے۔ زندگی کے اور بھی تقاضے ہوتے ہیں۔''

''انسان، اونہہ!'' اس نے یہ دو الفاظ بڑے کرب ناک انداز میں ادا کئے تھے۔ ''تھانے دار جی! میری اولادیں تو کتے بلیوں کی طرح پل رہی ہیں۔ ان کی حالت دیکھتی ہوں تو دل خون ہو جاتا ہے، چھپ چھپ کر روتی ہوں لیکن ان کی بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ میں بھی کیا کروں جی۔'' ایک مرتبہ پھر اس کے آنسو جاری ہو گئے۔ ''وہ جیسے بھی ہیں، میرے جگر کے ٹکڑے ہیں۔ میں اپنے ہاتھوں سے ان کا گلا تو نہیں گھونٹ سکتی نا!''

''تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''یہ تو کریم کی ذمے

PDF LIBRARY 0333-7412793

داری ہے۔''

وہ گلوگیر آواز میں بولی۔''اس نے تو مجھے دھمکی دے دی ہے، اگر میں نے ایک سال کے اندر اندر اس کے لئے لڑکا پیدا نہ کیا تو پتہ نہیں میرا کیا حشر ہوگا۔ طلاق کا ڈراوا تو وہ دے ہی چکا ہے۔ میں اس عمر میں کہاں جاؤں گی۔ دنیا میں میرا تو کوئی بھی نہیں۔''

''جس کا کوئی نہیں ہوتا، اس کا خدا ہوتا ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔''تم فکر نہ کرو۔ میں کریم کو تھانے بلا کر اس سے بات کروں گا۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''اللہ کرے جی سب ٹھیک ہو جائے۔'' وہ دل شکستگی سے بولی۔

میں نے تسلی دلاسا دے کر عابدہ کو رخصت کر دیا۔

عابدہ کی عمر لگ بھگ چھتیس سال رہی ہو گی۔ اس کی صحت کا ذکر کرنے کی میں ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ جو عورت گیارہ بچے پیدا کر چکی ہو اس کی صحت اور حالت کا اندازہ بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے حلیے اور شکل سے پینتالیس پچاس کی نظر آتی تھی۔

عابدہ کو رخصت کرنے سے پہلے میں نے اس کے گھریلو حالات کے بارے میں چند سوالات بھی کئے تھے جس کے نتیجے میں مجھے معلوم ہوا اس کی شادی اٹھارہ اُنیس سال کی عمر میں ہو گئی تھی۔ اس وقت کریم بائیس تیئس سال کا تھا۔ شادی کے ایک سال بعد ان کے ہاں بچوں کی لائن لگ گئی۔ پہلے دو لڑکے پیدا ہوئے، اس کے بعد اوپر تلے چھ لڑکیاں تولد ہوئیں جن کی عمریں اس وقت آٹھ سے پندرہ سال کے درمیان تھیں۔ بڑے دو بیٹوں میں فاروق سولہ سال کا اور یوسف سترہ سال کا تھا۔ چھ لڑکیوں کے بعد پھر تین لڑکے پیدا ہوئے جن کی عمریں بالترتیب سات، پانچ اور تین سال تھیں۔ تین سالہ کامران کے بعد پیدائش کا سلسلہ رک گیا ...... اور یہی بات مستری کریم کو پسند نہیں آئی تھی۔

گاؤں دیہات اور چھوٹے قصبہ جات کے اپنے مخصوص مسائل ہوتے ہیں۔ رسوم و روایات بھی شہروں سے قدرے مختلف ہوتی ہیں۔ وہ لوگ تھانے اور تھانے دار کو بہت کچھ سمجھتے ہیں اور بعض اوقات اپنے انتہائی نجی معاملات کو بھی ''تھانے'' کے تعاون سے حل کرنا چاہتے ہیں جیسا کہ عابدہ اپنے خاوند کی نامعقول دھمکی سے گھبرا کر فوراً میرے پاس چلی آئی تھی۔ اس نوعیت کی حرکات کو آپ سادہ لوح افراد کی معصومیت بھی کہہ سکتے ہیں۔ بہر حال ہمارے زمانے میں تھانے کی بہت اہمیت ہوا کرتی تھی۔ لوگ پولیس کا بڑا احترام کرتے تھے اور اپنے دکھوں کے مداوے کے لئے ہمارا دروازہ ضرور کھٹکھٹاتے تھے۔

حفظِ ماتقدم کے طور پر عابدہ نے تھانے سے جاتے ہوئے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں

اس کے شوہر کو یہ نہیں بتاؤں گا کہ بیوی نے اس کے خلاف کوئی شکایت ''درج'' کروائی ہے۔ مجھے یہ وعدہ کرتے ہوئے عابدہ کی حالت پر بہت ترس آیا تھا۔ جس عورت نے اپنے شوہر کے بچے پیدا کر کر کے خود کو ختم کر لیا ہو اس شوہر کو تو ایسی عورت کے ہر دکھ، تکلیف کا خیال رکھنا چاہئے کجا یہ کہ وہ بدنصیب کسی وحشت زدہ ہرنی کی مانند سہمی ہوئی تھی۔

میں نے اسی روز شام کے وقت ایک کانسٹیبل کو لاری اڈے بھیج کر کریم مستری کو تھانے بلا لیا۔

کریم چالیس سال کا ایک گول مٹول اور پستہ قامت شخص تھا۔ اس نے کام والے کپڑے پہن رکھے تھے جن پر جا بجا تیل اور گریس کے دھبے دکھائی دیتے تھے۔ وہ اس بلاوے پر حیران سے زیادہ پریشان نظر آتا تھا۔ کانسٹیبل اسے میرے کمرے میں چھوڑ کر چلا گیا تو میں نے سرتاپا اس کا جائزہ لینے کے بعد کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کریم! پتہ ہے میں نے تمہیں تھانے کیوں بلایا ہے؟''

اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بولا۔''نہیں جناب! میں نے تو کوئی ایسا ویسا جرم بھی نہیں کیا!''

''ایسا ویسا نہ سہی مگر تم نے جیسا تیسا جرم ضرور کیا ہے۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔''اور میں نے تمہارا انٹرویو کرنے کے لئے بلایا ہے۔''

''انٹرویو!'' وہ بھونچکا نظر سے مجھے دیکھ کر رہ گیا۔

میں نے اس کے استعجاب کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔''کریم! تمہارے بچے کتنے ہیں؟''

''گیارہ جناب!'' اس نے بتایا۔ تاہم اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ میں نے یہ سوال کیوں کیا ہے۔''آپ میرے بچوں کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''اوئے نامعقول! کیا تمہیں اتنا بھی پتہ نہیں، انٹرویو میں سوالات ہی کئے جاتے ہیں۔'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔''تمہاری کسی بھی چیز کے بارے میں پوچھا جاسکتا ہے ...... اور ہاں، اب بیچ میں کوئی اعتراض نہ اٹھانا ورنہ میں تمہیں کریم ردل یا آئس کریم ضرور بنا دوں گا۔ ویسے اپنے قد کاٹھ اور جسامت سے تم کسی بیوٹی کریم کی بنی بنائی شیشی ہو۔ مجھے تم پر زیادہ محنت نہیں کرنا پڑے گی!''

پستہ قامتی کے ساتھ ہی وہ مائل بہ فربہی بھی تھا۔ اگر قد قامت اچھی ہوتی تو اس کی فربہی چھپ جاتی لیکن پانچ فٹ دو اونچ قد نے اس اوسط موٹاپے کو زیادہ نمایاں کر دیا تھا۔

PDF LIBRARY 0333-7412793

میں نے اسے ایک مناسب ڈانٹ پلائی تو وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''تم نے شادیاں کتنی کی ہیں؟''

اس زمانے میں عموماً دو تین شادیاں کر لی جاتی تھیں اور خانگی سطح پر زیادہ بگاڑ بھی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اکثر گھروں میں تو دو یا تین اور بعض اوقات چاروں کی چاروں بیویاں ایک ہی چھت تلے زندگی بسر کرتی تھیں۔ یہ شاید اس لئے بھی ممکن تھا کہ اس وقت معاشی مسائل نے انسان کے لئے کسی عفریت کی شکل اختیار نہیں کی تھی۔ مگر آج کل صورتِ حال قطعی مختلف ہے۔ دلوں اور جیبوں میں اتنی گنجائش نہیں رہی کہ کوئی مرد دوسری شادی کے بارے میں سوچ بھی سکے۔ ایک ہی اگر ''عزت'' سے نبھ جائے تو اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا جاتا ہے۔ انسان بڑے زور و شور سے ترقی کا دعوے دار ہے۔ اگر یہی ترقی ہے تو پھر یہ بڑی معکوس ہے! ترقی تو وہ ہے جو مسائل کو ختم کر کے زندگی کو آسان بنائے۔

کریم میرے سوال پر تھوڑا چونکا اور بولا۔ ''صرف ایک جناب!''

اس کے بارے میں عابدہ سے مجھے تمام معلومات حاصل ہو چکی تھیں تاہم میں اس سے محض چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا تاکہ اس موضوع پر لتاڑ پھٹکار کے لئے اسے تیار کیا جا سکے۔ میں نے قدرے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں تو سمجھ رہا تھا اتنی اولادیں دو تین بیویوں میں سے ہوں گی!''

''میں اتنا خوش قسمت کہاں تھانے دار صاحب!'' اس نے حسرت بھرے انداز میں کہا۔

میں نے اس کی دھلائی شروع کر دی۔ ''اگر تم خوش قسمت نہیں ہو تو اپنی اولاد کی قسمت کا کباڑا کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہو؟''

''میں نے کیا، کیا ہے جناب؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''تم گیارہ زندگیوں کو اس دنیا میں لائے ہو اور بارہویں زندگی کو لانے کی کوشش میں ہو اور اس طرح کوشش میں ہو کہ اگر اس مرتبہ تمہاری بیوی نے لڑکا پیدا نہ کیا تو تم اسے طلاق دے دو گے!''

وہ ہکا بکا مجھے تکے چلا گیا۔ میں نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ نامعقول خیالات تم اس عورت کے لئے رکھتے ہو جس نے اپنی ساری زندگی تمہیں اور تمہاری اولاد کو دے دی۔ کیا اس دیرینہ رفیق کی خدمت اور محبت کا یہی صلہ ہے؟''

''یہ ...... یہ طلاق والی بات آپ کو کس نے بتائی ہے؟'' وہ سٹپٹائے ہوئے لہجے میں

بولا۔ ''کیا عابدہ نے کوئی شکایت کی ہے؟''

میں نے برہمی سے کہا۔ ''اس بے چاری نے آج تک تم سے کوئی شکایت کی ہے جو وہ مجھ سے آ کر کچھ کہتی۔ میں نے تو اُڑتے اُڑتے تمہارے بارے میں سنا ہے اور کیا تمہیں پتہ نہیں، میں اس علاقے کا تھانے دار ہوں۔ ایک ایک گھر کی خبر رہتی ہے مجھے۔ تھانے داری کوئی ابا جی کا کاروبار نہیں!''

''وہ جی ...... وہ جی......'' وہ ہکلایا۔ میرے انداز نے اسے بوکھلا دیا تھا۔ ''میں تو صرف یہی چاہ رہا تھا، ذرا توازن قائم ہو جائے۔ دیکھیں نا جی چھ بچیاں ہیں تو بچے بھی چھ ہی ہونے چاہئیں۔''

بچے اور بچیوں سے اس کی مراد لڑکے اور لڑکیاں تھی۔ میں نے ڈانٹ آمیز انداز میں کہا۔ ''تم کیا گھر کے اندر میزان لئے بیٹھے رہتے ہو؟ تم کون ہوتے ہو یہ ناپ تول کرنے والے۔ جو اس دنیا میں آ چکے ہیں ان کی بہتری کے لئے سوچو اور خواہ مخواہ گھر والی کو ہراساں نہ کرو۔ اگر اب مجھے پتہ چلا کہ تم نے عابدہ کو تنگ کیا ہے یا اسے طلاق کی دھمکی دے رہے ہو تو میں ایک لمحے کا آسرا نہیں کروں گا۔ تم میرے تھانے کی حوالات میں نظر آؤ گے۔ سمجھ گئے؟''

پتہ نہیں وہ میری بات کو سمجھا یا نہیں تاہم اس نے اپنی گردن کو اتنی صحت مند اثباتی جنبش دی جیسے میری نصیحت اس کی سمجھ کی تہہ میں اتر گئی ہو۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اسے رخصت کر دیا۔

آئندہ چند روز تک امن و امان کی صورتِ حال رہی۔ عابدہ نے کسی قسم کی کوئی شکایت کی اور نہ ہی کریم کی کسی اور زیادتی کی خبر ملی۔ میں یہی سمجھا کہ کریم کو عقل آ گئی ہے اور اس نے میری نصیحت پا کر اپنی زندگی کی ساتھی کو ایک انسان تسلیم کر لیا ہے۔ یہ نتائج خوش آئند تھے لہٰذا میں مطمئن ہو گیا۔ کچھ دن بعد میں عابدہ اور کریم کو بھول گیا۔ تھانے میں جس قسم کے خطرناک اور سنسنی خیز معاملات جاری رہتے ہیں ان میں یہ معمولی سا گھریلو تنازع کیا اہمیت رکھتا تھا!

میں نے شروع میں جس معاملے کو معمولی تنازع سمجھ لیا تھا وہ بعد میں ایک بہت بڑا بکھیڑا بن کر سامنے آیا۔ عابدہ کی شکایت کے کوئی ایک ماہ بعد وہ دونوں میاں بیوی اپنے بیٹے یوسف کے ساتھ میرے پاس آئے۔ مجھے جب ان کی آمد کا پتہ چلا تو میں نے فوراً انہیں اپنے کمرے میں بلا لیا۔

PDF LIBRARY 0333-7412793

وہ تینوں اس وقت سخت پریشان دکھائی دیتے تھے۔ میں نے انہیں بیٹھنے کو کہا پھر کریم کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''کیوں بھئی! تمہارا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے؟''

کریم کی بجائے عابدہ بول اٹھی۔ ''تھانے دار جی! ہم کل سے بہت پریشان ہیں۔''

''وہ تو تمہاری شکلوں ہی سے نظر آ رہا ہے۔'' میں نے باری باری ان تینوں کی طرف دیکھا پھر عابدہ پر نگاہ جما دی۔ ''کیا پریشانی ہے تم لوگوں کو؟''

''فاروق کہیں چلا گیا ہے۔'' وہ روہانسی آواز میں بولی۔

فاروق ان کے دوسرے نمبر والے بیٹے کا نام تھا۔ وہ یوسف سے چھوٹا تھا اور کسی کام کاج کا نہیں تھا۔ میری معلومات کے مطابق وہ دن بھر آوارہ گردی میں مصروف رہتا تھا۔ صبح کا نکلا رات گئے ہی گھر لوٹتا۔ جب کہ یوسف قدرے مختلف مزاج کا لڑکا تھا۔ وہ دن بھر دکان میں باپ کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ فاروق کی عمر سولہ سال تھی۔ وہ یوسف سے صرف ایک سال چھوٹا تھا۔

میں نے عابدہ سے پوچھا۔ ''وہ آوارہ گرد کہاں چلا گیا ہے؟''

''اگر ہمیں پتہ ہوتا تو پھر پریشانی کس بات کی تھی؟'' کریم نے کہا۔ ''وہ کل رات سے گھر نہیں آیا اور آج کی رات بھی گزر گئی۔''

منتشر الذہنی کے باعث وہ اپنی بات کی وضاحت نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ اس کا بیٹا فاروق چار مئی کو صبح کا گھر سے نکلا ابھی تک واپس نہیں لوٹا تھا اور آج چھ مئی تھی۔ میں نے کریم سے پوچھا۔

''کیا وہ اس سے پہلے بھی کبھی اس طرح بتائے بغیر غائب ہوا ہے؟''

اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بولا۔ ''یہ پہلی مرتبہ ہوا ہے ورنہ چاہے دیر ہی سے سہی وہ رات کو گھر واپس آ جاتا ہے۔''

''تم نے اس کے یار دوستوں سے پوچھا؟''

''جی، کل کا پورا دن ہم فاروق کو تلاش کرتے رہے ہیں۔'' کریم نے بتایا۔ ''ہر طرف دیکھ لیا مگر اس کا سراغ نہیں ملا۔ لگتا ہے وہ اس علاقے ہی میں نہیں ہے۔''

''تم ان لڑکوں کے نام تو جانتے ہو گے جن کے ساتھ اس کا زیادہ اٹھنا بیٹھنا تھا؟''

کریم نے فرید، سلطان اور مطلوب کے نام گنوائے اور بولا۔ ''اس کا زیادہ میل جول انہی لڑکوں سے تھا۔ میں نے سب کو چیک کر لیا ہے اور ان تمام کے گھر والوں سے بھی پوچھ پرتیت کر لی ہے لیکن فاروق کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں۔''

''ہوں! تم نے انہیں چیک کر لیا، میں بھی کروں گا۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''تمہارے قریبی رشتے دار کہاں کہاں رہتے ہیں؟''

''ہمارے زیادہ رشتے دار نہیں ہیں۔'' کریم نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔ ''فاروق کی ایک پھوپھی لاہور میں رہتی ہے۔ ادھر سمن آباد میں میرے بہنوئی فضل محمود کی فروٹ کی دکان ہے۔''

''ہو سکتا ہے فاروق لاہور کی طرف نکل گیا ہو۔'' میں نے ایک امکان کی طرف اشارہ کیا۔

''آج تک ایسا ہوا تو نہیں۔'' وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''جو کبھی نہ ہوا ہو وہ ہو بھی تو سکتا ہے۔ بہرحال تم لوگ لاہور والوں سے رابطہ کر کے فاروق کے بارے میں پوچھو، میں یہاں اور آس پاس اسے تلاش کرواتا ہوں۔ انشاء اللہ تمہارا بیٹا مل جائے گا۔ زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''پریشان کیسے نہ ہوں تھانے دار جی!'' عابدہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ''جوان جہان بیٹا اچانک غائب ہو جائے تو ماں کو کہاں سکون آتا ہے۔ میں فاروق کے لئے بہت بے چین ہوں۔''

میں عابدہ کے درد کو سمجھ رہا تھا۔ قدرت نے ماں کے دل میں بڑے عجیب جذبات و احساسات بھرے ہیں۔ اس ہستی کی محبت کا جداگانہ انداز ہے جسے سمجھنا اولاد کے بس کی بات نہیں۔ یہ اپنی مامتا کے ہاتھوں مجبور ہوتی ہے۔ کسی ماں کی چاہے ایک ہزار اولادیں بھی کیوں نہ ہوں وہ ہر ایک کے دکھ اور تکلیف کو برابر محسوس کرتی ہے۔ محسوسات کا یہ توازن انصاف کی ایک عمدہ مثال ہے اور بے شک انصاف کرنا دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ شاید اسی لئے ماں کے قدموں تلے جنت کی بشارت پوشیدہ ہے۔

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔ ''تین مئی کی رات گھر میں کسی قسم کا کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا تھا؟''

میرے نزدیک تین مئی کی رات اور چار مئی کی صبح زیادہ اہم تھی۔ فاروق رات کو دیر سے گھر لوٹتا تھا اور اگلی صبح پھر نکل جاتا۔ میرے سوال پر میاں بیوی نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور کریم جلدی سے بولا۔

''نہیں جی...... ایسی تو کوئی بات نہیں!''

میں نے واضح طور پر محسوس کیا وہ غلط بیانی سے کام لے رہا تھا۔ میں نے عابدہ کی

PDF LIBRARY 0333-7412793

آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''اور چار مئی کی صبح کو؟''

عابدہ کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے وہ مجھے بہت کچھ بتانا چاہ رہی ہو لیکن کسی دشواری کے باعث اس کی زبان ساتھ نہ دے رہی ہو، کوئی مصلحت بیان کے آڑے آرہی ہو۔ میں مسلسل اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا لہٰذا جواب دینا ضروری تھا۔ وہ ڈنڈی مارتے ہوئے لکنت زدہ لہجے میں بولی۔

''نن...... نہیں...... گھر میں تو سب ٹھیک ٹھاک ہے......''

عابدہ اور کریم کے ردِعمل نے مجھے باور کرا دیا کہ ضرور کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔ اس کا مطلب تھا، تین مئی کی رات یا چار مئی کی صبح ان کے گھر میں کوئی ایسا واقعہ پیش آیا تھا جس کے نتیجے میں فاروق گھر سے غائب ہوگیا تھا اور یہ دونوں میاں بیوی اس واقعے کو مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا عابدہ کا ردِعمل کریم کی کسی خاص ہدایت کا عکاس تھا۔

میں تھوڑی دیر تک انہیں خاموشی سے گھورتا رہا پھر عابدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم اپنے بیٹے یوسف کے ساتھ باہر برآمدے میں جا کر بیٹھو۔ میں کریم سے تنہائی میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور خاموشی سے میرے حکم کی تعمیل کر دی۔

یہ میری ایک چال تھی۔ میں عابدہ کی زبان کھلوانے کے لئے کریم کو چکر دے رہا تھا۔ میں اس سے پانچ منٹ تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا پھر گفتگو کو ایک خاص زاویے پر موڑ لیا اور کرید کرید کر اس سے پوچھنے لگا کہ کہیں فاروق کا کسی لڑکی وغیرہ سے تو کوئی چکر نہیں تھا یا وہ کہیں شادی وغیرہ کے لئے ضد کر رہا ہو! یہ ساری باتیں میں وقت گزاری کے لئے کر رہا تھا تاکہ کریم کو کسی قسم کا کوئی شک نہ گزرے۔

اس نے میرے حسب توقع جواب دیا کہ فاروق ایسے کسی معاملے میں ملوث نہیں تھا۔ یہ اس کی ذاتی معلومات تھیں۔ ویسے ان دنوں باپ بیٹے میں بڑی دوریاں حائل تھیں!

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے...... اب تم باہر جا کر بیٹھو اور عابدہ کو اندر بھیج دو۔''

''تھانے دار جی! ہم میاں بیوی ادھر آپ کے پاس ہی بیٹھے ہیں۔'' کریم نے منت ریز لہجے میں کہا۔ ''آپ یوسف کو جانے کی اجازت دے دیں تاکہ وہ ادھر لاری اڈے جا کر دکان تو کھول سکے۔ کل کا پورا دن بھی دکان بند رہی ہے۔''

وہ تینوں میرے احکام پر تھانے نہیں لائے گئے تھے لہٰذا میں نے کریم کی فرمائش پوری

کرتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے...... پہلے تم یوسف ہی کو میرے پاس بھیجو۔ میں اسے فارغ کر دیتا ہوں۔ جب وہ میرے کمرے سے نکل جائے تو تم اسے لاری اڈے روانہ کر دینا اور عابدہ کو ادھر بھیج دینا۔''

وہ مجھے سلام کر کے کمرے سے نکل گیا۔

یوسف کو میں نے پانچ منٹ میں نمٹا دیا اور پھر عابدہ کی آمد پر میں اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔ پہلے میں نے اس سے اسی قسم کے سوالات کئے جیسے کریم سے پوچھے تھے اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی کر دی کہ باہر جا کر کریم کے سامنے وہ اپنے بیان کو یہیں تک محدود رکھے تاکہ اس کی چمڑی اور ہڈیاں سلامت رہیں۔ وہ میری بات کو سمجھ گئی اور بولی۔

''اس کا مطلب ہے آپ نے کوئی خاص بات پوچھنے کے لئے مجھے بلایا ہے؟''

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اور تم جانتی ہو وہ خاص بات کیا ہو سکتی ہے!''

''آپ کا اشارہ اس رات والے جھگڑے کی طرف ہے نا؟'' عابدہ نے کہا۔

''تم بڑی عقل مند ہو۔'' میں نے سراہنے والے لہجے میں کہا۔ ''اب مزید سمجھ داری کا ثبوت دو اور مجھے بتاؤ تین مئی کی رات کو تمہارے گھر میں کیا واقعہ پیش آیا تھا؟'' رات کا حوالہ دے کر اس نے چار مئی صبح کی خود ہی تردید کر دی تھی لہٰذا مجھے آسانی ہوگئی۔ اس کے مزید اطمینان کے لئے میں نے کہا۔ ''تم بے فکر رہو...... یہ باتیں صرف تمہارے اور میرے درمیان رہیں گی۔ کریم کو ان کی ہوا بھی نہیں لگے گی۔ وہ پوچھے تو وہی بتانا جس کی میں نے تمہیں ہدایت کی ہے۔''

اس کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا اور پھر اس نے مجھے پورا واقعہ سنا دیا۔ میں یہاں اس کا خلاصہ بیان کرتا ہوں۔ عابدہ کے مطابق جب سے میں نے کریم کو تھانے بلا کر ڈانٹ ڈپٹ کی تھی، وہ خاصا سیدھا ہوگیا تھا لیکن وہ مسلسل اس کرید میں بھی تھا کہ آخر تھانے دار کو ان کے گھریلو معاملات کے بارے میں کس نے بتایا۔ اسے عابدہ پر شک تھا اور اس شک کا اظہار وہ اٹھتے بیٹھتے کرتا رہتا تھا۔ عابدہ کے پیہم انکار سے برہم ہو کر تین مئی کی رات اس نے گھر میں اچھا خاصا ہنگامہ کر ڈالا۔ اس نے عابدہ کو بے دریغ کوٹا اور اس کے ساتھ ہی فاروق کو بھی بہت برا بھلا کہا۔ اسے فاروق سے ایک بڑی شکایت یہ تھی کہ وہ کام دھندے میں اس کا ہاتھ نہیں بٹاتا تھا اور اس موقع پر تو فاروق ماں کا حمایتی بن کر باپ کے سامنے کھڑا ہوگیا تھا۔

PDF LIBRARY 0333-7412793

فاروق کے اس جرأت مندانہ اقدام سے پیشتر کریم نے اپنی بیوی کو جو مار لیا، سو مار لیا۔ بعد میں وہ عابدہ کو ہاتھ بھی نہ لگا سا۔ اسی ہیجم بیچ میں باپ بیٹے کے درمیان اچھی خاصی ہاتھا پائی بھی ہوگئی اور ایک مرحلے پر کریم نے اسے دھکا دے کر پرے پھینک دیا تھا۔ یوسف اس دوران میں زبانی کلامی اس جھگڑے کو ختم کروانے کی تگ و دو میں مصروف رہا تھا۔ بہرحال وہ رات جیسے تیسے گزر گئی، اگلی صبح فاروق حسب معمول گھر سے نکلا ...... اور پھر واپس نہ آیا۔

میں نے مزید چند سوالات کے بعد عابدہ کو فارغ کر دیا اور ان میاں بیوی کو تھانے سے جانے کی اجازت دے دی، اس وعدے کے ساتھ کہ میں ان کے جوان جہان بیٹے کو تلاش کرنے کی اپنی سی پوری کوشش کروں گا۔

میں نے یہ کوشش کی بھی مگر مجھے فاروق کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ میں نے فرید، سلطان اور مطلوب کو تھانے بلا کر انہیں اچھی طرح گھسا اور مانجھا۔ اس گاؤں اور آس پاس کے دیہات میں بھی بندے دوڑائے تاکہ فاروق کو ڈھونڈ نکالیں لیکن میری یہ تمام تر کوشش سعی لاحاصل میں ڈھل گئی۔ کریم نے اپنے طور پر سمن آباد سے بھی پتہ کروا لیا۔ فاروق وہاں بھی نہیں پہنچا تھا۔ گاؤں کا کوئی اور لڑکا یا لڑکی بھی غیر حاضر نہیں تھی جو ایک خاص انداز میں سوچا جاتا!

ایک ہفتے کی تگ و دو کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ فاروق اپنے گھریلو حالات سے دل برداشتہ ہو کر کہیں نکل گیا تھا۔ کہاں؟ اس بارے میں اس نے اپنے دوستوں کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو میں فرید، سلطان اور مطلوب سے اُگلوا لیتا۔ میں نے پوچھ تاچھ کے دوران میں ان پر اچھی خاصی سختی بھی کی تھی۔

ٹین ایج کو اگر انگریز نے خطرناک عمر قرار دیا ہے تو اس حقیقت کو ماننا پڑے گا۔ کسی قسم کے تعصب، اختلاف یا ناپسندیدگی سے قطع نظر انگریز کی عقل مندی، دور اندیشی اور موقع شناسی سے انکار ممکن نہیں!

فاروق سولہ سال کا تھا اور عمر کا یہ حصہ بہت ہی لا ابالی اور جذباتی ہوتا ہے۔ والدین کے مابین پائی جانے والی ناچاقی اس سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ پھر اس افلاس زدہ خاندان پر گیارہ بہن بھائیوں کا بوجھ! ان عوامل نے پتہ نہیں اس کے ذہن کی کیا حالت کر دی ہو۔ جب کہ وہ کچھ کماتا دھماتا بھی نہیں تھا۔ یہ بنے بنائے ایسے حالات تھے جن سے تنگ آ کر کوئی بھی لڑکا گھر چھوڑ کر جا سکتا تھا۔ فاروق بھی انہی زہر آلود حالات کا شکار ہو گیا تھا۔

بہرحال میں نے ہمت نہ ہاری۔ جلد یا بدیر اس کا سراغ ملنا ہی تھا۔ میں نے اپنی دیگر پیشہ ورانہ مصروفیات کے ساتھ ساتھ فاروق کی تلاش میں بھی ''گھوڑے'' دوڑائے رکھے اس امید پر کہ کوشش کبھی بے نتیجہ نہیں ہوتی۔

※☆※

پندرہ مئی کی رات میں عشاء کی نماز سے فارغ ہوا ہی تھا کہ میرے کوارٹر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں علی الصباح اٹھنے کا عادی ہوں لہٰذا رات کو بھی جلدی بستر پر چلا جاتا ہوں۔ اگر کسی ایمرجنسی میں مصروف نہ ہوں تو رات کا کھانا میں عشاء کی نماز سے قبل کھا لیتا ہوں۔

میں نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک کانسٹیبل کھڑا تھا۔ میں نے اسے سوالیہ نظر سے دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا بات ہے فدا! تم اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟''

''سر جی! کسی نے مستری کریم کو قتل کر دیا ہے۔'' کانسٹیبل نے بتایا۔

میں چونک اٹھا اور استفسار کیا۔ ''تم سائیکلوں والے مستری کی بات کر رہے ہو؟''

''جی ہاں۔'' اس نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔ ''وہی جناب جس کا لڑکا ایک ہفتہ پہلے گم ہو گیا تھا۔ تھانے میں مستری کریم کی بیوی بیٹھی ہے۔ آپ جلدی سے آ جائیں۔''

کانسٹیبل کی اطلاع بڑی سنسنی خیز تھی اور ظاہر ہے وہ دروغ گوئی نہیں کر رہا تھا۔ عابدہ ہی نے تھانے آ کر اسے بتایا تھا۔ میں نے کانسٹیبل سے کہا۔ ''ٹھیک ہے ...... تم چلو، میں آ رہا ہوں۔''

میں نے یونیفارم کا تکلف ضروری نہ جانا اور پانچ منٹ بعد سادہ لباس ہی میں تھانے پہنچ گیا۔ پھر میرے حکم پر عابدہ کو میرے کمرے میں بھیج دیا گیا۔ وہ اپنے سات سالہ بیٹے نوید کے ساتھ تھانے آئی تھی۔

عابدہ کی حالت بڑی افسوس ناک تھی۔ اسے بات کرنے میں بڑی مشکل پیش آ رہی تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے مسلسل جاری تھے۔ میں نے کوشش کر کے اس سے پوچھ لیا کہ کریم کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ آج شام کسی نے کریم کو دکان میں قتل کر دیا تھا۔

میں نے اے ایس آئی جلال دین کو ساتھ لیا اور جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔

کریم کی سائیکلوں والی دکان لاری اڈے کے قریب تھی۔ مذکورہ دکان ایک نیچی چھت

PDF LIBRARY 0333-7412793

والے کمرے پر مشتمل تھی۔ روڈ اور اس کمرے کے درمیان اچھی خاصی جگہ خالی پڑی تھی جس کا بیشتر حصہ کریم ہی کے استعمال میں تھا۔ وہ دکان کے سامنے اپنے آلات پھیلا لیتا اور اس سے آگے وہ سائیکلیں ایک قطار میں کھڑی ہوتیں جنہیں وہ کرائے پر چلاتا تھا۔ کمرے کو درحقیقت سامان رکھنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ دکان بند کرتے وقت وہ تمام سائیکلوں کو کمرے میں رکھ دیتا اور باہر سے تالا لگا کر گھر چلا جاتا۔

جب میں اس کی دکان پر پہنچا تو رات کے دس بج رہے تھے۔ دکان کے اندر اندھیرا تھا لہٰذا کارروائی کے لئے ٹارچ اور لالٹین کا استعمال کرنا پڑا۔ اسی دوران میں میری ہدایت پر اے ایس آئی، لاری اڈے سے ایک ویگن والے کو پکڑ لایا۔ مذکورہ ویگن کی ہیڈ لائٹس نے ہمارا کام اور آسان کر دیا۔

کریم کی لاش دکان کے اندر پڑی تھی۔ اس کی گردن پر سائیکل والی ٹیوب کو کس کر باندھا گیا تھا۔ گرہ اتنی مضبوط تھی کہ حلقوں سے اس کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں۔ قاتل نے بڑی وحشت اور بربریت کا مظاہرہ کیا تھا۔ کریم کو دیکھ کر ایک نظر میں اندازہ ہو گیا کہ وہ اب اس دنیا کا باسی نہیں رہا تھا۔

لاش کے تفصیلی معائنے کے بعد یہ انکشاف بھی ہوا کہ کریم کے سر میں کسی آہنی شے سے ایک خطرناک چوٹ بھی لگائی گئی تھی۔ کھوپڑی کا متاثرہ حصہ کھل گیا تھا اور وہاں سے اچھا خاصا خون بھی خارج ہوا تھا۔ تھوڑی تلاش کے بعد میں اس آہنی شے کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا جس کی شدید ضرب نے کریم کی کھوپڑی کو چٹخا دیا تھا۔

وہ سائیکل میں ہوا بھرنے والا پمپ تھا جس کے نچلے حصے پر سر کے بال اور خون کے دھبے موجود تھے۔ ان چند بالوں اور خون کا تعلق یقیناً مقتول کریم ہی سے تھا۔ لیبارٹری رپورٹ اس کی تصدیق کر سکتی تھی۔ اس وقت میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ کریم کی موت سر میں لگنے والی چوٹ سے واقع ہوئی تھی یا گردن گھٹنے سے اس کی سانس کا سلسلہ منقطع ہوا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ہی اس حقیقت کو بے نقاب کر سکتی تھی۔

میں نے جائے واردات یعنی اس کمرے کا تفصیلی معائنہ کی۔ ایک دیوار کے ساتھ بڑی ترتیب سے چار سائیکلیں کھڑی تھیں۔ سائیکل مرمت کا سامان اور دیگر اوزار بھی نظر آ رہے تھے۔ لکڑی کا ایک بڑا سا بکس ایک کونے میں رکھا تھا۔ غالباً وہ ٹول بکس کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ایک دیوار پر نصب مختلف کھونٹیوں پر نئے اور پرانے ٹائر ٹنگے دکھائی دیتے تھے۔ الغرض پوری ''دکان داری'' موجود تھی لیکن دکان دار اب دکان داری کے قابل رہا تھا

اور نہ ہی وہ کسی بیمار سائیکل کا ''علاج'' کر سکتا تھا۔ اسے موت نامی لاعلاج مرض نے زندگی کے بکھیڑوں سے آزاد کر دیا تھا۔

میں نے جائے وقوعہ کا تفصیلی نقشہ تیار کیا اور کارروائی مکمل کرنے کے بعد کریم کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے ڈسٹرکٹ ہسپتال بھجوا دیا۔ اس موقع پر کریم کا بڑا بیٹا یوسف موجود تھا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ رکھا اور ابتدائی پوچھ گچھ شروع کر دی۔ عابدہ کو میں نے گھر روانہ کر دیا تھا اور کہا تھا، یہاں سے فارغ ہونے کے بعد میں سیدھا اس کے پاس پہنچوں گا اور اس سے ضروری سوالات کروں گا۔ وہ بے چاری چھوٹے بیٹے کے ساتھ خواہ مخواہ اِدھر اُدھر خوار ہوتی پھر رہی تھی۔

وہ اگرچہ گرمیوں کا موسم تھا لیکن اس وقت رات کے گیارہ بجنے والے تھے اس لئے لاری اڈے کی رونق ماند پڑ چکی تھی۔ اِکا دُکا دکانوں کے سوا باقی سب بند تھیں۔ مقتول کریم کی دکان کی ایک جانب چائے والے کا کھوکھا تھا اور دوسری طرف پھل والے کی دکان تھی اور اس وقت وہ دونوں بند تھیں۔ لاری اڈے پر پوچھ پڑتال سے کام کی کوئی بات معلوم نہ ہو سکی۔ میں نے کریم کی دکان کو تالا لگوایا اور یوسف کے ساتھ اس کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

راستے میں یوسف کی زبانی مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ کچھ اس طرح تھیں۔ یوسف اس دکان پر اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ دکان صبح آٹھ بجے کھلتی اور شام چھ بجے بند کر دی جاتی یا زیادہ سے زیادہ ساڑھے چھ بجے تک وہاں تالا لگ جاتا۔ کریم کا کہنا تھا کہ مغرب کی اذان سے پہلے اپنے کاروبار کو سمیٹ لینا چاہئے۔

دکان کھولنے کی ذمے داری یوسف کی تھی۔ مقتول کریم لگ بھگ نو بجے دکان پر پہنچتا تھا۔ شام کو یوسف اپنے باپ سے پہلے نکل جاتا اور دکان کریم بند کرتا۔ اس روز بھی یوسف اپنے معمول کے مطابق ساڑھے پانچ بجے دکان سے چلا گیا تھا اور اس وقت تک اس کا باپ کریم دکان میں زندہ سلامت تھا۔ اس کا یہی مطلب تھا اسے ساڑھے پانچ بجے کے بعد قتل کیا گیا تھا۔

میں نے یوسف سے پوچھا۔ ''کیا تمہارے باپ کی کسی سے دشمنی وغیرہ بھی تھی؟''

''اس کے پاس دوستی اور دشمنی کے لئے وقت ہی کہاں تھا۔'' تھوڑی دیر سوچنے کے بعد وہ خیال افروز لہجے میں بولا۔ ''ابا دن بھر دکان میں مصروف رہتا اور یہاں سے جانے کے بعد اس کا سارا وقت گھر میں گزرتا تھا۔''

PDF LIBRARY 0333-7412793

میں نے کہا۔ ''یوسف! تم ماشاء اللہ سمجھ دار ہو۔ تمہارے باپ کو جس طرح موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے قاتل اس کے لئے اپنے دل میں بے پناہ نفرت رکھتا تھا۔ اس نے نہ صرف کریم کے سر پر ایک خطرناک وار کیا بلکہ سائیکل کی ٹیوب کی مدد سے بے دردانہ انداز میں اس کا گلا بھی گھونٹ ڈالا۔ کوئی بھی شخص ایسی وحشیانہ کارروائی خواہ مخواہ نہیں کرسکتا۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں تھانے دار صاحب!'' وہ افسردہ انداز میں سر جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''میں اس وقت بہت پریشان ہوں ...... سمجھ میں نہیں آرہا یہ سب کیا اور کیسے ہوگیا!''

یوسف کی پریشانی بجا تھی۔ ایک جوان بیٹا اپنے باپ کی موت پر غمزدہ نہیں ہوگا تو پھر کون ہوگا۔ میں چند لمحے خاموش رہ کر اس کا جائزہ لیتا رہا پھر پوچھا۔

''ذرا سوچ کر بتاؤ، آج کل میں کریم کا کسی سے کوئی جھگڑا وغیرہ تو نہیں ہوا تھا؟''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ان لمحات میں اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا تاثر ابھرا تھا، متامل لہجے میں بولا۔ ''کل شام کو ایک بچے سے اس کی منہ ماری تو ہوئی تھی لیکن گلزار اتنا بڑا قدم تو نہیں اٹھا سکتا۔'' بات کے اختتام تک اس کے لہجے میں بے یقینی موجود رہی۔

میں نے پوچھا۔ ''یہ گلزار کون ہے اور کس بات پر اس سے تلخ کلامی ہوئی تھی؟''

یوسف چند لمحے کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا پھر جواب دیا۔ ''گلزار، علی نواز کا بیٹا ہے۔ عمر بارہ تیرہ سال ہوگی۔ وہ اکثر ہماری دکان سے کرائے پر سائیکل لے کر جاتا ہے۔ کرائے دینے کی باری آتی ہے تو کہتا ہے کل دے دوں گا۔ اس کی طرف اچھی خاصی رقم چڑھ گئی ہے۔ میں نے کئی مرتبہ ابا سے کہا بھی کہ یہ اُدھار والا معاملہ ٹھیک نہیں۔ جو رقم اس کی طرف ہے اسی پر صبر کرلیں اور آئندہ کے لئے گلزار کو سائیکل نہ دیں لیکن ابا اس معاملے میں بڑا نرم واقع ہوا تھا، کہتا تھا دکان داری میں یہ سب برداشت کرنا پڑتا ہے بہرحال......'' وہ سانس لینے کے لئے متوقف ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''جب سے فاروق گھر چھوڑ کر گیا ہے ابا بہت چڑچڑا ہوگیا ہے۔ بات بات پر لڑائی جھگڑا کرنے لگتا ہے۔ کل شام کو بھی جب گلزار نے سائیکل کا کرایہ نہیں دیا تو ابا نے اسے اچھی خاصی ڈانٹ ڈپٹ کی تھی۔ ابا کا غصہ زبانی کلامی سے آگے بڑھ گیا تھا اور طیش میں آکر اس نے گلزار کے کان بھی مروڑ دیئے تھے۔ وہ روتا ہوا ہماری دکان سے چلا گیا تھا۔''

یہ ایک معمولی سا اور غیر اہم واقعہ تھا۔ ظاہر ہے کریم کی سرزنش پر ایک تیرہ سالہ بچہ

انتقاماً اسے قتل تو نہیں کرسکتا تھا۔ سائیکل کی ٹیوب کو کریم کی گردن میں جس طرح باندھا گیا تھا وہ کسی تیرہ سالہ بچے کے بس کی بات نہیں تھی۔ اسی طرح ہوا بھرنے والے پمپ کا مہلک وار بھی گلزار سے لگا نہیں کھاتا تھا۔ کریم ایسا بھی مٹی کا مادھو نہیں تھا کہ گلزار سے زیر ہو جاتا۔

میں نے گلزار کے ذکر کو گول کر دیا اور یوسف سے پوچھا۔ ''کیا تم دکان سے نکلنے کے بعد سیدھے گھر جاتے ہو؟''

''نہیں جناب!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میں لگ بھگ ساڑھے پانچ بجے دکان چھوڑ دیتا ہوں اور سیدھا بڑے میدان میں پہنچتا ہوں۔ وہاں گاؤں کے لڑکے فٹ بال کھیلتے ہیں۔ مجھے بھی اس کھیل کا بڑا شوق ہے۔ اسی لئے میں ابا سے پہلے دکان سے نکل آتا ہوں۔''

''بڑے میدان میں کھیل کود سے تم کب تک فارغ ہو جاتے ہو؟''

''سات، سوا سات تک۔'' اس نے جواب دیا۔

''پھر گھر چلے جاتے ہوگے؟''

''پانچ دس منٹ تک ادھر میدان ہی میں رہتے ہیں۔'' یوسف نے بتایا۔ ''جب سانسیں ہموار ہو جاتی ہیں تو اپنے اپنے گھروں کی راہ لیتے ہیں۔'' ایک لمحے کو رک کر اضافہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''ساڑھے سات اور آٹھ بجے کے درمیان میں گھر پہنچ جاتا ہوں۔''

''اور تمہارا باپ کب تک گھر پہنچ جاتا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''عموماً ساڑھے چھ بجے تک۔''

''کیا آج بھی تم کھیل کے میدان سے فارغ ہونے کے بعد آٹھ سے پہلے ہی گھر پہنچ گئے تھے؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا پھر چند لمحات کے توقف کے بعد بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں گھر میں داخل ہوا تو اماں نے بتایا کہ ابا ابھی تک گھر نہیں آیا۔ یہ ایک خلافِ معمول بات تھی اس لئے مجھے حیرت ہوئی اور میں ابا کو دیکھنے دکان کی طرف چلا گیا اور پھر......'' وہ یہاں تک پہنچ کر خاموش ہوگیا۔ اس کے چہرے سے گہرا دکھ جھلک رہا تھا۔ چند لمحات کے وقفے کے بعد اس نے غمزدہ لہجے میں بتایا۔

''پھر میں نے دکان کے اندر ابا کو بے ڈھنگے انداز میں پڑے دیکھا۔ اس وقت تک اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں نے ماچس جلائی تو اس کی ناکافی روشنی میں، میں نے ابا کی

PDF LIBRARY 0333-7412793

گردن میں بندھی ہوئی سائیکل کی ٹیوب دیکھ لی۔ میں تیلی پر تیلی جلاتا گیا اور پھر یہ خوف ناک حقیقت مجھ پر کھل گئی کہ ابا کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔“

”پھر تم نے کیا، کیا؟“ وہ خاموش ہوا تو میں نے استفسار کیا۔

”میں سیدھا گھر پہنچا اور اماں کو جا کر صورت حال سے آگاہ کیا۔“ وہ رنجیدہ لہجے میں بولا۔”گھر میں فوراً ماتم کی سی فضا قائم ہو گئی۔ میری بہنیں اور چھوٹے بھائی ابا کی موت کا سن کر زار و قطار رونے لگے۔ میں اماں اور ان سب کو تسلی دلاسے دیتا رہا۔ پھر اماں مجھے ساتھ لے کر دکان پر آ گئی۔ گھر سے نکلتے وقت ہم لالٹین بھی ساتھ لے آئے تھے۔ اماں کا انداز بتاتا تھا شاید اسے میری بات کا یقین نہیں آیا تھا مگر جب اس نے اپنی آنکھوں سے ابا کی لاش کو دیکھ لیا تو دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ ابا جیسا بھی تھا اس کا خاوند تھا اور ہم سب کا کفیل بھی۔ یہ سچ ہے کہ میں بھی دن بھر ابا کے ساتھ محنت کرتا تھا لیکن ابا کی اہمیت اپنی جگہ پر ہے! وہ تو ہم سب کے سر کا سایہ تھا۔“

اتنا کہہ کر وہ ایک مرتبہ پھر خاموش ہو گیا۔ میں نے اس سے کچھ نہ کہا اور قدم قدم اس کے گھر کی طرف بڑھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ خود ہی بول اٹھا۔

”ہمیں رونے دھونے سے فرصت ملی تو میں نے اماں کو تھانے بھیج دیا تا کہ آپ کو اس واقعے کی اطلاع دی جا سکے اور خود میں ابا کی لاش کے پاس رک گیا تھا۔“

میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔”یوسف! جب تم کریم کو ڈھونڈتے ہوئے اپنی دکان پر پہنچے تو دکان کا دروازہ بند تھا؟“

”دروازہ بھڑا ہوا تھا مگر اس میں تالا نہیں لگا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔”دکان کے اندر جانے کے بعد مجھے پتہ چلا دکان کا تالا اپنی کھونٹی پر موجود تھا۔“

اس نے مجھے بتایا کہ صبح دکان کھولنے کے بعد وہ چابی سمیت تالے کو دیوار میں نصب ایک کھونٹی پر لٹکا دیتا تھا اور دن بھر وہ چابی تالا دکان کے اندر ہی رہتا تھا۔ میں جب جائے وقوعہ پر پہنچا تو میں نے ”آلاتِ مرمت و جراحت سائیکلاں“ کو دکان کے اندر پایا تھا۔ علاوہ ازیں کرائے پر چلنے والی سائیکلیں بھی ایک دیوار کے ساتھ ترتیب سے کھڑی تھیں۔ اس حوالے سے میں نے یوسف سے پوچھا۔

”کیا دکان کا ساز و سامان تم نے اٹھا کر کمرے کے اندر رکھا تھا؟“

”نہیں ...... وہ پہلے سے اندر موجود تھا۔“

”اس کا مطلب ہے کریم نے ”دکان داری“ سمیٹ لی تھی جب قاتل وہاں پہنچا۔“

میں نے پُر خیال انداز میں کہا۔”اور پھر قاتل نے اسے دکان بند کرنے کا موقع نہ دیا۔“

یوسف نے میرے خیال کی تائید کر دی۔

ہم باتیں کرتے ہوئے ان کے گھر پہنچ گئے۔ رات آدھی کے قریب گزر چکی تھی لیکن یہ اتنا بڑا واقعہ تھا کہ اس مکان کے کسی مکین کو نیند نہیں آ سکتی تھی۔ آس پڑوس کی چند عورتیں بھی گھر میں موجود تھیں اور ان کی موجودگی نے مقتول کریم کے چھوٹے سے گھر کو اور بھی چھوٹا کر دیا تھا۔ اس ناکافی در و دیوار پر پہلے ہی افرادِ خانہ کا اچھا خاصا بوجھ تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں بیٹھک نما ایک چھوٹے سے کمرے میں عابدہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ہمارے سوا اس کمرے میں اور کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ عابدہ کو نارمل کر کے بات چیت کے قابل بنانے میں مجھے آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ اس کی حالت خاصی ابتر ہو رہی تھی۔ کریم نے زندگی بھر اسے کوئی قابل ذکر سکھ نہیں دیا تھا اور جاتے جاتے بھی ایک ناقابلِ فراموش غم دے گیا تھا۔ کریم نے عابدہ کو بھی بچے پیدا کرنے والی ایک مشین سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ بے زبان دھاتی مشین کو اپنی کارکردگی ظاہر کرنے کے لئے صرف تیل پانی اور تھوڑی دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک انسان کو کسی مشین کے برابر کھڑا کر کے اسی سلوک سے گزارنا انسانیت نہیں۔ بہرحال کریم گھر کا مجازی پروردگار تھا لہٰذا ہزار اختلافات اور شکایات کے باوجود بھی اس کا زیاں گھر کے ہر فرد کو ناقابلِ برداشت صدمے سے دوچار کر گیا تھا۔

”مجھے کریم کی موت کا بڑھ دکھ ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

”میں اس کے قاتل کو قرار واقعی سزا دلوانے کی پوری کوشش کروں گا۔ قاتل کی گرفتاری کے سلسلے میں تمہیں مجھ سے تعاون کرنا ہو گا عابدہ!“

اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور دل خراش لہجے میں بولی۔”میں آپ سے کس قسم کا تعاون کروں تھانے دار صاحب؟“

”تم قاتل کی نشاندہی کر سکتی ہو۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں اندازہ ہو گا کریم کو کون قتل کر سکتا ہے؟“

وہ روہانسی آواز میں بولی۔”کوئی اس کا دشمن نہیں تھا۔ میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا، اس کی جان لے کر کسی کو کیا ملا ہو گا۔ آج تک کسی سے اس کا معمولی سا جھگڑا بھی نہیں ہوا۔“

لفظ ”جھگڑے“ پر میرے ذہن میں ایک جگنو سا چمکا۔ یوسف نے مجھے بتایا تھا کل شام کسی گلزار نامی لڑکے سے مقتول کریم کی اچھی خاصی گرما گرمی ہو گئی تھی۔ کریم کو جس انداز

PDF LIBRARY 0333-7412793

میں قتل کیا گیا تھا اس کے پیش نظر کسی بارہ تیرہ سالہ لڑکے کی طرف تو دھیان نہیں جاسکتا تھا تاہم میں نے اس سلسلے میں عابدہ سے استفسار ضروری سمجھا۔

''مجھے پتہ چلا ہے کہ کل شام علی نواز کے بیٹے گلزار سے کریم کا جھگڑا ہو گیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''کریم نے غصہ دکھانے کے ساتھ ساتھ گلزار کے کان بھی مروڑ دیئے تھے جس کے نتیجے میں وہ روتا ہوا وہاں سے گیا تھا۔ کیا رات کو کریم نے تمہیں اس بارے میں بتایا تھا؟''

''ہاں بتایا تھا۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''اور یہ قصہ سنانے کے بعد مجھے بری طرح مارا کوٹا بھی تھا۔ ابھی تک میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔ یہ تو وہی بات ہوئی ...... گرا گدھے سے اور غصہ کمہار پر!'' اس نے برا سا منہ بنایا۔ اس کا بس مجھ پر چلتا تھا اس لئے سارا غصہ مجھ پر نکال لیا۔ اصولی طور پر تو اسے علی نواز سے جا کر جھگڑا کرنا چاہئے تھا مگر علی نواز سے الجھنے میں اس کی روح فنا ہوتی تھی۔ چھوٹے سے بچے کی دھمکی سے ڈر گیا تھا۔''

عابدہ کی مبنی بر تلخی باتوں میں متعدد انکشاف پوشیدہ تھے۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور اضطراری انداز میں پوچھا۔ ''علی نواز سے ڈرنے کی کیا وجہ ہے اور کس چھوٹے بچے نے تمہارے خاوند کو دھمکی دی تھی؟''

''میں گلزار کی بات کر رہی ہوں۔'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولی۔ ''جب کریم نے اس کے کان مروڑے اور وہ رونے لگا تو اسی رونے کے دوران میں گلزار نے اسے دھمکی دی تھی کہ وہ ابھی جا کر اپنے باپ کو بتائے گا ...... اور اس کا باپ علی نواز، کریم کی ایسی تیسی کر کے رکھ دے گا۔'' وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکی پھر اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''ایک کریم ہی کیا، علی نواز سے تو اکثر لوگ ڈرتے ہیں۔ بھلا غنڈوں اور بدمعاشوں کے کون منہ لگے گا!

''کیا علی نواز اس علاقے میں بدمعاشی کرتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

مجھے اس تھانے میں تعینات ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ میں جب بھی کسی نئی جگہ پر جاتا تھا تو سب سے پہلے وہاں کے شر پسند عناصر کی فہرست تیار کرتا تھا کیونکہ ایک تھانے دار کا زیادہ تر سابقہ انہی افراد سے پڑتا ہے۔ میں نے اپنے ماتحت عملے کی مدد سے یہاں کی جو فہرست مرتب کی تھی اس میں کسی علی نواز کا نام موجود نہیں تھا۔ عابدہ کا بیان سن کر اسی لئے مجھے حیرت بھی ہوئی تھی۔

اس نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔ ''علی نواز ایک شریف بدمعاش قسم کا

آدمی ہے۔ وہ عام روایتی بدمعاشوں کی طرح کھلم کھلا غنڈا گردی نہیں کرتا مگر ضرورت پڑنے پر غنڈوں سے کہیں بڑھ کر غنڈا ثابت ہوتا ہے۔ ایسی دو تین مثالیں موجود ہیں کہ اس نے گلزار کی خاطر دوسروں کو بے دریغ پیٹ ڈالا۔ گلزار، علی نواز کا بہت ہی لاڈلا بچہ ہے۔ وہ اس کی غلط باتوں کی بھی حمایت پر اتر آتا ہے۔''

میں نے اپنی یادداشت میں علی نواز کے نام پر سرخ دائرہ لگایا اور عابدہ سے پوچھا۔ ''علی نواز کرتا کیا ہے؟''

''اس کی شربت کی دکان ہے۔'' عابدہ نے بتایا۔ ''اور اس کے ساتھ ہی برف کے گولے بھی بیچتا ہے۔''

میں مزید پندرہ منٹ تک گھما پھرا کر اس سے مختلف سوالات کرتا رہا پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کہا۔ ''عابدہ! مجھے افسوس ہے میں ابھی تک تمہارے بیٹے فاروق کا کوئی سراغ نہیں لگا سکا اور اب تم پر ایک نئی قیامت ٹوٹ پڑی ہے بہرحال......''

میں نے تھوڑا توقف کر کے ہمدردانہ نظر سے اسے دیکھا اور تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''فاروق کے بارے میں تو میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ گھر کی زہریلی فضا میں اس کا دم گھٹنے لگا تھا اور وہ تازہ ہوا میں سانس لینے کے لئے اپنی مرضی سے کہیں چلا گیا ہے ...... اور اپنی ہی مرضی سے واپس بھی آئے گا۔ تاہم تم فکر نہ کرو، کریم کے قاتل کو تم بہت جلد آہنی سلاخوں کے پیچھے دیکھو گی!''

ان لمحات میں ایک دکھی اور شکستہ دل عورت کو میں تسلی اور امید کے سوا اور کچھ نہیں دے سکتا تھا۔ عابدہ کی آنکھوں میں ٹمٹماتے امید و بیم کے چراغوں نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔ میں اس عورت کی بھرپور مدد کا عزم کر کے اس کے گھر سے نکل آیا۔

آئندہ روز میں نے علی نواز، خوشی محمد اور عبدالرحمٰن کو بلانے کے لئے بندے دوڑا دیئے۔ خوشی محمد اور عبدالرحمٰن مقتول کے کاروباری پڑوسی تھے۔ کریم کی دکان کی ایک طرف خوشی محمد کا چائے بسکٹ وغیرہ کا کھوکھا تھا اور دوسری جانب عبدالرحمٰن پھل کی دکان چلاتا تھا۔ میں ان دونوں افراد سے کوئی گھنٹہ پونا گھنٹہ پوچھ گچھ کرتا رہا لیکن ایسی کوئی مفید بات سامنے نہ آسکی جو کریم کے قاتل تک پہنچنے کا ذریعہ بن سکتی۔ وقوعہ کے روز ان دونوں نے کریم سے پہلے اپنا روزگار سمیٹ لیا تھا لہٰذا کریم کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا اس کے بارے میں انہیں کوئی علم نہیں تھا۔ وہ دونوں جب تک اپنی دکانوں پر موجود رہے انہوں نے علی نواز کو ''کریم سائیکل ورکس'' پر کھڑے یا کریم سے بات چیت کرتے نہیں دیکھا تھا۔

PDF LIBRARY 0333-7412793

انہوں نے اس بات کی بھی تصدیق کی کہ کریم کی کسی بھی شخص سے ایسی دشمنی نہیں تھی کہ وہ یوں سفاکی اور بے دردی سے اسے قتل کر ڈالتا!

یہی بات میری الجھن کا باعث تھی۔ میں نے جائے وقوعہ کا تفصیلی معائنہ کیا تھا اور کریم کی لاش کا بھی تنقیدی جائزہ لیا تھا۔ اس گیارہ بچوں کے باپ کو جس انداز میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا قاتل اپنے اندر کریم کے لئے بہت ہی عناد، نفرت اور غصہ رکھتا تھا۔ سر دست کریم کا ایسا کوئی دشمن منظر پر دکھائی نہیں دیتا تھا سوائے علی نواز کے!

عابدہ نے علی نواز کی جو ''خصوصیات'' بیان کی تھیں ان کی روشنی میں اس کی طرف سے ایسے سنگین اقدام کی توقع کی جا سکتی تھی اور علی نواز اس دن ہاتھ نہیں آ سکا تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ وہ آج صبح ہی کسی ضروری کام سے دوسرے ضلع چلا گیا تھا۔ کریم والے سنسنی خیز واقعے کے بعد اچانک اسے کوئی ضروری کام پڑ جانا بھی ذہن میں مختلف نوعیت کے خدشات ابھارنے کا باعث تھا۔

میں نے علی نواز کی گھر والی کو تاکید کروا دی کہ اس کا خاوند جیسے ہی لوٹے وہ اسے میرے پاس تھانے بھیج دے۔ اگر علی نواز کی بیوی کو یہ معلوم ہوتا کہ وہ کس کام سے کہاں گیا ہے تو میں اپنا ایک بندہ ادھر بھی دوڑا دیتا مگر وہ بے چاری اپنے خاوند کے ضروری کام اور روانگی کے صحیح مقام سے بے خبر تھی۔ تاہم میں نے دو سادہ لباس کانسٹیبلز کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ اس گاؤں میں اور آس پاس کے علاقوں پر گہری نظر رکھیں اور جیسے ہی علی نواز کہیں دکھائی دے وہ اسے پکڑ کر میرے پاس لے آئیں۔

یہ دونوں وہی کانسٹیبلز تھے جو گمشدہ فاروق کی تلاش پر بھی مامور تھے لیکن ابھی تک انہیں اس سلسلے میں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی!

※☆※

دوسرے دن یعنی سترہ مئی کو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آ گئی۔ اس رپورٹ کے مطابق کریم کی موت پندرہ مئی کی شام چھ اور سات بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ سامان سمیٹ کر جیسے ہی دکان بند کرنے والا تھا، قاتل وہاں پہنچ گیا اور اس نے کریم کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

کریم کی لاش کے ساتھ ہسپتال سے جو فائل آئی تھی ان رپورٹس کا لب لباب یہ تھا کہ پہلے کریم کے سر پر ہوا بھرنے والے پمپ سے ایک مہلک وار کیا گیا تھا اور ازاں بعد

سائیکل کی ٹیوب کو کس کے اس کی گردن کے گرد باندھا گیا تھا جس کے باعث کریم کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑی تھیں اور اسی دوران میں اس کی موت واقع ہو گئی تھی۔

اس زمانے میں فنگر پرنٹس وغیرہ اٹھانے کا دستور نہیں تھا۔ عدالت اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتی تھی ورنہ ہوا بھرنے والے پمپ سے انگلیوں کے نشانات حاصل کر کے ممکنہ قاتل تک پہنچنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔

فنگر پرنٹس کا خیال جس کسی کا بھی ہے اس کے لئے دل سے دعائیں ہی نکلتی ہیں۔ اس تکنیک نے تفتیشی میدان میں بہت آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ آج کل کی پولیس کو اس کے علاوہ بھی بہت سی سہولیات میسر ہیں مگر ہمارے زمانے میں سب کچھ زورِ بازو پر خود ہی کرنا پڑتا تھا!

ضروری قانونی کارروائی کے بعد میں نے کریم کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش عابدہ کے حوالے کر دی۔ اسی روز عصر اور مغرب کے درمیان اس کی تدفین ہو گئی۔

اگلے روز مجھے اطلاع ملی کہ علی نواز گھر واپس آ گیا ہے۔ میں نے فوراً اسے تھانے بلوا لیا۔ وہ گزشتہ روز رات گئے لوٹا تھا۔ میرے ''بلاوے'' پر وہ ٹھیک نو بجے صبح تھانے میں موجود تھا۔ میں نے کوئی بھی سوال کرنے سے پہلے سر تا پا گہری نظر سے اس کا تفصیلی جائزہ لیا۔

علی نواز ایک لحیم شحیم اور قد آور شخص تھا۔ اس کے ڈیل ڈول میں بڑی ''تاثیر'' پائی جاتی تھی۔ اس کی عمر پینتیس کے قریب رہی ہو گی۔ اس ''متاثر کن'' شخصیت پر اس نے خاصی صحت مند مونچھیں بھی پال رکھی تھیں۔

میرے مسلسل گھورنے نے اسے مضطرب کر دیا اور وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ''ملک صاحب! آپ نے کس سلسلے میں مجھے تھانے بلایا ہے؟''

''سلسلہ بہت دلچسپ اور عجیب ہے علی نواز!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پتہ چلا ہے تم بڑی وکھری ٹائپ کے جی دار ہو۔ جس کی جی چاہے ڈھلائی کر کے رکھ دیتے ہو۔ لوگ تم سے ڈرتے ہیں۔ کیونکہ تم بہت ہی خودسر اور جھگڑالو قسم کے آدمی ہو۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب؟'' وہ بھونچکا نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے تیز آواز میں کہا۔ ''زیادہ اداکاری کی ضرورت نہیں۔ میں نے جو کچھ بھی کہا ہے بہت سوچ سمجھ کر ہی کہا ہے۔ تم بڑے کامیاب شریف بدمعاش ہو۔''

PDF LIBRARY 0333-7412793

"شریف بدمعاش؟" اس نے الجھن زدہ انداز میں دہرایا۔

"میں نے کہا ہے نا، اداکاری کی کوئی گنجائش نہیں۔" میں نے اسے سرزنش کی پھر اچانک زاویہ سوالات تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔ "تم دو تین دن سے کہاں غائب تھے؟"

"جی میں چنن پور گیا ہوا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

موضع چنن پور دوسرے ضلع میں واقع تھا۔ میں نے سوال کیا۔ "تمہیں چنن پور میں ایسا کون سا ضروری کام پڑ گیا تھا کہ بیوی بچوں کو بتائے بغیر تم ادھر روانہ ہو گئے؟"

اس نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔ "میں صغراں کو بتا کر گیا تھا جی۔"

اس کی آنکھوں نے مجھے صاف بتا دیا کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ "صغراں نے مجھے بتایا ہے آپ نے میرے گھر بھی ایک بندہ بھیجا تھا۔" وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر منت ریز لہجے میں بولا۔ "صغراں کی مت الٹی ہے، جو بات یاد رکھنے کی ہو اسے بھول جاتی ہے اور بھولنے والی بات کو......"

"تمہاری بیوی کی مت الٹی ہے یا سیدھی، اس سے تو مجھے کوئی سروکار نہیں۔" میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی سخت لہجے میں کہا۔ "لیکن جب میں تمہیں چھت والے کنڈے میں الٹا لٹکا کر پنکھے کی مانند گھماؤں گا تو تمہاری مت ضرور ٹھکانے آ جائے گی۔"

"پر میں نے کیا، کیا ہے تھانے وار جی؟" وہ احتجاجی انداز میں بولا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ "تم نے بہت برا کیا ہے علی نواز، بتاؤ بے چارے کریم نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟ تم نے اسے کیوں قتل کیا؟"

بات ختم کرتے ہی میں بڑی توجہ سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا تاکہ میرے چھوڑے ہوئے تیروں میں سے اگر کوئی نشانے پر جا بیٹھے تو مجھے اس کی خبر ہو سکے مگر اس نے میری توقع کے برخلاف ردِعمل ظاہر کیا۔ اس کے احتجاجی لہجے کی شدت بڑھ گئی اور وہ خاصی بلند آواز میں چیخا۔

"آپ مجھے کریم مستری کا قاتل سمجھ رہے ہیں۔ یہ تو بڑی زیادتی والی بات ہے۔"

"چیخنے چلانے کی فی الحال ضرورت نہیں۔" میں نے ڈانٹ بھرے لہجے میں کہا۔ "اس صلاحیت کی تمہیں بعد میں زیادہ ضرورت محسوس ہو گی جب ٹرائل روم میں، میں تمہارا چیک اپ کروں گا اور جہاں تک زیادتی والی بات ہے......" میں نے جملہ نامکمل چھوڑ کر ذرا توقف کیا پھر اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

"تم نے صرف زیادتی کا نام ہی سنا ہو گا، اس کے حقیقی مفہوم سے تو تمہیں میں واقفیت دلاؤں گا۔ سیدھی طرح بتا دو تم نے کریم کو کیوں قتل کیا؟"

"میں نے کسی کریم کو قتل کیا ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا میرے ہاتھوں ہلاک ہوا ہے۔" وہ برہمی سے بولا۔ "آپ خواہ مخواہ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں اور......"

میں نے علی نواز کے عقب میں کھڑے حوالدار کو مخصوص اشارہ کیا اور اگلے ہی لمحے علی نواز کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ حوالدار شیر علی نے اس کی گردن پر ایک نپا تلا تکلیف دہ وار کیا تھا۔ علی نواز کے حلق سے پُر درد آواز خارج ہوئی تو میں نے خالص تھانے دارانہ انداز میں کہا۔

"میں تم پر واضح کر چکا ہوں میرے سامنے چیخنے چلانے کا کوئی کام نہیں۔ اس کا تمہیں بھرپور موقع دیا جائے گا جب سیدھی طرح تم میرے سوال کا جواب نہیں دو گے۔ سمجھ گئے یا کسی اور طریقے سے سمجھانے کی کوشش کروں؟"

اس کے لہجے میں قدرے نرمی پیدا ہوئی تاہم احتجاج کا عنصر شامل رہا۔ "تھانے دار صاحب! آپ کس بنا پر مجھے کریم کے قتل میں ملوث کر رہے ہیں؟"

"بنا تمہارا بچونگڑا ہے......گلزار۔"

"گل......زار......اس نے کیا، کیا ہے؟" وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے اسے بتایا کہ چودہ مئی کی شام مقتول نے اس کے بیٹے گلزار کو اچھا خاصا ڈانٹ دیا اور کان مروڑنے کے بعد اپنی دکان سے بھگا دیا تھا۔ گلزار نے روتے ہوئے مقتول کو دھمکی دی تھی کہ وہ اپنے باپ سے شکایت کر کے مقتول کی ایسی تیسی کرا دے گا۔ اس تفصیل کے اختتام پر میں نے عابدہ سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں کہا۔

"علی نواز! تمہارے کھاتے میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جب تم نے گلزار کی شکایت پر خود سے کمزور افراد کی ایسی تیسی کی ہے۔ کہو تو میں وہ تمام واقعات تمہارے سامنے دہرا دوں؟"

وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔ "جناب! یہ درست ہے میں اپنے بیٹے کی وجہ سے بہت جلد جذباتی ہو جاتا ہوں اور اس کی خاطر میں نے کئی لوگوں سے جھگڑا بھی کیا ہے۔ کیا کروں، میں گلزار والے معاملے میں مجبور ہو جاتا ہوں۔ مجھے خود پر قابو نہیں رہتا۔ یہ میری اکلوتی اولاد ہے اور بڑی منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوا ہے۔ لیکن میں بڑی سے بڑی قسم

PDF LIBRARY 0333-7412793

کھا کر کہہ سکتا ہوں، کریم کے قتل سے میرا دور کا واسطہ بھی نہیں۔''

''کیا گلزار نے چودہ مئی کی شام تم سے کریم کے روپے کی شکایت نہیں کی تھی؟'' میں نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''گلزار نے روتے ہوئے مجھے وہ تمام واقعہ سنایا تھا۔''

''اور تم نے اپنے بیٹے کو صبر کی تلقین کر دی؟'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''حالانکہ تم اس کی چھوٹی موٹی شکایت پر بھی پہاڑ گرانے اٹھ کھڑے ہوتے ہو!''

''آپ میرے جذبات کی بالکل درست ترجمانی کر رہے ہیں۔'' وہ بے خوف اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''کریم کی زیادتی کا احوال سن کر مجھے غصہ تو بہت آیا تھا لیکن میں نے گلزار کو یہ تسلی دے کر چپ کرا دیا تھا کہ میں کریم سے خود بات کروں گا اور کرائے کی مد میں واجب الادا رقم بھی کریم کو دے دوں گا۔''

''حالانکہ یہ تمہارے مزاج کے خلاف تھا؟'' میں نے اسے تیز نظر سے گھورا۔

وہ رکھائی سے بولا۔ ''جو سچ تھا وہ میں نے آپ کو بتا دیا۔ اب آپ کی مرضی ہے، یقین کریں یا نہ کریں۔''

حوالدار شیر علی نے پہلی مرتبہ ہماری گفتگو میں انٹری دیتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''ملک صاحب! علی نواز ٹیڑھی کھیر ہے، سیدھی انگلی سے کام نہیں چلے گا۔ میں درخواست کرتا ہوں آپ اسے میرے حوالے کر دیں۔''

میں نے علی نواز کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے ''دوستانہ'' انداز میں استفسار کیا۔ ''کیوں بھئی! کیا ارادہ ہے؟''

''اگر آپ میرے ساتھ زیادتی کرنا ہی چاہتے ہیں تو میں کیا کہوں۔'' وہ غصہ بھری بے چارگی سے بولا۔ ''لیکن آپ کو کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ میں نے کریم کو قتل نہیں کیا اور یہی حقیقت ہے!''

حوالدار نے اس کی پنڈلی پر ایک زوردار ٹھڈا رسید کیا اور اسے کالر سے پکڑ کر دھکا دیتے ہوئے دہاڑا۔ ''جھوٹ اور سچ کا فیصلہ کرنے والے تم کون ہو؟ ہم تھانے لگائے کس لئے بیٹھے ہیں؟''

میں نے حوالدار سے کہا۔ ''شیر علی! ایک دن کے لئے یہ تمہارا مہمان ہے۔ آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے مجھے نتائج چاہئیں۔''

''آپ فکر نہ کریں ملک صاحب!'' حوالدار نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اسے میری خاطر داری بہت ''راس'' آئے گی۔''

بات ختم کرتے ہی اس نے علی نواز کو گھسیٹ لیا۔ کالر کو پہنچنے والے جھٹکے نے علی نواز کو حوالدار کی جانب بڑھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے آنکھ دبائی اور علی نواز کو مزید خوفزدہ کرنے کے لئے حوالدار سے کہا۔

''سب سے پہلے اس کی انگلیوں کے نشانات حاصل کر لو۔ ہم ان نشانات کا آلہ قتل پر پائے جانے والے نشانات سے موازنہ کریں گے۔''

میں جانتا ہوں اس کارروائی کی کوئی اہمیت نہیں تھی تاہم اس سے اتنا فائدہ ضرور ہاتھ آ جاتا کہ اگر علی نواز، کریم کے قتل میں ملوث تھا تو وہ فنگر پرنٹس کے ڈر سے بہت کچھ اگلنے پر آمادہ ہو جاتا۔ بعض اوقات بے نام خوف بھی حقیقت کو آشکار کر دیتا ہے۔

وہ دن کسی خاص واقعے کے بغیر گزر گیا۔ دوپہر کے بعد صغراں اپنے اکلوتے بیٹے گلزار کے ساتھ تھانے پہنچی۔ وہ اپنے شوہر کی حراست کی وجہ سے بہت پریشان تھی۔ اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں علی نواز کو چھوڑ دوں۔ جب میں نے اس سے پوچھا آیا وہ جانتی ہے کہ میں نے اس کے شوہر کو تھانے میں کیوں بند کیا ہے؟ تو اس نے بتایا کہ اسے لوگوں کی زبانی پتہ چلا ہے، علی نواز کو کریم کے قتل کے شبہے میں گرفتار کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس کا شوہر قاتل نہیں ہو سکتا۔

بہرحال میں نے اسے تسلی دی کہ اگر علی نواز کریم کے قتل میں ملوث نہیں تو میں اسے بہت جلد چھوڑ دوں گا۔ پتہ نہیں میرے بیان سے اس کی تشفی ہوئی یا نہیں البتہ اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ جب وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی تو اچانک اس نے اپنے بیٹے کو مارنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ باآواز بلند چلاتی بھی جا رہی تھی۔

''گلزارو! یہ سب تیری وجہ سے ہوا ہے۔ اگر تُو اس دن کریم مستری سے جھگڑا کر کے روتا ہوا ابا کے پاس نہ آتا تو تھانے دار، علی نواز پر شک نہ کرتا۔ تجھے کتنی بار منع کیا ہے یہ آوارہ گردی اور سائیکل چلانا چھوڑ دے...... مگر تُو سنتا ہی کہاں ہے۔''

گلزار نے بے خبری میں ایک آدھ تھپڑ ہی کھایا ہو گا۔ اس کے بعد وہ ماں کے ہاتھ نہیں آیا۔ وہ بہت ہی چلتا پرزہ قسم کا لڑکا تھا۔ اس نے صغراں کو غچا دیا اور پلک جھپکتے میں یہ جا اور وہ جا! صغراں خود کلامی کے سے انداز میں بولتے ہوئے اس کے پیچھے ہی کمرے سے نکل گئی۔

PDF LIBRARY 0333-7412793

’’میں بھی کیا کروں۔ اس کو بگاڑا بھی تو باپ ہی نے ہے۔ بچے کی ہر جائز اور ناجائز خواہش پوری کر دیں تو پھر یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ میں علی نواز کو سمجھاتی تھی، اس کی غلط باتوں کی حمایت نہ کر لیکن باپ میری سنتا ہے اور نہ ہی بیٹا۔ میں تو دونوں طرف سے ماری گئی نا......‘‘

تھانے کے برآمدے سے گزرنے کے بعد جب صغراں صحن میں پہنچی تو ایک کانسٹیبل نے آگے بڑھ کر اسے روکنے کی کوشش کی مگر میں نے اشارے سے اسے روک دیا۔ اس دوران میں، میں اپنی کرسی سے اٹھ کر کمرے کے دروازے میں آن کھڑا ہوا تھا۔ علی نواز کتنا قصوروار تھا، اس کو میں دیکھ ہی لیتا، صغراں کو تھانے میں روک کر خواہ مخواہ پریشان کرنا ٹھیک نہیں تھا۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے عابدہ اپنے چھوٹے بیٹے نوید کے ساتھ میرے پاس آئی۔ نوید کی عمر سات سال تھی اور وہ اوپر تلے چھ بہنوں سے چھوٹا تھا۔ میں نے عابدہ کے بارے میں سنا تو فوری طور پر اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

’’مجھے پتہ چلا ہے جی آپ نے کریم کے قاتل کو گرفتار کر لیا ہے؟‘‘ اس نے چھوٹتے ہی مجھ سے پوچھا۔

میں نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور بتایا۔ ’’میں نے شربت والے علی نواز کو حراست میں لیا ہے۔ وہ قاتل ہے یا نہیں، اس بات کا ابھی فیصلہ نہیں ہوا۔ تفتیش جاری ہے۔‘‘

وہ قدرے مایوس ہوگئی۔ اس کی مایوسی کو دیکھ کر مجھے بھی بڑا دکھ ہوا۔

’’تھانے دار جی!‘‘ وہ گلوگیر آواز میں بولی۔ ’’میرا جوان جہان بیٹا گھر سے چلا گیا۔ دو ہفتے گزر گئے، اب تک اس کا کوئی پتہ نہیں چلا۔‘‘ اس کی آواز میں درد بڑھتا چلا گیا۔ ’’کریم کے قتل نے تو ہمارا کباڑا ہی کر ڈالا ہے۔ پہلے ہی گھر میں کون سی خوش حالی تھی، ایک کمانے والا تھا وہ بھی چلا گیا۔ فاقوں کی نوبت آنے والی ہے۔‘‘ وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئی پھر سوالیہ انداز میں بولی۔

’’آپ مجھے بتائیں میں کیا کروں۔ میں کہاں جا کر اپنے دکھوں کو روؤں۔ پچھلے تین دن سے یوسف بھی تیز بخار میں پڑا ہے۔ کل باپ کے جنازے کو کندھا دینے کے لئے اٹھا تھا، اسکے بعد پھر چارپائی کا ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ تو اس حالت میں بھی دکان کھولنے کو کہہ رہا تھا لیکن دکان پر تو آپ نے سرکاری تالا ڈالا ہوا ہے۔

میں نے چونک کر عابدہ کو دیکھا اور مجھے قدرے شرمندگی بھی ہوئی۔ جائے وقوعہ والے کمرے کے دروازے پر میں نے ہی تالا لگوایا تھا۔ یہ ایک ضروری کارروائی تھی۔ بہرحال میں نے عابدہ سے کہا۔

’’تالا تو میں کھلوا دوں گا ...... یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں۔ لیکن پھر بھی یوسف کو ابھی آرام کی ضرورت ہے۔ اگر بخار کی حالت میں وہ کام میں جت گیا تو کوئی اور ہی مصیبت نہ کھڑی ہو جائے۔‘‘

’’فاقے سے بڑی مصیبت اور کوئی نہیں ہوتی تھانے دار صاحب!‘‘ عابدہ نے جگر پاش لہجے میں کہا۔ ’’زندہ رہنے کے لئے پیٹ روٹی مانگتا ہے۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ نوالہ منہ تک پہنچانے والے ہاتھ حالات کے کس کس ستم کا شکار ہیں۔ یہ ہر حال میں ایندھن مانگتا ہے تاکہ اس جہنم کی آگ روشن رہے!‘‘

وہ ایک ایسی سفاک حقیقت بیان کر رہی تھی جس سے کوئی بھی ذی ہوش شخص انکار نہیں کر سکتا تھا۔ میں اس کے گھریلو حالات سے پوری طرح آگاہ تھا۔ میں نے اس کے رِستے ہوئے زخموں پر ہمدردی اور خلوص کا مرہم رکھتے ہوئے کہا۔

’’تم فکر نہ کرو عابدہ! انشاء اللہ تمہارے گھر میں فاقوں کی نوبت نہیں آئے گی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ فی الحال میں اپنی جیب سے تمہاری مالی مدد کر دیتا ہوں۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔‘‘

بات ختم کرتے ہی میں نے اپنی جیب سے بٹوا نکالا اور بیس روپے گن کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔ اس نے بے یقینی سے میری جانب دیکھا لیکن رقم لینے کے لئے اس کا ہاتھ آگے نہیں بڑھا۔ میں نے اس کی ہچکچاہٹ کی تہہ میں اترتے ہوئے کہا۔

’’یہ رقم ادھار سمجھ کر رکھ لو۔ جب تمہارے ہاتھ میں پیسے ہوں گے تو واپس لوٹا دینا ...... اور یہ بھی ضروری نہیں کہ یک مشت ہی لوٹاؤ۔ تم اپنی سہولت کو دیکھتے ہوئے قسطوں میں بھی دے سکتی ہو۔ برا وقت ہمیشہ نہیں رہتا۔ تمہارے اچھے دن بھی آئیں گے۔ یوسف باپ کی موت کے صدمے سے سنبھل جائے تو اس کا بخار وخار جاتا رہے گا۔ کام میں اس کا جی لگے گا تو گھر میں پیسے بھی آنے لگیں گے۔ تم اپنے حوصلے کو تھام کر رکھو۔ اگر تم نے ہی ہمت ہار دی تو بچوں کا کیا ہوگا۔ اب تم ہی ان کی ماں بھی ہو اور باپ بھی۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا؟‘‘

اس کے ہونٹ کپکپائے اور اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

PDF LIBRARY 0333-7412793

"یہ رقم رکھ لو۔" میں نے پچکارنے والے انداز میں کہا۔

اس زمانے میں بیس روپے ایک معنی رکھتے تھے۔ ایک متوسط گھر کا مہینے بھر کا راشن زیادہ سے زیادہ پچیس روپے میں بہ آسانی آ جاتا تھا۔ اس قلیل رقم کو آج کل کے تین ہزار روپے تصور کر لیں۔ میرے بٹوے میں اتنی ہی گنجائش تھی ورنہ شاید میں کچھ زیادہ دے دیتا!

عابدہ کا لرزتا ہوا ہاتھ آگے بڑھا اور اس نے بیس روپے کے نوٹ تھام لئے۔ پھر جذبات سے لبریز آواز میں بولی۔ "بہت بہت شکریہ تھانے دار صاحب! میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ آپ انسان کے روپ میں کوئی فرشتہ ہیں۔"

"تم مجھے انسان ہی رہنے دو تو اچھا ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "اور یہ احسان والی کیا بات کی ہے تم نے؟ میں نے یہ رقم تمہیں ادھار دی ہے۔ تمہیں یہ بیس روپے واپس کرنا ہیں یا مجھے؟" میں نے لہجے کو نرم رکھتے ہوئے اس کے اطمینان کی خاطر کہا۔

"وقت پڑنے پر تو قرض بھی خوش نصیبوں ہی کو ملتا ہے۔" وہ دل گرفتہ لہجے میں بولی۔

"چلو اسی بہانے تمہارا شمار خوش نصیبوں میں تو ہوا!" میں نے کہا۔

اس کے آنسو نکل آئے اور وہ اپنے دوپٹے میں منہ دے کر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

میں نے اسے رونے دیا۔ یہ رونا اس کے لئے مفید تھا۔ وہ پتہ نہیں کتنے طوفانوں کا غبار اپنے سینے میں دبائے بیٹھی تھی۔ یہ غبار اگر آنسو بن کر آنکھوں کے راستے نکل جاتا تو وہ ہلکی پھلکی ہو جاتی۔ تاریکی کے دامن ہی سے روشنی کی کرن پھوٹتی ہے۔ دکھوں کا حد سے بڑھ جانا تو خوشی کی نوید ہوتا ہے، سکھ کا پیامبر ہوتا ہے!

دس پندرہ منٹ بعد اس نے خود کو سنبھال لیا۔ میں نے اس دوران میں ہمدردی کا ایک بول نہیں بولا تھا۔ اسے کوئی تسلی دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ خاموش بیٹھا اسے آنسو بہاتے دیکھتا رہا تھا کیونکہ یہی اس کے مرض کا علاج تھا، اس کے درد کا مداوا تھا۔ وہ اپنی مدد آپ کے تحت سنبھلی تھی۔ لہٰذا مجھے امید تھی، اس کا یہ سنبھلنا پائیدار ثابت ہوگا!

رات کو میں تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر کی طرف جانے لگا تو حوالدار شیر علی کمرے میں چلا آیا۔ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے کہا۔

"ملک صاحب! آپ نے مجھے صرف آج کے دن کی مہلت دی تھی۔ اس لئے میری "تحقیقاتی" رپورٹ حاضر ہے۔"

میں دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھا اور پوری توجہ حوالدار پر مرکوز کر دی۔

وہ بتانے لگا۔ "ملک صاحب! میں نے اس بندے پر ہر قسم کی سختی کر کے دیکھ لی مگر اس

نے کوئی جرم قبول نہیں کیا۔ میں نے فنگر پرنٹس والا ٹوٹکا بھی آزمایا ہے، اس کی انگلیوں کے نشانات لینے کے بعد میں نے ایک گھنٹے تک اسے "آزاد" چھوڑ دیا اور اس کے بعد جا کر بتایا کہ ہوا بھرنے والے پمپ پر جو فنگر پرنٹس پائے گئے ہیں وہ اس کی انگلیوں کے حاصل کردہ نشانات سے گہری مماثلت رکھتے ہیں۔"

"پھر اس نے کیا جواب دیا؟" میں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔

"وہ اپنی ضد پر ڈٹا ہوا ہے۔" حوالدار نے جواب دیا۔ "وہ کہتا ہے اس نے مستری کریم بخش کو قتل کیا ہے اور نہ ہی ہوا بھرنے والے کسی پمپ کو چھوا ہے۔ لہٰذا وہاں اس کی انگلیوں کے نشانات کا پایا جانا ممکن نہیں۔ میں جھوٹ بول کر اسے قتل کے کیس میں ملوث کرنا چاہتا ہوں۔ پولیس والے اپنی نااہلی اور ناکامی کو چھپانے کے لئے اسی قسم کے اوچھے ہتھکنڈے اپنا کر بے گناہوں کو پھانس لیتے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "شیر علی! کیا تم نے اس کی یہ لمبی چوڑی تقریر سن لی؟"

"ہاں سن لی۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اور اس کے بدلے میں اسے بھی مجھ سے بہت کچھ سننے کو ملا ہے ...... منہ کی زبان سے نہیں بلکہ ہاتھ پاؤں کی زبان سے۔" اتنا کہہ کر وہ لمحے بھر کو خاموش ہوا۔ اس کے چہرے پر بڑے معنی خیز تاثرات سجے تھے۔ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔

"ویسے ملک صاحب! یہ بندہ ہے بہت ہی سخت جان۔ میں نے علی نواز کو جس نوعیت کی تفتیش سے گزارا ہے اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کی چیں بول جاتی۔ یہ مسلسل میری خاطر تواضع سے لطف اندوز ہوتا رہا اور اس کی زبان پر ایک ہی تکرار رہی کہ ہم غلط رخ پر تفتیش کر رہے ہیں، ہمیں کسی اور انداز میں بھی کوشش کرنی چاہئے۔"

میں نے حوالدار کے خاموش ہونے پر کہا۔ "تم نے پوچھا نہیں اور کس انداز میں؟"

"پوچھا تھا ...... اور اس نے بتایا بھی ہے۔" وہ بڑی رسان سے بولا۔ "کہتا ہے ہم نے اب تک مقتول کے بیٹے کو کیوں نظر انداز کیا ہوا ہے؟"

"بیٹے کو......" میں اچھل پڑا۔ "وہ کس بیٹے کی بات کر رہا ہے؟"

"فاروق کی۔" حوالدار نے جواب دیا۔ "اس کا کہنا ہے فاروق اور کریم میں ذرا نہیں بنتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے نفرت کرتے تھے۔ فاروق کافی دنوں سے گھر سے غائب ہے اور ابھی تک اس کا کوئی سراغ ہاتھ نہیں لگا۔ وہ جس صبح غائب ہوا اس سے پچھلی رات ان کے گھر میں اچھا خاصا ہنگامہ بھی ہوا تھا اور ...... دونوں باپ بیٹے میں ہاتھا پائی کی

PDF LIBRARY 0333-7412793

نوبت بھی آ گئی تھی۔ عین ممکن ہے فاروق ہی نے اپنے باپ کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہو۔''

علی نواز بہت دور کی کوڑی لایا تھا۔ پتہ نہیں کیوں اس طرف میرا دھیان نہیں گیا تھا۔ فاروق چار مئی کی صبح کو گھر سے نکلا ہوا ابھی تک واپس نہیں لوٹا تھا اور آج اٹھارہ مئی کا دن بھی اختتام کو پہنچ گیا تھا۔ عابدہ کی زبانی مجھے اس گھر کے حالات سے پوری واقفیت حاصل ہو چکی تھی۔ علی نواز نے جس نکتے کو اٹھانے کی کوشش کی تھی وہ واقعی اپنے اندر بڑی توانائی رکھتا تھا۔ علی نواز کی بات سے یہ بھی واضح ہوا کہ مقتول کریم کے گھریلو حالات سے کم و بیش قصبے کے تمام افراد آگاہ تھے۔

تین مئی کی رات مقتول کریم کے گھر میں ٹھیک ٹھاک ہنگامہ برپا ہوا تھا۔ مقتول نے اپنی بیوی عابدہ کو بے دریغ زدوکوب کیا تو فاروق کو بھی طیش آ گیا۔ وہ ماں کا حمایتی بن کر باپ کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا یہ عمل عین فطری اور برمحل تھا۔

علی نواز نے میرے ذہن کو جو نئی راہ دکھائی میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا، فاروق ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت گھر سے فرار ہو گیا ہو اور پھر موقع پا کر اس نے باپ کو موت کے گھاٹ اتار دیا...... اور ایک مرتبہ پھر اسی انداز میں غائب ہو گیا جیسے پہلے ہوا تھا۔

محبت اور نفرت دو طاقت ور جذبات ہیں۔ فرق تعمیری اور تخریبی کا ہے۔ محبت قربانی اور ایثار کا درس دیتی ہے۔ محبت کرنے والے دوسروں کی خاطر اپنی جان نچھاور کر دیتے ہیں۔ جب کہ نفرت سراسر تخریبی عمل کا نام ہے۔ نفرت میں انسان جان لینے سے ذرا دریغ نہیں کرتا۔ فاروق اور کریم ایک دوسرے سے جس درجہ نفرت کرتے تھے اس میں کوئی بھی دوسرے کے خون میں ہاتھ رنگ سکتا تھا!

اب مسئلہ یہ تھا کہ فاروق کو کہاں تلاش کیا جاتا۔ جب تک وہ ہاتھ نہ آتا اس سلسلے کو آگے نہیں بڑھایا جا سکتا تھا۔ میں انہی خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ حوالدار شیر علی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''میرے لئے کیا حکم ہے ملک صاحب!''

میں نے ٹھہری ہوئی نظر سے اسے دیکھا اور اس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے پوچھ لیا۔ ''تم نے علی نواز کے بارے میں کیا اندازہ لگایا ہے؟''

''اب تک کی تفتیش سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے اس نے کریم کا قتل نہیں کیا۔'' حوالدار

نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ نے مجھے آج کے دن کی مہلت دی تھی، یہ اس دن کی رپورٹ ہے۔''

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''اس نیک کام کے لئے میں تمہیں آج کی رات بھی دیتا ہوں۔ صبح علی نواز کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کریں گے۔''

اس کی آنکھوں میں ایک پُر مسرت سی چمک نمودار ہوئی۔ جب کبھی کسی ملزم کو حوالدار یا متعلقہ تفتیشی عملے کے سپرد کیا جاتا ہے تو ان کی خوشی قابل دید ہو جاتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی انمول خزانہ ان کے ہاتھ لگنے والا ہو!

حوالدار نے پُر اعتماد انداز میں کہا۔ ''ملک صاحب! انشاء اللہ صبح تک ''کٹی کٹے'' کا فیصلہ بھی ہو جائے گا۔ ویسے......'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''ویسے ہمیں علی نواز کی بات پر بھی غور ضرور کرنا چاہئے...... وہی فاروق والی بات!''

''ہاں، ہاں...... فاروق کو بھی دیکھ لیں گے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا اور تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر کی جانب بڑھ گیا۔

اس رات سونے سے پہلے میں کافی دیر تک فاروق کے بارے میں سوچتا رہا اور یہی فیصلہ کر کے سویا کہ اگلی صبح میں فاروق کی تلاش میں اور زیادہ سرگرمی پیدا کر دوں گا۔

☼☆☼

کہتے ہیں ڈھونڈنے والے کو خدا بھی مل جاتا ہے اور بعض اوقات ایسا اتفاق بھی ہو جاتا ہے کہ انسان آگ کی تلاش میں نکلے اور اسے پیامبری مل جائے۔ میرے ساتھ بھی ایک ایسا ہی خوشگوار اتفاق پیش آیا۔ اس قدرت والے نے ایک ایسی راہ دکھا دی کہ میرا کام آسان ہو گیا۔

دوسری صبح میں نے فاروق کی تلاش کے ''بندوبست'' کا ازسرنو جائزہ لیا اور کارروائی میں تیزی لانے کے لئے اپنے عملے کے مزید تین چار افراد کو ہائی الرٹ کر کے مختلف محاذوں پر دوڑا دیا۔ جب گیارہ بجے میں واپس تھانے آیا تو ایک خوشخبری میری منتظر بیٹھی تھی...... یہ خوشخبری فاروق کی صورت میں تھی۔ وہ دو پولیس والوں کے ساتھ تھانے میں موجود تھا۔ میں نے ان تینوں کو فی الفور اپنے کمرے میں بلا لیا۔

پولیس والوں میں ایک اے ایس آئی اور دوسرا کانسٹیبل تھا۔ ان دونوں کا تعلق لاہور پولیس سے تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اے ایس آئی نے بتایا۔

''ملک صاحب! اس جوان کو ہم نے شاہی محلے کے ایک کوٹھے سے گرفتار کیا ہے۔''

PDF LIBRARY 0333-7412793

"اوئے بدبخت!" میں نے فاروق کو کھا جانے والی نظر سے گھورا۔ "تُو اُدھر ہیرا منڈی میں کیا لینے گیا تھا؟ اِدھر تیری ماں کا رو رو کر برا حال ہو گیا اور تیرا باپ......"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کے تاثرات کا جائزہ لینا چاہا تو وہ جلدی سے بولا۔ "کیا ہوا میرے ابا کو؟"

"یہ بھی مجھ ہی سے پوچھو گے؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

اس کے ساتھ آنے والے اے ایس آئی نے کہا۔ "ملک صاحب! ہمیں واپس جانے کی جلدی ہے۔ اس لئے آپ پہلے ہماری سن لیں۔ اس کی چمڑی بعد میں بڑی تسلی سے ادھیڑتے رہیں۔ ہم اسے آپ کے حوالے کر کے جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" میں نے اے ایس آئی کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ "اس کے بارے میں کیا تفصیلات ہیں؟"

ایک بات کا تو مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ لاہور سے آنے والے پولیس والے یہاں کے حالات سے قطعی ناواقف تھے۔ یعنی فاروق نے اس سلسلے میں ان کے سامنے زبان نہیں کھولی تھی۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا تھا کہ یا تو وہ اپنے باپ کے قتل میں ملوث ہی نہیں اور یا پھر بہت مضبوط ہے۔ اس کے دل کا حال جاننا آسان نہیں۔ اس نے اپنے کارنامے کو بڑی ہوشیاری سے چھپا رکھا ہے۔

مہمان اے ایس آئی نے مجھے بتایا کہ فاروق کو کل رات گرفتار کیا گیا تھا۔ انہیں اطلاع ملی تھی کہ مذکورہ کوٹھے پر ایک مفرور مجرم کی آمد متوقع ہے۔ انہوں نے بڑی رازداری سے اس کوٹھے پر چھاپہ مارا مگر مذکورہ مجرم کی گرفتاری میں انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ یہی سوچا جا رہا تھا کہ پولیس کا مطلوب وہ مفرور مجرم اس رات کوٹھے پر آیا ہی نہیں تھا یا پھر چھاپے کی بھنک اسے مل گئی اور پولیس کی آمد سے پہلے ہی وہ موقع سے فرار ہو گیا۔ بہرحال پولیس نے کوٹھے پر موجود تماش بینوں کو گرفتار کر کے تھانے پہنچا دیا۔

فاروق کے سوا باقی تمام تماش بینوں کا تعلق لاہور ہی سے تھا۔ رات بھر کی تفتیش نے فاروق کو غیر متعلق اور بے ضرر ثابت کر دیا تو متعلقہ تھانے کے عملے کے دو افراد اسے میرے پاس پہنچانے اس قصبے تک چلے آئے تھے۔ وہ بھلا زمانہ تھا اور عوام کو بلاوجہ پریشان نہیں کیا جاتا تھا ورنہ اگر فاروق کسی ایسے ویسے پولیس والے کے ہتھے چڑھا ہوتا تو وہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے والی وارثوں کی بھی ناک سے لکیریں نکلوا دیتا۔

لاہور پولیس والے فاروق کو میرے حوالے کر کے تھانے سے رخصت ہو گئے تو اس

نے اپنا سوال ایک مرتبہ پھر دہرا دیا۔ "میرے ابا کو کیا ہو گیا ہے؟"

"تمہارے ابا کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے براہِ راست سنگین لہجے میں کہا۔ "اور مجھے تم پر شک ہے۔"

اپنے باپ کے قتل کی خبر سن کر وہ اتنا پریشان نہیں ہوا جتنا میرے شک نے اسے ہراساں کر دیا۔ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب؟"

"میں وہی کہہ رہا ہوں جو تم نے سنا ہے۔"

"مم...... مم...... مگر میں اپنے باپ کو کیسے قتل کر سکتا ہوں؟" وہ سخت فکرمند تھا۔

میں نے کہا۔ "اس کی کھوپڑی پر سائیکل میں ہوا بھرنے والا پمپ برسا کر...... اور اس کی گردن میں سائیکل کی ٹیوب کا پھندا لگا کر......"

"پتہ نہیں آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟" وہ احتجاجی لہجے میں چلایا۔

"سب پتہ چل جائے گا!" میں مسلسل اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

وہ بولا۔ "میں تو پندرہ سولہ دن پہلے گھر سے نکل گیا تھا۔ مجھے کیا پتہ ابا کے ساتھ پیچھے کیا واقعات پیش آئے ہیں۔" پھر پوچھنے لگا۔ "ابا کو کب قتل کیا گیا ہے؟"

"پندرہ مئی کی شام چھ اور سات بجے کے درمیان۔"

"اوہ!" اس نے تاسف بھری سانس خارج کی اور بولا۔ "مجھے ابا کی موت کا بہت افسوس ہے لیکن ایک مرتبہ پھر یہی کہوں گا آپ خواہ مخواہ مجھ پر شک کر رہے ہیں۔ میں پندرہ مئی کو اس قصبے میں تھا ہی نہیں۔ پھر قتل کی کسی واردات میں کیسے ملوث ہو سکتا ہوں؟"

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ حالات و واقعات کے مطابق تم چار مئی کی صبح سے غائب ہو اور اب لاہور پولیس کے دو اہلکار تمہیں پکڑ کر یہاں پہنچا گئے ہیں۔ تمہاری گرفتاری اور تفتیش کی تفصیل بھی انہوں نے بیان کر دی لیکن اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ تم نے اپنے باپ کو قتل نہیں کیا۔ عین ممکن ہے اس دوران میں پندرہ مئی کی شام تم اپنے باپ کی دکان پر پہنچے ہو اسے بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار کر واپس چلے گئے ہو۔"

وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن جھٹکنے لگا پھر احتجاجی لہجے میں بولا۔ "آپ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں وہ بالکل غلط ہے۔ مجھ پر ایک گھناؤنا الزام ہے۔ میں بھلا اپنے باپ کو کیوں قتل کروں گا۔"

"تمہارے پاس اپنے باپ کو قتل کرنے کی ٹھوس وجوہات ہیں!" میں نے ٹھہرے

PDF LIBRARY 0333-7412793

ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ ”مثلاً کون سی وجوہات؟“

”تم اپنے باپ سے شدید نفرت کرتے ہو...... بلکہ کرتے تھے۔“

”یہ سچ ہے، مجھے اپنے باپ سے نفرت تھی۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”لیکن اس نفرت کے نتیجے میں، میں قتل جیسی سنگین واردات نہیں کر سکتا۔“

”یہ تو تم کہہ رہے ہو نا۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”تفتیش کے بعد پتہ چلے گا تم نے کیا، کیا ہے اور کیا نہیں کیا۔ نفرت اتنا طاقتور جذبہ ہے کہ اس سے مغلوب ہو کر انسان کچھ بھی کر سکتا ہے۔ تمہارا باپ مستری کریم بھی تمہیں سخت ناپسند کرتا تھا۔ اکثر و بیشتر وہ تمہیں برا بھلا سناتا رہتا تھا۔ وہ تمہاری آوارہ گردی اور نکمے پن سے عاجز تھا اور تمہاری شکل دیکھنے کا روادار نہیں تھا۔“ میں ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”تم چار مئی کی صبح گھر سے ایسے گئے کہ پھر پلٹ کر نہیں دیکھا اور آج اُنیس مئی ہے۔ تمہاری ماں کی زبانی مجھے پتہ چلا ہے تین مئی کی رات تم نے اپنے باپ سے ہاتھا پائی بھی کی تھی؟“

”ہاں کی تھی۔“ وہ جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ”ابا نے اماں پر زیادتی کی حد کر دی تھی۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں اماں کو بچانے کے لئے بیچ میں کود پڑا تھا۔ ابا اس وقت جس بے رحمانہ سلوک سے اماں کو گزار رہا تھا اس میں ہاتھا پائی تو ہونا ہی تھی۔ میں ابا کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اگر میں اتنی ہمت نہ کرتا تو ممکن تھا وہ سفاک شخص یعنی ابا میری اماں کو جان ہی سے مار دیتا۔“

بات ختم کرتے ہی وہ کافی رنجیدہ دکھائی دینے لگا۔ میں اندازہ لگانے سے قاصر تھا کہ اس رنجیدگی کا تعلق باپ کے قتل سے تھا یا پھر ماں کے ساتھ ہونے والے اس رات کے وحشیانہ سلوک سے۔ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”یوسف تم سے بڑا بھائی ہے۔ کیا وہ اس رات گھر پر موجود تھا جب مقتول کریم اپنی بیوی عابدہ کو زدوکوب کر رہا تھا۔“

”بالکل موجود تھا۔“ وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا، وہ اپنے بڑے بھائی یوسف کو بھی سخت ناپسند کرتا تھا۔

”اس نے کہاں جانا تھا!“

”کیا یوسف نے ماں کو بچانے کی کوشش نہیں کی تھی؟“

”زبانی کلامی۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ ”یوسف ایک مٹی کا مادھو ہے۔ ابا کا بہت احترام کرتا ہے بلکہ آخری حد تک وہ ابا سے ڈرتا ہے۔ دور کھڑا زبان ہلا کر انہیں لڑائی جھگڑے سے منع کرتا رہا۔ اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ آگے بڑھ کر ظالم باپ کا ہاتھ ہی روک لے۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہمت تم نے کر لی۔ ماں کے بچاؤ کے لئے تم نے باپ سے اچھی خاصی ہاتھا پائی کی۔ کیونکہ تم مٹی کا مادھو نہیں بلکہ آگ کا گولا ہو۔ تم باپ کا احترام کرتے ہو اور نہ ہی اس کی طرف سے تمہارے دل میں کوئی ڈر خوف تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”اس رات میں نے جو کچھ کیا وہ حالات کا تقاضا اور وقت کی ضرورت تھا۔“ وہ شپٹائے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے جلدی سے کہا۔ ”اور پندرہ مئی کی شام تم نے جو کچھ کیا وہ بھی تقاضائے حالات اور ضرورتِ وقت تھا؟“

”میں نے کیا، کیا ہے؟“ وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ”اپنے باپ کا قتل۔“

”آپ مجھ پر سراسر الزام لگا رہے ہیں۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے بولا۔

”پھر بتاؤ تم پندرہ مئی کی شام چھ اور سات بجے کے درمیان کہاں تھے؟“ میں نے درشت لہجے میں استفسار کیا۔ ”یہی نہیں بلکہ یہ بھی بتاؤ کہ چار مئی کی صبح سے لے کر بازارِ حُسن کے ایک کوٹھے پر پہنچنے تک تم نے کہاں کہاں اور کس طرح وقت گزارا۔ یہ لگ بھگ دو ہفتے یعنی پورے چودہ دن بنتے ہیں۔“

وہ چند لمحات تک خاموش بیٹھا مجھے دیکھتا رہا پھر میرے سوالات کی روشنی میں گھر سے اپنے غیاب کی تفصیل بتانے لگا۔ میں اس کے پھیلے ہوئے قصے کو نہایت ہی مختصر الفاظ میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

گھریلو حالات سے دل برداشتہ ہو کر فاروق نے گھر چھوڑ دیا تھا اور میرا اندازہ بھی یہی تھا کہ جن گھروں میں افرادِ خانہ اور وسائل کے بیچ توازن قائم نہیں رہتا وہاں ایسے ہی واقعات جنم لیتے ہیں۔ فاروق کے مطابق اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہا

PDF LIBRARY 0333-7412793

تھا۔ وہ اپنے قصبے سے چپ چپاتے نکلا اور خاموشی سے لاہور پہنچ گیا۔ اپنے اس اقدام کے بارے میں اس نے فرید، سلطان اور مطلوب کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ بالکل ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی ہنر نہیں تھا لہٰذا مزدوری ہی روزگار کا وسیلہ بنی۔ وہ سبزی منڈی میں سبزی اور پھلوں کے ٹوکرے اٹھانے لگا۔ پھر اس کی ملاقات قدیر نامی ایک شخص سے ہوگئی۔ قدیر اکبری منڈی میں پلے داری کرتا تھا۔ ان میں جلد ہی دوستی ہوگئی اور قدیر نے فاروق کو بھی اپنے ساتھ اکبری منڈی میں کام پر لگا لیا۔

قدیر کی رہائش گوالمنڈی کے علاقے میں تھی۔ فاروق بھی اس کے ساتھ رہنے لگا۔ صحبت سے انسان یقیناً بہت کچھ سیکھتا ہے۔ قدیر کو اس بازار میں جانے کا شوق تھا۔ فاروق بھی اس شوق میں گرفتار ہوگیا اور پھر بالآخر اٹھارہ مئی کی رات پولیس کی چھاپہ مار کارروائی میں گرفتار ہو کر وہ حوالات میں چلا گیا اور اب ...... اُنیس مئی کی دوپہر میں وہ میرے سامنے بیٹھا اپنی رام کہانی سنا رہا تھا۔ وہ خاموش ہوا تو میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''اوئے بدبخت! کیا تم نے لاہور کی منڈیوں کا ٹھیکہ لے رکھا تھا؟ سبزی منڈی، اکبری منڈی، گوال منڈی اور پھر ہیرا منڈی ...... اگر تم کچھ عرصہ اور وہاں ٹِک جاتے تو چونا منڈی، لکڑ منڈی، سوتر منڈی، پان منڈی اور پتہ نہیں کون کون سی منڈیوں کا پھیرا لگا لیتے۔''

''جناب! جو حقیقت تھی وہ میں نے بتا دی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اب آپ کی مرضی ہے، یقین کریں یا نہ کریں۔''

''اوئے یقین کے گھوڑے!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور کہا۔ ''ابھی تک تم نے یہ نہیں بتایا کہ پندرہ مئی کی شام چھ اور سات بجے کے درمیان تم کس منڈی کے کون سے کونے میں موجود تھے؟''

وہ چند لمحے خاموش رہ کر ذہن میں کچھ حساب جوڑتا رہا پھر جواب دیا۔ ''جناب! مجھے یاد آ گیا۔ پندرہ مئی کی شام ہم نے اکبری منڈی سے ذرا جلدی چھٹی کر لی تھی اور دونوں فلم دیکھنے چلے گئے تھے۔''

''فلم دیکھنے!'' میں نے اس کی آنکھوں میں گھورا۔ ''کون سا شو؟''

''چھ سے نو والا۔'' اس نے بتایا۔

اگر واقعی انہوں نے لاہور کے کسی سینما میں چھ سے نو والا فلم شو دیکھا تھا تو پھر فاروق

کی ذات کریم مرڈر کیس سے مبرا ہو جاتی تھی۔ لیکن میں اتنی آسانی سے اسے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''تم دونوں نے کس سینما میں کون سی فلم دیکھی تھی؟''

اس نے بتایا۔ ''ہم نے اکمل اور فردوس کی فلم ''ملنگی'' دیکھی تھی۔ آج کل یہ فلم ادھر لاہور میں میکلوڈ روڈ کے ایک سینما میں لگی ہوئی ہے۔''

''سینما کا نام بھی بتاؤ۔''

''رتن۔''

''یہ مت سمجھنا کہ میں آنکھیں بند کر کے تمہاری بات کا یقین کر لوں گا۔'' میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں تمہارے بیان کی تصدیق کے لئے ابھی ایک بندہ لاہور دوڑاؤں گا۔ وہ سیدھا قدیر کے پاس پہنچے گا۔ پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔''

''یہ آپ مجھ پر بہت بڑا احسان کریں گے۔'' وہ منت ریز لہجے میں بولا۔

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

''آپ کی تصدیق سے کم از کم یہ تو ہوگا کہ اس مصیبت سے میری جان چھوٹ جائے گی۔ آپ کی نظر میں، میں بے قصور ثابت ہو جاؤں گا۔'' ایک لمحے کے توقف سے وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''یہ ٹھیک ہے ابا اور میں ایک دوسرے سے نفرت کرتے تھے۔ مگر اس کو قتل کرنے کے بارے میں، میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اگر مجھے اتنا بڑا قدم اٹھانا ہوتا تو گھر میں رہتے ہوئے بھی میں یہ کام کر سکتا تھا۔''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی خاموشی میں ایک ٹھہراؤ پنہاں تھا۔ ایسا ٹھہراؤ اور ثبات جو سچائی کا قریبی رشتے دار ہوتا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی زبان سے نکلنے والا ایک ایک لفظ مبنی بر حقیقت ہو۔ میں چند لمحے ٹٹولتی ہوئی نظر سے اسے دیکھتا رہا پھر کہا۔

''جب تک مجھے تمہاری بے گناہی اور اس کیس سے لاتعلقی کا یقین نہیں ہو جاتا تمہیں تھانے میں رہنا ہوگا۔''

''یہ تو بہت زیادتی ہوگی جناب۔'' وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ ''میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں کیوں خواہ مخواہ آپ کے تھانے کی حوالات میں بند رہوں؟''

PDF LIBRARY 0333-7412793

"میں نے حوالات میں بند کرنے والی کوئی بات نہیں کی۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "تم تھانے میں رہو گے اور بڑے آرام سے رہو گے۔ بس اتنا سمجھ لو اس دوران میں تمہیں کوئی آزادی حاصل نہیں ہو گی۔"

وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ میں نے فاروق کو حوالدار شیر علی کے حوالے کرنے سے پہلے اسے خصوصی ہدایت کر دی کہ تفتیش کے نام پر اس سے کوئی زیادتی نہ کرے۔ پیار محبت سے بہلا پھسلا کر اس سے کچھ اُگلوانے کی کوشش کرے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ایک تجربہ کار اور ہوشیار قسم کے کانسٹیبل کو لاہور روانہ کر دیا تاکہ قدیر سے مل کر وہ فاروق کے بیان کی تصدیق کر سکے۔ اگر لاہور سے یہ ثابت ہو جاتا کہ فاروق نے اس سلسلے میں کسی غلط بیانی سے کام لیا ہے تو سچ کا اعتراف کروانے کے لئے میں اس کی چمڑی بھی ادھیڑ سکتا تھا۔ خواہ مخواہ اس پر سختی کرنا ٹھیک نہیں تھا۔

میں اس روز تھانے میں اس قدر مصروف رہا کہ دوپہر کا کھانا بہت دیر سے کھانا نصیب ہوا۔ گرمیوں کے موسم میں دوپہر کے کھانے کے بعد نیند ضرور حملہ آور ہوتی ہے اور اگر کھانا تاخیر سے کھایا جائے تو یہ حملہ کچھ زیادہ ہی خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ میں دن بھر موسم کی شدت سے نبرد آزما افراد کی مصروفیات کے حوالے سے بات کر رہا ہوں ورنہ یہ ضروری نہیں کہ ایئر کنڈیشنڈ دفاتر میں وقت گزارنے والے افراد بھی اسی درجے کی نیند محسوس کریں جہاں دن میں کئی مرتبہ چائے کا دور بھی چلتا ہے۔ بس اپنے اپنے مقام کی بات ہے۔

بہرحال سہ پہر چار بجے کے قریب جب میں ذرا فارغ ہوا اور نیند نے مجھے پچھاڑنے کے لئے زور مارنا شروع کیا تو میں نے اے ایس آئی جلال دین سے کہا کہ میں تھوڑی دیر تک کمر سیدھی اور آنکھیں ہلکی کرنے اپنے کوارٹر میں جا رہا ہوں۔ اس دوران میں وہ تھانے کے اندرونی معاملات پر گہری نظر رکھے۔ اے ایس آئی نے مجھے ایسا کرنے کا یقین دلایا تو میں اپنے کمرے سے نکل آیا ...... لیکن مجھے اپنے کوارٹر تک پہنچنا نصیب نہ ہوا۔

میں جیسے ہی کمرے سے نکل کر تھانے کے احاطے میں پہنچا، عابدہ اپنے بڑے بیٹے یوسف کے ساتھ تھانے میں داخل ہوتی دکھائی دی۔

میں یہی سمجھا کہ اسے کہیں سے فاروق کی سن گن مل گئی ہے اور وہ اپنے گم شدہ بیٹے کو "وصول" کرنے تھانے آئی ہے۔ لیکن جب اس سے بات ہوئی تو یہ اور ہی معاملہ نکل آیا۔

"تھانے دار صاحب! میں ایک بہت ہی ضروری مسئلے پر بات کرنے آئی ہوں۔" وہ فکرمند لہجے میں بولی۔ "آپ ذرا اپنے کمرے میں آ جائیں۔"

اس کا انداز یہی ظاہر کرتا تھا وہ تھانے میں فاروق کی موجودگی سے مطلق بے خبر ہے۔

میں ان دونوں کو ساتھ لے کر ایک مرتبہ پھر اپنے کمرے میں آ بیٹھا۔

"ہاں بتاؤ کیا ضروری بات کرنے آئی ہو؟" میں نے عابدہ کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

اس نے جواب دینے سے قبل ایک مرتبہ متفکر نظر سے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ میری سمجھ میں یہی آیا کہ عابدہ مجھے جو کچھ بھی بتانے آئی ہے اس کا تعلق یوسف سے ہے۔ میرا یہ اندازہ درست ہی نکلا۔ وہ بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے تشویش ناک لہجے میں بولی۔

"یوسف! تم تھانیدار صاحب کو اپنے خواب کے بارے میں خود ہی بتا دو۔"

"خواب!" میں نے چونک کر باری باری ان دونوں کو دیکھا۔

"جی تھانے دار صاحب!" عابدہ بولی۔ "یوسف نے ایک بڑا خطرناک خواب دیکھا ہے۔"

میں پوری طرح یوسف کی جانب متوجہ ہو گیا۔ "ہاں بھئی یوسف! تم نے کب اور کیسا خواب دیکھ لیا؟"

"جناب! میں دوپہر کا کھانا کھا کر تھوڑی دیر کے لئے لیٹ گیا تھا۔" وہ نگاہ نیچی رکھتے ہوئے بولا۔ "میری آنکھ لگ گئی اور پھر میں نے وہ ڈراؤنا خواب دیکھا تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔"

خوابوں کے بارے میں میری معلومات محدود تھیں تاہم میں نے یہ سن رکھا تھا دن کے وقت نظر آنے والے خواب عموماً سچے نہیں ہوتے۔ اسی تناظر میں، میں نے یوسف سے کہا۔

"اللہ کے بندے! دن میں تو انسان اوٹ پٹانگ خواب دیکھتا ہے۔ بہرحال بتاؤ تم نے کون سا ڈراؤنا خواب دیکھ لیا؟"

کوئی ایسا ویسا خواب دیکھ کر تھانے دوڑے آنا بڑی عجیب سی بات تھی تاہم میں نے ان دونوں کے لئے اپنے رویے میں کسی قسم کی سختی شامل نہیں کی۔ وہ ایک مصیبت زدہ خاندان کے دو اہم افراد تھے۔ وہ اپنی پریشانی میں کوئی بھی حرکت کر سکتے تھے۔ پریشان ذہن ہمیشہ پریشان کن خواب دیکھتا ہے۔

اس نے جواب میں بتایا۔ "جناب! میں نے خواب میں دیکھا ہے ہماری دکان میں

PDF LIBRARY 0333-7412793

چوری ہوگئی ہے۔"

میں ٹٹولتی ہوئی نظر سے اسے تکنے لگا۔ پچھلے چند روز سے وہ بخار میں مبتلا تھا۔ بیمار اور فکرمند ذہن نے پتہ نہیں اسے کیا دکھا دیا تھا۔ میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"کیا تم اسی دکان کی بات کر رہے ہو جس کے دروازے پر میں نے سرکاری تالا ڈال رکھا ہے؟"

"جی...... جی ہاں ...... وہی۔" وہ جلدی سے بولا۔ "ہماری ایک ہی تو دکان ہے۔"

"تم نے خواب میں کس قسم کی چوری دیکھی ہے؟" میں نے استفسار کیا۔ "کیا چور نے دکان کا دروازہ توڑا ہے؟ اس دُکان میں تو میں نے سائیکل مرمت کا سامان اور چند سائیکلیں رکھی دیکھی تھیں۔ چور کون ہے اور اس نے وہاں سے کیا کیا چرایا ہے؟"

وہ گھبرا کر میری طرف دیکھنے لگا۔ "جناب! اتنے سارے سوالات کے جواب میں کیسے دے سکتا ہوں؟"

"بھئی! خواب تم نے دیکھا ہے اس لئے جواب بھی تم ہی دو گے۔"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ "تھانے دار صاحب! میں نہیں جانتا چور نے ہماری دکان سے کیا کیا چرایا ہے اور نہ ہی مجھے یہ پتہ ہے کہ اس نے دکان کا دروازہ بھی توڑا ہے یا نہیں۔"

اس کا انداز خاصا الجھا ہوا تھا۔ میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔

"پھر تم کس بنا پر کہہ رہے ہو کہ تمہاری دکان میں چوری ہوئی ہے؟"

وہ متذبذب انداز میں بولا۔ "جناب! اس دکان کی پچھواڑے والی دیوار میں ایک چھوٹی سی کھڑکی ہے۔ یہ کھڑکی ہوا کی آمد و رفت کے لئے رکھی گئی ہے۔ جب تک دکان کھلی رہتی ہے ہم اس کھڑکی کو کھول کر رکھتے ہیں اور دکان بند کرتے وقت اسے بھی بند کر کے اندر سے کنڈی لگا دی جاتی ہے۔" وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"تھانے دار صاحب! میں نے خواب میں وہ کھڑکی کھلی ہوئی دیکھی ہے۔"

عابدہ اس کے بیان کی حمایت میں بولی۔ "جناب! میں نے بڑے بوڑھوں سے سن رکھا ہے اگر خواب میں کسی بند گھر کا دروازہ یا کھڑکی کھلی دیکھو تو اس کی تعبیر یہ ہو گی کہ وہاں چوری ہو گی۔"

میں خواب اور اس کی تعبیر کے حوالے سے بحث کا دروازہ نہیں کھولنا چاہتا تھا لہٰذا گفتگو

کو موضوع کی معقولیت تک رکھتے ہوئے ان سے پوچھا۔ میرا مخاطب دراصل یوسف تھا۔

"کیا تم خواب دیکھنے کے بعد سیدھا تھانے دوڑے آئے ہو یا دکان پر جا کر اس کی تصدیق بھی کی ہے؟"

یوسف کے بجائے عابدہ نے جواب دیا۔ "ہم تو سیدھے آپ ہی کے پاس آئے ہیں۔"

اس کی بے وقوفی نما سادگی دیکھ کر مجھے سخت افسوس ہوا تاہم میں نے کسی قسم کی سرزنش کرنے کی بجائے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے ...... میں ابھی تم لوگوں کے ساتھ لاری اڈے چلتا ہوں۔ دکان کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو گا کہ وہاں کس نوعیت کی چوری ہوئی ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے تم لوگوں کے لئے میرے پاس ایک بہت بڑی خوش خبری ہے۔"

انہوں نے چونک کر میری جانب دیکھا اور یکے بعد دیگرے بولے۔ "کیسی خوشخبری؟"

"فاروق واپس آ گیا ہے۔" میں نے گمبھیر آواز میں کہا۔

"کیا......؟" عابدہ اچھل پڑی۔ اس کے اچھلنے میں مامتا کی تڑپ شامل تھی۔ "کہاں ہے میرا بیٹا؟" وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوئی۔

"فاروق کہاں سے ملا تھانیدار صاحب؟" یوسف نے الجھن زدہ لہجے میں دریافت کیا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "وہ کہاں گیا تھا، کیوں گیا تھا، واپس کیوں اور کیسے آیا اور اس وقت کہاں ہے ...... ان تمام سوالات کے جواب میں آپ لوگوں کو بعد میں دوں گا۔ بس اتنا سمجھ لیں کہ وہ صحیح سلامت میری تحویل میں ہے۔ فی الحال ہم لاری اڈے جا رہے ہیں۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔"

میرا یہ فیصلہ یوسف کے خواب کا رہین منت نہیں تھا بلکہ میں اس دکان پر ڈالا ہوا سرکاری تالا کھول کر دکان یوسف کے حوالے کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ کام دھندے پر توجہ دے سکے۔ اس طرح اس کا دھیان بھی بٹ جاتا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ بخار والی لپیٹ سے باہر نکل آیا تھا۔ فاروق والے معاملے کو میں نے دانستہ ان سے چھپایا تھا ...... اور یہ چھپانا تھوڑی دیر کے لئے تھا۔

میں نے ایک کانسٹیبل کو ساتھ لیا اور عابدہ و یوسف کی ہمراہی میں لاری اڈے پہنچ گیا۔

PDF LIBRARY 0333-7412793

مقتول مستری کریم کی سائیکلوں والی دکان لاری اڈے پر ہی تھی چنانچہ اس تک رسائی حاصل کرنے میں ہمیں زیادہ دیر نہ لگی۔

دکان کا دروازہ بند اور اس پر سرکاری تالا موجود تھا۔ میں نے اطمینان بھری سانس خارج کی اور دکان کی عقبی جانب بڑھ گیا۔ وہ تینوں بھی میرے پیچھے لپک آئے۔

دکان کی عقبی دیوار میں موجود کھڑکی واقعی کھلی ہوئی تھی۔ یوسف جوشیلے لہجے میں بولا۔

''دیکھ لیں تھانے دار صاحب! میرا خواب جھوٹا نہیں۔ میں نے یہی کھڑکی بالکل ایسے ہی کھلی دیکھی تھی۔''

''اللہ خیر کرے۔'' عابدہ کے منہ سے تشویش بھرا جملہ خارج ہوا۔

''ابھی دیکھ لیتے ہیں۔'' میں نے یوسف کے جواب میں کہا اور کھڑکی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

وہ ڈیڑھ ضرب دو فٹ کی ایک پٹ والی چوبی کھڑکی تھی جس کا اکلوتا پٹ، چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ کھڑکی کے درے میں کسی قسم کی کوئی آہنی سلاخ نصب نہیں تھی۔ وہ سیدھا سادہ ایک چوبی فریم تھا جہاں سے کوئی بھی بندہ تھوڑی کوشش کر کے اندر باہر آ جا سکتا تھا۔ زمین سے کھڑکی کی اونچائی لگ بھگ پانچ فٹ رہی ہوگی۔

مجھے یاد آیا جب پندرہ مئی کی رات میں وقوعہ کی کارروائی نمٹا رہا تھا تو دکان کے اندر عقبی دیوار میں، میں نے یہ کھڑکی دیکھی تھی لیکن اس وقت کھڑکی بند تھی۔ یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی تھی کہ اس وقت کھڑکی کی کنڈی اندر سے لگائی جا چکی تھی یا نہیں۔ میں نے کھڑکی کا پٹ بند دیکھا تھا۔ اس کی کنڈی کی طرف میرا دھیان نہیں گیا تھا۔ اگر کھڑکی کی کنڈی لگنے سے رہ گئی تھی تو وہ ہوا کے باعث بھی کھل سکتی تھی اور اگر کنڈی کے باوجود بھی وہ کھل گئی تو اس کا ایک ہی مطلب تھا اور وہ یہ کہ کھڑکی کو زبردستی کھولا گیا تھا۔ یہ زبردستی دکان کے باہر سے کھڑکی پر کی گئی تھی۔ ایسی زبردستی کرنے والے کا یقیناً کوئی مقصد بھی رہا ہوگا۔ اگر یہ کارروائی چوری کی نیت سے کی گئی تھی تو دکان کھلنے پر ہی نقصان کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

میں کھڑکی کے نزدیک آ گیا اور بہ غور اس کا جائزہ لینے لگا۔ وہ کھڑکی دکان کے اندر ہی سے کھولی اور بند کی جا سکتی تھی۔ اکلوتے پٹ کے ایک کونے پر اندر کی جانب ٹوٹی ہوئی کنڈی کے آثار نظر آ گئے۔ مذکورہ کنڈی پٹ کے اندرونی طرف نصب ہونے کے باعث پوری طرح دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ تاہم یہ اندازہ قائم کرنے میں مجھے کسی دشواری کا

سامنا نہیں ہوا کہ باہر سے قوت صرف کر کے اس کھڑکی کو کھولا گیا تھا۔

میں نے اس دکان کے اندر چار سائیکلیں، سائیکلوں سے متعلق سپیئر پارٹس اور سائیکل کی مرمت والے اوزار ہی دیکھے تھے جن میں ہوا بھرنے والا وہ پمپ بھی شامل تھا جس کی ''اچھوتی'' ضرب نے مستری کریم کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس تنگ سی کھڑکی کے راستے مختلف قسم کا ساز و سامان تو پار کیا جا سکتا تھا مگر پوری سائیکل کو نکال لے جانا ممکن نہیں تھا۔ میں اس پراسرار اجنبی چور کے اغراض و مقاصد پر غور کرتے ہوئے دکان کے دروازے کی طرف چلا آیا۔

میرے حکم پر کانسٹیبل نے دکان کا تالا کھولا اور ہم سب دکان کے اندر پہنچ گئے۔ اس وقت سہ پہر عروج پر تھی لہٰذا کھڑکی اور دروازہ کھل جانے کے باعث دکان میں اجالا بھر گیا۔ وہاں موجود ہر شے ہمیں نمایاں نظر آنے لگی۔

میں نے ایک لمحے میں طائرانہ نگاہ ڈال کر یہ اندازہ لگا لیا کہ وہاں کسی قسم کی چوری نہیں ہوئی تھی البتہ وہاں موجود چیزوں کی ترتیب وغیرہ میں کچھ فرق محسوس ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کچھ اشیاء کو اِدھر اُدھر کر کے ان کی جگہ بدل دی گئی ہو۔ سائیکلیں چاروں کی چاروں موجود تھیں تاہم وہ ایک دوسرے کے اوپر لیٹی ہوئی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے دھکا دے کر انہیں گرایا گیا ہو۔ جب کہ پندرہ مئی کی رات میں نے وقوعہ پر انہیں ترتیب وار ایک قطار میں کھڑے دیکھا تھا۔ آثار سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ دکان کے اندر داخل ہونے والے متوقع اور مبینہ ''چور'' کا ہاتھ ایک سائیکل کو لگ گیا ہوگا اور اس ''ٹچ'' نے یکے بعد دیگرے چاروں سائیکلوں کو ''لم لیٹ'' کر دیا۔

بادی النظر میں تو یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہاں سے کس قسم کی کوئی شے چوری نہیں ہوئی تاہم میں نے سرسری لہجے میں یوسف سے کہا۔

''اچھی طرح چیک کر لو بھئی، چور نے تمہاری دکان کو کتنا نقصان پہنچایا ہے؟''

یہ کہتے ہوئے میں نے اس کھڑکی کی جانب قدم بڑھا دیئے جسے یوسف نے آج دن کے خواب میں دیکھا تھا۔ جائے وقوعہ کی کارروائی مکمل کرنے کے دوران میں، میں نے وہاں کا نقشہ بناتے وقت ان تمام اشیاء کا اندراج کیا تھا جو اس وقت دکان کے اندر موجود تھیں۔ تاہم یہ تفصیلی رپورٹ اس وقت میرے پاس نہیں بلکہ تھانے میں میری میز کی دراز میں رکھی تھی۔ اس رپورٹ کی روشنی میں یہ بھی دیکھا جا سکتا تھا کہ وہاں سے کوئی چیز چوری ہوئی تھی یا نہیں۔

PDF LIBRARY 0333-7412793

کھڑکی کے اندرونی تنقیدی جائزے کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ دکان کے اندر کوئی داخل تو ہوا تھا اور اس داخلے کے لئے اس نے مذکورہ کھڑکی ہی کو وسیلہ بنایا تھا جس کی خاطر اس شخص کو کھڑکی کے ساتھ زور زبردستی کرنا پڑی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں کھڑکی چھوڑ کر یوسف کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"کیوں بھئی ......تم نے چوری شدہ مال کا تخمینہ جوڑ لیا؟"

"تھانے دار صاحب! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، یہ چکر کیا ہے!" وہ اپنی پیشانی کو مسلتے ہوئے بولا۔ "چیزیں تو سب موجود ہیں مگر انہیں اِدھر اُدھر بکھیر دیا گیا ہے۔"

"وہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

اس سوچ میں گہرا تفکر شامل تھا۔ اپنی جگہ نہ سہی لیکن ہر شے وہاں موجود تھی مگر میں یوں محسوس کر رہا تھا جیسے وہاں کوئی تبدیلی واقع ہو چکی ہو۔ کیا؟ یہ ذہن میں واضح نہیں ہو پا رہا تھا۔ اگر چور کو وہاں سے کچھ چرانا ہی نہیں تھا تو پھر وہ کس مقصد کی خاطر وہاں داخل ہوا تھا اور وہ بھی پچھواڑے والی کھڑکی توڑ کر! اب یہ تو ممکن نہیں تھا کہ وہ اللہ کا بندہ محض ایک سرسری "وزٹ" کے لئے کھڑکی توڑ کر وہاں گھسا ہو۔

دکان میں رکھے سامان کی بے ترتیبی اور افراتفری سے یہ ظاہر ہوتا تھا جیسے آنے والے کو وہاں کسی خاص شے کی تلاش ہو۔ ایک ایسی دکان جس کا دکان دار چند روز پہلے قتل ہو چکا ہو، اس دکان میں رکھے آلاتِ مرمتِ سائیکلان سے کسی کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی!

میں انہی خیالات سے گتھم گتھا تھا کہ ذہن میں ایک چمک سی نمودار ہوئی۔ اس چمک میں مجھے ایک خطرناک سوال کی جھلک دکھائی دی ...... کہیں یہ متوقع اجنبی چور بلا واسطہ یا بالواسطہ کریم مستری کے قتل میں ملوث تو نہیں؟

یہ ایک نہایت ہی اہم اور اچھوتا خیال تھا۔ اگر وہ شخص واقعی کسی بھی حوالے سے کریم مستری کے قتل میں ملوث تھا تو پھر وہ وہاں اپنے جرم کے کسی اہم ثبوت کو مٹانے آیا تھا۔ اس کا یہ "عمل" کسی بھی نوعیت کا ہو سکتا تھا۔ ممکن ہے وہ دکان میں سے کوئی ایسی شے تلاش کر کے اپنے ساتھ لے جانے آیا ہو جو اس کے جرم کی جانب اشارہ کرتی ہو۔ میرے ذہن میں صورتحال واضح نہیں تھی تاہم میں ایک نتیجے پر پہنچ چکا تھا اور وہ یہ کہ کھڑکی توڑ کر دکان کے اندر گھسنے والا شخص "کریم مرڈر کیس" میں بہت زیادہ اہمیت کا حامل تھا!

عابدہ گہری نظر سے مجھے سوچتے ہوئے دیکھ رہی تھی، بولی۔ "تھانے دار جی! لعنت بھیجیں اس چور پر۔ اللہ کا شکر ہے ہماری کوئی چیز چوری نہیں ہوئی۔" پھر وہ اپنے بیٹے سے

مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

"یوسف پتر! تم اس سارے سامان کو ٹھیک ٹھاک کر کے رکھ دو۔ کل سے تمہیں دکان کھولنی ہے۔ کب تک گھر میں گم صم پڑے رہو گے۔"

بات ختم کرتے ہی اس نے اجازت طلب نظر سے میری جانب دیکھا۔ میں پہلے ہی اسی ارادے سے اِدھر آیا تھا کہ آج اس دکان پر پڑا ہوا سرکاری تالا کھول دوں گا تا کہ یوسف رزق روزگار کے معاملات کو جاری رکھ سکے لہٰذا میں نے اس سلسلے میں کوئی اعتراض نہ کیا اور دکان کے ایک کونے میں کھڑا یوسف کو کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میرے اشارے پر ہمارے ساتھ آنے والا کانسٹیبل بھی اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔

میں نے یوسف سے تاکیدی انداز میں کہا۔ "دکان بند کرنے سے پہلے کھڑکی کی مرمت ضرور کروا لینا۔ اس کی کنڈی ہی بدلوا ڈالو تو اچھا ہے۔ کھڑکی پر ایسی کنڈی لگواؤ جس میں اندر سے تالا بھی لگایا جا سکتا ہو۔"

"ٹھیک ہے جناب۔" وہ بڑی فرماں برداری سے بولا۔ "میں ذرا یہ سامان سیٹ کر لوں، پھر بڑھئی کو بلا کر لاتا ہوں اور دکان سے اس کھڑکی کے لئے ایک چھوٹا سا تالا بھی خرید لاتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر وہ کام میں مصروف ہو گیا۔ میں بڑی دلچسپی سے انہیں کام کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ عابدہ نے مجھے مخاطب کر لیا۔

"تھانے دار جی! آپ نے بتایا ہے فاروق واپس آ گیا ہے اور آپ کی تحویل میں ہے۔ آپ اسے میرے حوالے کب کریں گے؟"

"حوالے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں بعد میں فیصلہ ہو گا۔" میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "یہاں سے فارغ ہونے کے بعد تم ماں بیٹا تھانے آ جاؤ، پھر بات کرتے ہیں۔"

وہ تشویش بھرے لہجے میں بولی۔ "میرا بیٹا خیریت سے تو ہے نا جی؟"

"وہ بالکل خیریت سے ہے اور میری حفاظت میں ہے۔"

"پر آپ اسے میرے حوالے کیوں نہیں کر سکتے؟" اس کے لہجے میں ہلکا سا احتجاج تھا۔

میں نے کہا۔ "ہے ایک چھوٹی سی پیچیدگی۔ اس پر بھی تھانے چل کر ہی بات ہو گی۔"

وہ ماں تھی اس لئے اسے قرار نہیں پڑ رہا تھا۔ اس نے بے چینی سے کہا۔ "وہ کہاں چلا

PDF LIBRARY 0333-7412793

گیا تھا؟"

"وہ جہاں بھی گیا تھا اب واپس آ گیا ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تمہارے اطمینان کے لئے اتنا ہی کافی ہونا چاہئے۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ پھر اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ میں فی الحال اس موضوع کو چھیڑنا نہیں چاہتا۔ اس دوران میں یوسف اور کانسٹیبل دکان کی "سیٹنگ" سے فارغ ہو گئے تھے۔ میں نے یوسف کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بھئی! اچھی طرح دیکھ بھال لیا...... تمہاری دکان کی کوئی شے گئی تو نہیں؟"

"نہیں جی، ہر چیز موجود ہے۔" اس نے دکان میں چاروں جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

"اور کسی چیز کا اضافہ بھی نہیں ہوا؟" میں نے سرسری انداز میں سوال کیا۔

"جی!" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میرا مطلب ہے اگر چور یہاں سے کچھ لے کر نہیں گیا تو کیا کچھ دے کر بھی نہیں گیا؟"

یوسف کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا جواب دے۔ جزبز ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

عابدہ نے جلدی سے کہا۔ "یہ اتنا بڑا انعام تو دے کر گیا ہے!" اس کا اشارہ ٹوٹی ہوئی کھڑکی کی جانب تھا۔

غربت اور مفلسی میں اگر ایک پیسے کا نقصان بھی ہو جائے تو وہ ایک لاکھ سے کم محسوس نہیں ہوتا۔ میں عابدہ اور اس کے گھر کی حالت زار سے بخوبی آگاہ تھا اس لئے اس کے احساسات کو سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔

میں نے پریشان اور نادان صورت یوسف کا کندھا تھپتھپایا اور نہایت ہی تسلی بخش لہجے میں کہا۔ "زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کل سے جم کر دکان پر بیٹھو۔ میں فاروق کو بھی سمجھاؤں گا کہ وہ تمہارا ہاتھ بٹائے۔ دونوں بھائی کندھے سے کندھا جوڑ کر معاشی عفریت کا مقابلہ کرو گے تو تمہارے دن پھر جائیں گے۔ اب تم دونوں ہی اس گھر کے بڑے ہو۔ چھوٹے تو بہن بھائیوں کی نظریں تمہی دونوں پر لگی ہوئی ہیں۔"

"آپ نے ابھی تک یہ نہیں بتایا، فاروق کہاں ہے؟" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

"بتا دوں گا...... بتا دوں گا۔" میں نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "تم یہاں

سے فارغ ہو کر میرے پاس تھانے آ جاؤ۔ میں فاروق سے تم دونوں ماں بیٹے کی ملاقات کرا دوں گا۔"

"تت...... تو کیا وہ تھانے میں بند ہے؟"

"بس تھانے میں ہے۔" میں نے کہا۔ "بند اور کھلے کے چکر کو فی الحال بھول جاؤ۔"

"فاروق تھانے میں ہے تو اس کا مطلب ہے اس نے کوئی جرم وغیرہ کیا ہے۔"

"ہاں...... ایسی ہی بات ہے۔" میں نے گول مول جواب دیا۔

اس کے بعد یوسف نے کوئی سوال نہیں کیا۔ عابدہ بھی ہماری اس گفتگو کو سن رہی تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھ لیا۔ "تھانے دار جی! یہ تو بتا دیں آخر میرے بیٹے نے ایسا کون سا جرم کیا ہے جو آپ نے اسے تھانے میں بند کر رکھا ہے؟"

"میں نے کہا نا، تھانے میں تفصیلی بات ہو گی۔" اچانک میرا انداز تنبیہی ہو گیا۔

عابدہ خاموش ہو گئی۔ میرے لہجے کی قطعیت نے اسے متاثر کیا تھا۔

میں کانسٹیبل کے ساتھ دکان سے نکل کر تھانے کی طرف چل پڑا۔

٭☆٭

بعض سپرہٹ اور مقبول خاص و عام کی فلموں میں فلاں "کھڑکی توڑ" ہفتہ کی اصطلاح تو سننے میں آئی تھی لیکن مقتول کریم مستری کی دکان میں جو "کھڑکی توڑ" پروگرام پیش کیا گیا تھا اس کے حوالے سے سوچ سوچ کر میرا ذہن الجھ رہا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ اسے ایک غیر اہم واقعہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا۔ کھڑکی توڑ شخص نظر انداز کرنے کے قابل نہیں تھا۔

میں تھانے میں بیٹھا اسی معمے کو حل کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ مجھے اس دکان میں جو کچھ بھی غیر معمولی محسوس ہوا تھا اسے چیک کرنے کے لئے میں نے جائے وقوعہ کی رپورٹ یعنی مشیر نامہ کھول کر سامنے رکھ لیا تھا۔ میرا ذہن بار بار ایک ہی اشارہ دے رہا تھا کہ کھڑکی توڑ، نامعلوم چور کا کوئی نہ کوئی تعلق کریم کے قتل سے ضرور ہے اور وہ اپنے جرم کی پردہ پوشی کے لئے ہی دکان میں گھسا تھا۔ وہ دکان میں سے کوئی شے چرا کر بھاگا یا کوئی دیگر کارروائی ڈال کر رخصت ہوا تھا، یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ دکان میں موجود اشیاء میں نے دیکھی تھیں، وہ سب وقوعہ کی رپورٹ میں موجود تھیں۔ پھر گڑبڑ کہاں تھی؟

اس سوال کے بعد ایک تاریک راہ کھلتی تھی جس پر چلتے ہوئے ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں

PDF LIBRARY 0333-7412793

دیتا تھا۔ سوچ کو کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اگر وہ نا معلوم چور میرے ہتھے چڑھ جاتا تو مجھے یقین تھا میں مستری کریم کے قاتل تک ضرور پہنچ سکتا تھا۔

میں نے اس سلسلے میں کھوجی سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ مبینہ نا معلوم چور کھڑکی کے راستے دکان میں داخل ہوا۔ وہاں اس نے کوئی کارروائی کی اور پھر کھڑکی کے راستے ہی فرار ہو گیا۔ اس کا مطلب تھا دکان کے اندر اور پچھواڑے میں اس کا کھرا موجود ہو گا۔ اگر کھوجی کھرا پکڑنے میں کامیاب ہو جاتا تو چور تک رسائی ممکن ہو جاتی۔

میں نے کھوجی کرم دین کی جانب ایک بندہ دوڑایا لیکن پتہ چلا کہ وہ اس روز قصبے میں موجود نہیں تھا۔ اس کے گھر والوں سے معلوم ہوا وہ رات کو واپس آ جائے گا۔ لہٰذا کھرے والا منصوبہ اگلے دن پر ٹل گیا۔

مستری کریم کا دشمن ابھی تک صرف ایک بندہ علی نواز کی صورت سامنے آیا تھا۔ علی نواز کے بارے میں یہ سوچا جا سکتا تھا وہ اپنے بیٹے گلزار کی محبت سے مجبور ہو کر کریم کا کام تمام کر دے لیکن اس سلسلے میں ایک پیچیدگی بھی سامنے آ رہی تھی۔ اگر یہ فرض کر لیا جاتا کہ علی نواز ہی مستری کریم کا قاتل ہے اور ہمارا مبینہ چور بھی وہی شخص ہے تو پھر چوری والا واقعہ اس پر فٹ نہیں بیٹھتا تھا۔ وہ اٹھارہ مئی کی صبح سے میری تحویل میں تھا اور اس پر تفتیش جاری تھی۔ جبکہ کھڑکی ٹوٹنے والا واقعہ اُنیس مئی یعنی آج کا تھا۔ کل رات تک وہ صحیح سلامت تھا۔ اس بات کی تصدیق میں دکان میں یوسف سے کر چکا تھا۔ ان حالات و واقعات سے جو نتیجہ سامنے آتا تھا اس کے مطابق بڑے وثوق سے یہ کہا جا سکتا تھا علی نواز کسی بھی حوالے سے کریم کے قتل میں ملوث ہے یا نہیں، اس سے قطع نظر کھڑکی توڑ کر دکان میں گھسنے والا شخص ہرگز وہ نہیں تھا۔

میں لگ بھگ پانچ بجے سہ پہر تھانے پہنچ گیا تھا اور توقع کر رہا تھا کہ آدھے پونے گھنٹے میں یوسف بھی اپنی ماں کے ساتھ میرے پاس آ جائے گا لیکن میری توقع غلط ثابت ہوئی اور وہ لوگ ساڑھے سات بجے شام تھانے پہنچے۔

”بھئی تم دونوں کہاں رہ گئے تھے؟“ ان پر نگاہ پڑتے ہی میں نے کہا۔ ”میں کب سے تم لوگوں کا انتظار کر رہا ہوں۔ ادھر تمہارا بیٹا فاروق بھی بیٹھا سوکھ رہا ہے۔“ آخری جملہ میں نے عابدہ کی طرف دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔

یوسف بولا۔ ”تھانے دار جی! میں نے لگے ہاتھوں دکان کی صفائی بھی کر ڈالی ہے۔ کافی دنوں سے وہ بند تھی۔ پھر میں گھر چلا گیا اور اب اچھی طرح نہا دھو کر آپ کے پاس

آیا ہوں۔ اماں کو میں نے آپ کے جانے کے بعد گھر بھیج دیا تھا۔“

یوسف کے وضاحتی جواب نے مجھے اچھا خاصا مایوس کر دیا۔ دکان کی صفائی ستھرائی کا ایک ہی مطلب تھا اور وہ یہ کہ اب وہاں سے کسی قسم کا کھرا نہیں اٹھایا جا سکتا تھا۔ بہرحال اب اس سلسلے میں کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ کھرے والا پروگرام دکان کے پچھواڑے سے شروع کرنا مجبوری تھی۔

میں نے اپنے چہرے کے تاثرات میں فوری تبدیلی لاتے ہوئے کہا۔ ”چلو کوئی بات نہیں۔ کھڑکی وغیرہ کی مرمت تو ٹھیک طرح سے کروا لی ہے نا تم نے؟“

”جی ...... جی ہاں......“ اس نے جواب دیا۔

عابدہ میرے کمرے میں چاروں جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے اضطراری لہجے میں مستفسر ہوئی۔ ”تھانے دار جی! آپ نے تو کہا تھا فاروق آپ کی تحویل میں ہے۔ مگر وہ تو مجھے کہیں نظر نہیں آ رہا!“

میں ایک ماں کی بے قراری اور تڑپ کو بڑی گہرائی سے محسوس کر رہا تھا لیکن فرض کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ میں اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریوں کے سبب فوری طور پر فاروق کو ان کے حوالے نہیں کر سکا تھا۔ وہاں البتہ چہرہ نمائی اور مختصر ملاقات کی گنجائش موجود تھی۔ فاروق کی جان بخشی تو اسی وقت ممکن تھی جب لاہور سے واپس آنے والا کانسٹیبل اس کے بیان کی تصدیق کر دیتا۔

میں نے عابدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم کیا سمجھتی ہو میری تحویل اسی کمرے تک محدود ہے؟ اگر فاروق اس کمرے میں موجود نہیں تو پھر میری تحویل میں بھی نہیں۔“ میں ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”فاروق سے میں ابھی تم دونوں کی ملاقات کروا دیتا ہوں۔ لیکن اس سے پہلے میں تم کو اس کی کہانی ضرور سناؤں گا۔“

وہ ہمہ تن گوش ہو کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں انہیں فاروق کے گھر سے فرار ہونے، لاہور پہنچنے، وہاں مزدوری کرنے اور بالآخر بازارِ حُسن کے ایک کوٹھے سے گرفتار ہونے کے واقعات سے آگاہ کر دیا۔ میں خاموش ہوا تو عابدہ جھٹ سے بولی۔

”جو بیت گیا اس پر مٹی ڈالیں جی۔ فاروق زندہ سلامت واپس آ گیا ہے۔ آپ اسے ہمارے حوالے کر دیں۔“

PDF LIBRARY 0333-7412793

"فی الحال ایسا نہیں ہو سکے گا۔" میں نے قطعیت سے کہا۔ "میں نے اپنا ایک بندہ لاہور بھیجا ہے۔ وہ واپس آ جائے تو پھر میں فیصلہ کروں گا، فاروق کو چھوڑنا ہے یا نہیں۔"

وہ ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ "یہ تو آپ عجیب بات کر رہے ہیں۔ آپ کا جو بندہ لاہور گیا ہے اس کا فاروق سے کیا تعلق؟"

"تعلق بہت گہرا ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "وہ بندہ فاروق کے بیان کی تصدیق کے لئے لاہور گیا ہے۔"

"پتہ نہیں یہ کیا نیا چکر چل رہا ہے۔" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔

یوسف بولا۔ "تھانے دار جی! ادھر دکان میں بھی میں نے یہ سوال کیا اور یہاں بھی میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ نے فاروق کو کسی سنگین الزام میں بند کر رکھا ہے۔"

"الزام تو سنگین ہی ہے۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "بس تصدیق یا تردید کا انتظار ہے۔"

"آخر اس نے کیا، کیا ہے؟" وہ جھنجلاہٹ بھری آواز میں بولا۔

"مجھے شک ہے فاروق نے اپنے باپ کو قتل کیا ہے۔"

"ہائے میں مرگئی ......" عابدہ سینہ تھامتے ہوئے بولی۔

یوسف کی زبان سے بے ساختہ برآمد ہوا۔ "نن...... نہیں ...... یہ نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ فاروق اپنے باپ سے شدید نفرت کرتا تھا۔"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ "نفرت اپنی جگہ لیکن فاروق نے ابا کو قتل نہیں کیا۔"

"تم یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ "تمہارے انداز سے تو ظاہر ہوتا ہے تم اصل قاتل سے واقف ہو۔"

"یہ بات نہیں۔" وہ بری طرح گڑبڑا گیا۔

"پھر کیا بات ہے؟"

"وہ ...... وہ دراصل میں یہ کہہ رہا تھا کہ فاروق تو چار مئی کو گھر سے نکل گیا تھا اور اب ملا ہے۔" وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں مجھے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ "ابا کا قتل پندرہ مئی کو ہوا ہے۔ اس دن فاروق قصبے میں موجود ہی نہیں تھا تو پھر......"

"فاروق کا بھی یہی موقف ہے۔" میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ "اسی سلسلے میں، میں نے ایک تجربہ کار بندہ لاہور دوڑایا ہے تا کہ فاروق کے بیان کی

تصدیق ہو سکے۔"

"اوہ......" یوسف نے ایک گہری سانس خارج کی اور ماتھے پر نمودار ہونے والے پسینے کو آستین کی مدد سے صاف کرنے لگا۔

عابدہ بولی۔ "کچھ بھی ہے، آپ فاروق کو مجھ سے ملوائیں تو سہی۔ میں اس سے خود پوچھوں گی کہ......"

عابدہ کی بات ادھوری رہ گئی۔ اسی وقت ایک کانسٹیبل نے میرے کمرے میں آ کر اطلاع دی کہ لاہور جانے والا پولیس اہلکار واپس آ گیا ہے۔ میں نے مذکورہ کانسٹیبل کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

آئندہ دس منٹ میں اس نے فاروق کے بیان کی تصدیق کر دی۔

یوسف اور عابدہ کے چہرے خوشی سے تمتما اٹھے۔ یہ جان لینے کے بعد کہ فاروق اپنے باپ کے قتل کے الزام سے "صاف" ثابت ہو گیا ہے وہ مطمئن ہو گئے تھے۔

میں نے فاروق کے سلسلے میں قانونی کاغذی کارروائی مکمل کی اور فاروق کو چند ہدایات دینے کے بعد ان لوگوں کے ساتھ روانہ کر دیا۔

رات ساڑھے نو کے قریب کھوجی کرم دین میرے پاس تھانے آیا اور سلام کرنے کے بعد بولا۔ "ملک صاحب! مجھے گھر والوں نے بتایا ہے آپ کو کسی کام کے سلسلے میں میری ضرورت پڑ گئی ہے؟"

"تمہیں بالکل درست بتایا گیا ہے۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ پھر مختصر الفاظ میں اپنا مقصد دہرانے کے بعد آخر میں کہا۔ "دکان کے اندر کی صفائی کی جا چکی ہے اس لئے وہاں سے کھرا اٹھانا ممکن نہیں ہو سکے گا۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ پُر سوچ مگر با اعتماد انداز میں بولا۔ "میں دکان کے پچھواڑے سے کام شروع کروں گا۔ انشاء اللہ آپ کا کام ہو جائے گا۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے پوچھا۔ "کھڑکی توڑ کر دکان کے اندر گھسنے والا واقعہ کب کا ہے؟"

"گزشتہ رات یا پھر آج علی الصباح یہ واردات عمل میں آئی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے زیادہ وقت نہیں گزرا۔" اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک نمودار ہوئی۔ "مجھے اپنے کام کے لئے زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ اس سلسلے میں آپ کو مجھ سے تعاون کرنا ہوگا۔"

PDF LIBRARY 0333-7412793

میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''بولو کیا چاہتے ہو؟''
اس نے کہا۔ ''آپ نے بتایا ہے کہ آج سہ پہر آپ تفتیش کے سلسلے میں اس طرف گئے تھے۔ دکان کے اندر اور پچھواڑے میں آپ نے کچھ وقت گزارا ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں آپ کتنے افراد تھے اور اس کے ساتھ ہی ان تمام افراد کے پاؤں بھی مجھے دیکھنا ہوں گے تا کہ چور کا کھرا آپ لوگوں کے کھرے سے الگ پہچانا جا سکے۔''

''یہ کوئی مشکل کام نہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہم کل چار افراد تھے۔ ایک میں اور کانسٹیبل، دوسرے یوسف اور اس کی ماں عابدہ۔ کانسٹیبل اور میں یہاں تھانے میں موجود ہیں۔ تم ہمارے کھرے کا نمونہ لے لو۔ یوسف اور اس کی ماں کے پاؤں کو صبح چیک کر لینا۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ گمبھیر آواز میں بولا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

میں نے اس کی آسانی کے لئے بتا دیا کہ ہم نے دکان کے پچھواڑے جانے کے لئے کون سا راستہ اختیار کیا تھا تا کہ اسے اس سلسلے میں زیادہ وقت صرف نہ کرنا پڑے۔ وہ معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے اپنے کام میں جتا رہا۔ جب وہ اس تکنیکی مشاہدے اور تجزیے سے فارغ ہوا تو میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''کرم دین! تم اپنے کام کا آغاز کب کرو گے؟''

''صبح سے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اس وقت رات کے اندھیرے میں تو ممکن نہیں۔ البتہ کل جیسے ہی اجالا کھلے گا میں دکان کے پچھواڑے سے کھرا اٹھانے کی مہم شروع کر دوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے تائیدی لہجے میں کہا۔ ''اور جیسے ہی کوئی اہم بات سامنے آئے مجھے اطلاع کر دینا۔''

''ظاہر ہے جی، آپ کو نہیں بتاؤں گا تو اور کس کو بتاؤں گا۔'' وہ پیشہ ورانہ انداز میں بولا۔

تھوڑی دیر بعد کرم دین مجھے سلام کر کے تھانے سے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

پتہ نہیں کیا بات تھی کہ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔
میرے ساتھ ایسا بہت کم ہوتا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد عشا کی نماز ادا کرتا اور تھوڑی دیر بعد سونے کے لئے بستر پر لیٹ جاتا۔ آج رات بھی میں نے یہی عمل دہرایا تھا

مگر ذہن اس قدر الجھا ہوا تھا کہ آدھی رات گزر جانے کے بعد بھی نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور ...... نیند کی اس دوری کا سبب تھا وہ نا معلوم، نا معقول چور جس نے مقتول مستری کریم کی دکان میں کھڑکی کے راستے رسائی حاصل کی تھی۔ میں ہر صورت میں اس شخص تک پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ اس کیس کا ایک اہم کردار تھا۔

مذکورہ چور کریم کا قاتل ہو سکتا تھا یا پھر اس کے توسط سے میں قاتل تک رسائی حاصل کر سکتا تھا۔ بار بار میرے ذہن میں ایک ہی سوال سر اٹھا رہا تھا...... یہ کون شخص ہے...... مجھے کہاں ملے گا؟

انہی سوالیہ خیالات سے الجھتے ہوئے میں پتہ نہیں کب نیند کی وادی میں اتر گیا۔

رات کو دیر سے سویا تھا لہٰذا صبح معمول سے کچھ دیر سے آنکھ کھلی۔ نماز کا وقت جانے ہی والا تھا چنانچہ میں نے جلدی جلدی وضو کر کے پہلے نماز ادا کی پھر ناشتے کی تیاری کرنے لگا۔ اس دوران میں اجنبی چور، اس کی پراسرار ''چوری'' والا قصہ ایک مرتبہ پھر کسی فلم کی مانند میرے ذہن میں چلنے لگا تھا۔

ناشتہ اختتام پر تھا کہ میرے ذہن میں اچانک تیز روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا۔ انسان اگر کسی ایک نقطے پر توجہ مرکوز کر کے اس کے بارے میں مسلسل سوچنا شروع کر دے تو اس کا ذہن اس نقطے کو ایک وسیع میدان میں بدل دیتا ہے۔ اس کی نگاہ کے سامنے نئی راہیں اور شاہراہیں کھل جاتی ہیں۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ مستری کریم کی دکان اور نامعلوم پراسرار چور کے حوالے سے میرے ذہن نے مجھے ایک انوکھی راہ سجھائی تھی۔

میں نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور کوارٹر سے نکل کر تھانے میں اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ پھر اپنی میز کی دراز میں سے وقوعہ کی کارروائی سے متعلق رپورٹ نکال کر اضطراری انداز میں اس کا مطالعہ کرنے لگا۔

مجھے ایک خاص شے کی تلاش تھی۔ میں اس رپورٹ سے ایک ایسا نقطہ ڈھونڈنا چاہتا تھا جو میرے ذہن میں ہونے والے جھماکے کی تشفی کر سکے گا...... میں اپنی کوشش میں ناکام ہو گیا اور یہ ناکامی درحقیقت میری کامیابی تھی۔

میرے اعصاب تن گئے اور پورے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ اس وقت میرے ذہن میں یوسف کے کہے ہوئے الفاظ گونج رہے تھے۔ مستری کریم کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوانے کے بعد میں نے یوسف کے ساتھ پیدل ہی اس کے گھر کی جانب قدم بڑھا دیئے تھے۔ راستے میں، میں اس سے مختلف سوالات بھی کرتا رہا تھا اور ایسے ہی

PDF LIBRARY 0333-7412793

میرے ایک سوال کے جواب میں اس نے بتایا تھا۔

''تھانے دار صاحب! جب اماں کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ ابا گھر نہیں پہنچا تو میں اسے دیکھنے دکان کی طرف چلا گیا۔ میں نے دکان کے اندر ابا کو بے ڈھنگے انداز میں پڑے دیکھا۔ اس وقت تک اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں نے ماچس جلائی تو اس ناکافی روشنی میں، میں نے ابا کی گردن میں بندھی ہوئی سائیکل کی ٹیوب دیکھ لی۔ میں تیلی پر تیلی جلاتا گیا اور پھر......''

یوسف کے کہے ہوئے یہ الفاظ بار بار میرے ذہن میں گونج رہے تھے۔ مگر مشیر نامہ ان الفاظ کی نفی کر رہا تھا۔ جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کرتے وقت میں نے معمولی سے معمولی اور چھوٹی سے چھوٹی شے کا بھی اندراج کیا تھا پھر ماچس کی جلی ہوئی متعدد تیلیاں کہاں چلی گئیں؟ رپورٹ میں ان کا ذکر کیوں نہیں تھا؟ اگر میں نے ان کا اندراج نہیں کیا تھا تو اس کا مطلب تھا وہ وہاں موجود نہیں تھیں۔ لیکن کل جب میں دوبارہ اس دکان میں داخل ہوا تو فرش پر مجھے جلی اور ادھ جلی بے شمار تیلیاں دکھائی دی تھیں۔

کھڑکی توڑ کر دکان میں گھسنے کا راز عیاں ہو گیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، تیلیاں پھینکنے کے مقصد سے دکان میں داخل ہوا تھا تاکہ کہانی کی کمزوری کو طاقت کا انجکشن لگا کر دور کیا جا سکے اور وہ شخص ...... یوسف بھی ہو سکتا تھا۔

تیلی پر تیلی جلانے والی کہانی یوسف ہی نے مجھے سنائی تھی۔ وقوعہ کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد میں نے دکان پر سرکاری تالا ڈال دیا تھا۔ رپورٹ میں تیلیوں کا ذکر نہیں تھا۔ بعد ازاں مذکورہ تیلیوں کو دکان کے اندر پہنچانے کے لئے دو ہی راستے استعمال کئے جا سکتے تھے۔ نمبر ایک دکان کا دروازہ، نمبر دو پچھواڑے والی کھڑکی۔ دروازے پر سرکاری تالا موجود تھا لہٰذا اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے کھڑکی والا وسیلہ اختیار کیا گیا ...... اور مجھے اس جانب متوجہ کرنے کے لئے ''خواب'' کا سہارا لیا گیا۔

حالات و واقعات سراسر یوسف کی طرف اشارہ کر رہے تھے اور یوسف کو اس ڈرامے کی ضرورت اسی صورت پیش آ سکتی تھی جب وہ کسی جرم میں ملوث ہو۔ تو کیا کریم کو اس کے بیٹے یوسف نے ہی قتل کیا تھا؟

اس سوال نے میرے ذہن میں ہلچل سی مچا دی اور میں نے فی الفور اے ایس آئی جلال دین کو اپنے کمرے میں بلایا۔ جلال دین وقوعہ کی کارروائی کے دوران میرے ساتھ تھا۔ میں کوئی عملی قدم اٹھانے سے قبل ایک چھوٹی سی بات کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔

اے ایس آئی میرے کمرے میں آیا تو میں نے اس سے پوچھا۔ ''جلال دین! تمہارا حافظہ کیسا ہے؟''

''الحمد للہ ملک صاحب! میرا حافظہ اور ہاضمہ دونوں فرسٹ کلاس ہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''کیا مسئلہ ہے، آپ چہرے سے کافی الجھے ہوئے نظر آ رہے ہیں؟''

''الجھا ہوا تھا، اب نہیں ہوں۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''اپنی یادداشت پر زور دو اور اس رات کو ذہن میں لانے کی کوشش کرو جب ہم مستری کریم کی دکان پر وقوعہ کی کارروائی میں مصروف تھے۔''

''جی ملک صاحب! وہ منظر میرے ذہن میں تازہ ہے......'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔

میں نے کہا۔ ''ذرا سوچ کر بتاؤ، دکان کے فرش پر اس رات تمہیں جلی ہوئی ماچس کی تیلیاں بھی نظر آئی تھیں؟''

اس نے ایک لمحے سوچا اور پُر یقین انداز میں جواب دیا۔ ''نہیں ملک صاحب! دکان کے فرش پر ایک بھی تیلی پڑی ہوئی نہیں تھی۔ میں تو لاری اڈے سے ایک ویگن پکڑ لایا تھا جس کی ہیڈ لائٹس نے دکان کے اندر روشنی بھر دی تھی۔ اگر دکان کے فرش پر ماچس کی تیلیاں موجود ہوتیں تو وہ نگاہوں میں آئے بغیر رہ ہی نہیں سکتی تھیں۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جناب! آپ وقوعہ کی رپورٹ دیکھ لیں نا ...... مجھے یقین ہے اس رپورٹ میں کہیں بھی ماچس کی تیلیوں کا ذکر نہیں ہو گا۔''

میں نے میز پر رکھی مذکورہ رپورٹ کو جلال دین کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا یقین بجا ہے۔''

وہ میرے ہاتھ سے رپورٹ لینے کے بعد سنسنی خیز انداز میں بولا۔ ''ملک صاحب! لگتا ہے آپ مستری کریم کے قاتل تک پہنچ گئے ہیں؟''

''تمہارا یہ اندازہ کسی حد تک درست ہے۔'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''مجھے ایک واضح اشارہ ملا ہے۔ تم متوقع قاتل کو گرفتار کر کے میرے پاس لاؤ گے۔''

''حکم ملک صاحب!'' وہ رپورٹ کو ایک طرف رکھ کر پوری طرح میری جانب متوجہ ہو گیا۔

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اپنا نقطہ نظر اس پر واضح کیا۔ اس نے میرے اندازے کی تائید کی۔ ٹھیک نو بجے اے ایس آئی جلال دین دو کانسٹیبلز کے ساتھ یوسف کو گرفتار کرنے تھانے سے روانہ ہو گیا۔

PDF LIBRARY 0333-7412793

ساڑھے نو بجے ایک کانسٹیبل نے میرے کمرے میں آ کر اطلاع دی کہ کھوجی کرم دین مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نے فوراً اسے اپنے پاس بلا لیا۔

کرم دین کرسی پر بیٹھ چکا تو میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''کیا بات ہے کرم دین! تم یہاں کیسے نظر آ رہے ہو؟ تمہیں تو آج اہم کام کرنا تھا؟''

''کام ختم کر کے ہی تو آپ کی طرف آیا ہوں۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''بس آپ کو رپورٹ پیش کرنا باقی ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' اس کی بات سن کر مجھے ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ ''میں چور کے کھوج والے کام کا ذکر کر رہا ہوں۔''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولا۔ ''جی ہاں ...... میں بھی کھوج ہی کی رپورٹ دینے آیا ہوں۔ میں نے اس پراسرار چور کا کھرا نکال لیا ہے۔''

''کون ہے وہ؟'' میں اچھل پڑا۔

''مقتول کریم کا بڑا بیٹا یوسف۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

اس کا یہ انکشاف میرے اندازے کی تصدیق کر رہا تھا تاہم میں نے اپنی تسلی کی خاطر پوچھ لیا۔ ''کیا واقعی! تم نے کھرا نکالنے میں کوئی غلطی تو نہیں کی؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب! میں نے اس کام میں اپنی عمر گزار دی ہے۔'' وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے بڑی باریک بینی سے چیک کیا ہے۔ کھڑکی توڑ کر دکان کے اندر داخل ہونے والا بندہ مستری کریم کے گھر سے نکل کر دکان کے پچھواڑے پہنچا تھا اور اپنا کام کر کے وہ واپس مستری کریم کے گھر ہی میں داخل ہوا تھا......''

''ایک منٹ!'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت اس کی بات کاٹی۔ ''تم نے تھوڑی دیر پہلے یوسف کا نام لیا ہے۔ تم نے یہ اندازہ کیسے لگایا کہ وہ کھرا یوسف کا ہے؟''

''میں نے اس کے پاؤں کے نمونے سے اندازہ لگایا ہے جناب!'' کھوجی کرم دین نے جواب دیا۔ ''رات آپ کے پاس سے جانے کے بعد میں سیدھا یوسف کے گھر پہنچا تھا۔ مجھے علی الصباح کھوج کا کام شروع کرنا تھا۔ آپ کے اور کانسٹیبل کے پاؤں کے نمونے میں حاصل کر چکا تھا۔ عابدہ اور یوسف کے پاؤں کا کام باقی تھا۔ میں نے سوچا یہ کام رات ہی میں نمٹا لوں۔ صبح کا کیا بھروسہ!''

''اوہ......'' میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور کہا۔ ''تم نے بہت اچھا کیا کرم دین!''

وہ بولا۔ ''اب یوسف کو تھانے بلا کر باقی سوال جواب آپ خود کر لیں اور مجھے اجازت دیں۔''

بات ختم کرتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور امید بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اسے میری طرف سے انعام ملنے کی توقع تھی۔ پولیس کے لئے کام کرنے والے مخبر، کھوجی اور اس قسم کے دیگر معاون افراد کو کام کی تکمیل پر چھوٹا موٹا انعام ضرور دیا جاتا ہے۔ باقی تھانے داروں کے بارے میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ میں انعام کی یہ رقم اپنی ذاتی جیب سے دیا کرتا تھا۔

میں نے کرم دین کو پانچ روپے دے کر تھانے سے رخصت کر دیا۔ اس زمانے میں پانچ روپے کی بڑی وقعت تھی۔ آج کل کے سات ساڑھے سات سو سمجھ لیں۔

دس بجے کے قریب اے ایس آئی جلال دین خالی ہاتھ واپس آ گیا۔ خالی ہاتھ ان معنوں میں کہ یوسف اس کے ہتھے نہیں چڑھا تھا البتہ عابدہ اور فاروق اس کے پیچھے پیچھے تھانے پہنچے تھے۔ میں نے آخر الذکر افراد کو برآمدے میں روک کر اے ایس آئی کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

''ملک صاحب! دکان بند ہے۔ اور وہ بدبخت گھر پر بھی موجود نہیں۔'' اے ایس آئی نے اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے اسے گرفتاری کی خبر پہلے سے دے دی ہو۔ عابدہ کے مطابق جب آج صبح اس کی آنکھ کھلی تو یوسف غائب ہو چکا تھا۔''

میں نے معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔ میں تمہاری اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ یوسف نے اپنی جانب بڑھنے والے خطرے کی بُو قبل از وقت سونگھ لی تھی۔ بہرحال تم عابدہ کو اندر بھیجو۔ میں ذرا اس کا انٹرویو کر لوں۔''

یوسف کا اچانک منظر سے غائب ہو جانا اس کے کسی سنگین جرم کی نشاندہی کرتا تھا۔ اور یہ سب کچھ کھوجی کرم دین کی کارکردگی کی وجہ سے ظہور میں آیا تھا۔ کھوجی نے اپنے کام میں بہت زیادہ تیزی کا مظاہرہ کیا اور رات ہی ان ماں بیٹے کے پاؤں کے نمونے لینے ان کے گھر پہنچ گیا۔ ظاہر ہے کھوجی کے عزائم یوسف سے ڈھکے چھپے نہیں رہے ہوں گے۔ وہ سمجھ گیا ہو گا، کھوجی بہ آسانی اس بات کا سراغ لگا لے گا کہ دکان کی عقبی کھڑکی توڑ کر اندر داخل ہونے والے کا تعلق مقتول مستری کریم کے گھر سے ہے اور کھرا اس بات کی بھی تصدیق کر دے گا کہ وہ شخص کوئی اور نہیں بلکہ یوسف ہی ہے۔ چنانچہ اس سے پیشتر کہ

PDF LIBRARY 0333-7412793

پولیس کے ہاتھ اس تک پہنچتے وہ منظر سے غائب ہو گیا۔

عابدہ کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ کریم کے قاتل کی حیثیت سے مجھے یوسف کی تلاش ہے لہٰذا وہ میرے کمرے میں پہنچتے ہی واویلا کرنے لگی۔

"تھانے دار جی!" اس نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ تو میرے ساتھ بہت زیادتی ہے۔ پہلے آپ نے فاروق پر شبہ کیا اور اب یوسف کو کریم کا قاتل سمجھ رہے ہیں۔"

"کوئی زیادتی نہیں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کسی بھی کیس کی تفتیش میں ان سب مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ شوہر کے قتل کے بعد اب تمہیں بڑے بیٹے کی جدائی کو بھی سہنا پڑے گا۔"

"یوسف بے گناہ ہے تھانے دار صاحب!" اس نے فریادی لہجے میں کہا۔ "وہ بھلا اپنے باپ کو قتل کیوں کرے گا۔ وہ تو کریم کا دایاں بازو تھا۔ آپ کو کوئی بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

میں ایک دکھیاری ماں کے جذبات کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا لیکن پیشہ ورانہ فرائض سے مجبور تھا۔ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "یوسف نے اپنے باپ کو کیوں قتل کیا یہ تو وہ خود ہی بتائے گا۔ تم فی الحال یہ بتاؤ کہ وہ کہاں غائب ہوا ہے؟"

"میں نہیں جانتی ...... میں کچھ نہیں جانتی۔" وہ گلوگیر آواز میں بولی۔ "مجھے بتا کر گیا ہوتا تو مجھے پتہ بھی ہوتا۔ میں آپ کے سوال کا کیا جواب دوں۔ بس اتنا ہی کہہ سکتی ہوں وہ بے گناہ ہے اور......"

میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ "وہ بے گناہ نہیں۔ اس کا جرم میرے ریکارڈ پر آ چکا ہے۔ میں اس کی دروغ گوئی اور ڈرامے بازی سے اچھی طرح آگاہ ہو چکا ہوں۔ اس نے میری آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے خواب والی کہانی تراشی اور اپنے جرم کی پردہ پوشی کے لئے ایک ایسی چال چلی جسے میں بے نقاب کر چکا ہوں۔"

اس کے بعد مختصر الفاظ میں، میں نے عابدہ کو کھوجی کرم دین کی کارکردگی اور تیلیوں والے قصے سے آگاہ کیا جس سے یوسف کا کھلا جھوٹ اور جرم ظاہر ہوتا تھا۔ وہ ایک ماں تھی اس لئے اسے بیٹے کے کرتوت کا یقین نہ آیا اور مسلسل ایک ہی جملے کی گردان کرتی چلی گئی۔

"میرا بیٹا بے قصور ہے ...... وہ قتل جیسا سنگین جرم نہیں کر سکتا۔"

میں نے عابدہ کو اپنے کمرے سے رخصت کر کے اے ایس آئی کو اندر بلا لیا۔ عابدہ

برآمدے میں جا کر فاروق کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کے تیور سے یہی ظاہر ہوتا تھا فی الحال اس کا گھر جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔

آئندہ ایک گھنٹے میں، میں نے اے ایس آئی کے ساتھ ہنگامی میٹنگ کر کے یوسف کی تلاش کا منصوبہ تیار کر لیا۔ تین تین اہلکاروں پر مشتمل چار پولیس پارٹیاں ترتیب دی گئیں۔ تین پارٹیوں کو آس پاس کے قصبہ جات اور ایک پارٹی کو لاہور روانہ کر دیا۔ لاہور میں یوسف کا پھوپھا فضل محمود رہتا تھا۔ ادھر سمن آباد میں اس کی پھل فروٹ کی دکان تھی۔ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ چپ چپاتے لاہور کی طرف نکل گیا ہو۔

اکیس مئی کی شام کو چھ بجے یوسف تھانے میں میرے سامنے موجود تھا۔ ایک پولیس پارٹی جس کی باگ ڈور اے ایس آئی جلال دین کے ہاتھ میں تھی نے اسے "فیروز والی" نامی قصبے سے گرفتار کیا تھا۔ فیروز والی ہمارے قصبے سے آٹھ دس میل کی دوری پر تھا۔

وہ میرے کڑے سوالات کے حلقے میں بند ہوا تو آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ وہ کوئی عادی مجرم نہیں تھا جو میں اسے خطرناک نوعیت کی تفتیش سے گزارتا۔ میں نے علیحدگی میں لے جا کر حوالدار کو سمجھا دیا کہ ہاتھ ہلکا اور زبان بھاری رکھتے ہوئے اس سے اقبالِ جرم کروانے کی کوشش کرو۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ حوالدار شیر علی کے خطرناک دبکوں سے متاثر ہو کر یوسف نے اپنے باپ کے قتل کا اقرار کر لیا۔ اس نے یہ جرم حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر کیا تھا جس میں اس کے مجروح جذبات کا بھی غالب عمل دخل تھا۔

جرم کسی مجبوری کے تحت کیا جائے یا ہنسی خوشی، وہ جرم ہی کہلاتا ہے اور قانون کی کتابوں میں ہر جرم کے لئے ایک سزا بھی مقرر ہے جو جرم ثابت ہونے پر سنا دی جاتی ہے۔

یوسف کا اقبالی بیان کئی صفحات پر مشتمل تھا۔ میں اس بیان کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ اس کیس کا پس منظر واضح ہو سکے۔

یوسف بھی فاروق کی طرح اپنے باپ سے نفرت کرتا تھا۔ دونوں کی نفرت میں صرف اتنا فرق تھا کہ فاروق اس نفرت کو چھپاتا نہیں تھا جبکہ یوسف اس سنگین اور مہلک جذبے کو دل میں پال رہا تھا۔ اسے ہرگز یہ اچھا نہیں لگتا تھا کہ اس کا باپ اس کی ماں کو عملاً ظلم وستم کا نشانہ بنائے۔ کریم کا اپنی بیوی کو زدوکوب کرنا یوسف کے دل کو خون کر دیتا مگر وہ اپنے

PDF LIBRARY 0333-7412793

مزاج سے مجبور تھا۔ اس نے کبھی بھی باپ کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہونے کی ہمت نہیں کی جبکہ اس کا جی تو یہ چاہتا تھا کہ وہ اپنی ماں پر جبر کرنے والے کا گلا گھونٹ دے۔ کئی بار اس نے یہ بھی سوچا کہ فاروق کی طرح وہ بھی کام سے بے پرواہ ہو جائے لیکن پھر چھوٹے بہن بھائیوں کی صورتیں اس کی نگاہ میں پھرنے لگتیں۔ وہ اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا تھا تو کام کی مقدار بڑھ جاتی۔ اس طرح آمدنی میں بھی اضافہ ہو جاتا جو اس کی ماں، اس کے چھوٹے بہن بھائیوں اور اس کے گھر کی سلامتی کے لئے بہت ضروری تھا۔ یوسف کو اس ضرورت کا شدت سے احساس تھا۔

یوسف میں برداشت کرنے کی صلاحیت موجود تھی لیکن جب پانی سر سے اوپر اٹھنے لگے تو ایسے برداشت کے مالک لوگ بھی خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ تین مئی کی رات مقتول کریم اور اس کی بیوی کے درمیان شدید جھگڑا ہوا تھا اور چار مئی کی صبح فاروق گھر سے غائب ہو گیا۔ اس واقعے نے یوسف کو بری طرح متاثر کیا لیکن وہ اپنی فطرت سے مجبور تھا۔ لہٰذا دل کے غبار کے اخراج کے لئے اس نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہ کیا۔ اس دن کے بعد سے کریم نے ہر رات اپنی بیوی کو تشدد کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ دیگر الزامات میں ایک اضافہ یہ بھی ہو گیا کہ فارق کو عابدہ کے لاڈ پیار نے بگاڑا تھا اس لئے وہ سرکش اور ضدی ہو گیا اور بالآخر باپ کے مقابلے پر اتر آیا۔ تین مئی کی رات ماں کو بچانے کے لئے فاروق نے باپ سے ہاتھا پائی کی تھی۔

عابدہ ہر رات پٹتی اور برداشت کرتی رہی لیکن چودہ مئی کی رات یوسف کی برداشت جواب دے گئی۔ اس رات کریم نے عابدہ کو ایسے وحشیانہ انداز میں زدوکوب کیا کہ یوسف کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ اسی لمحے اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس مسئلے کا ضرور کوئی نہ کوئی حل نکالے گا۔

دوسرے روز یعنی پندرہ مئی کو اس کا کام میں دل نہیں لگا۔ وہ پورا دن دکان میں باپ کے ساتھ مصروف رہا مگر اس کے ذہن میں خوفناک انتقام کی فلم چلتی رہی اور پھر شام سے پہلے وہ ایک حتمی فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے اپنے مسئلے کا حل تلاش کر لیا تھا۔

اور ...... اس شام جب وہ اپنی دکان سے رخصت ہوا تو اپنے فیصلے پر عمل کر چکا تھا!

ایسے ''ایسے شخص کو جینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا، چاہے وہ میرا باپ ہی کیوں نہ ہو۔''

اپنے بیان کے اختتام پر اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

میں نے پوچھا۔ ''یہ سنگین قدم اٹھاتے ہوئے تمہیں اپنے انجام کی بھی کوئی فکر تھی؟''

''میرا خیال تھا میں قانون کی گرفت میں نہیں آؤں گا۔'' وہ خلا میں گھورتے ہوئے بولا۔ ''لیکن پہلے ہی قدم پر مجھ سے ایک غلطی ہوئی۔ اگر میں نے بار بار ماچس جلانے کا ذکر کرنا ہی تھا تو مجھے دکان میں جلی ہوئی تیلیاں بھی چھوڑ کر آنا چاہئے تھا۔''

''دوسری غلطی تم سے یہ ہوئی کہ مذکورہ تیلیاں دکان کے اندر پہنچانے کے لئے کھڑکی توڑ کر چور والی کہانی چلا دی۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''حالانکہ اگر تم یہ کام نہ بھی کرتے تو......''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں اس سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اگر وہ یہ حرکت نہ کرتا تو شاید قانون کی گرفت میں بھی نہ آتا۔ جب تک اس نے جعلی خواب اور نقلی چور والا ڈراما نہیں رچایا تھا میں اس کی جانب متوجہ نہیں ہوا تھا۔ وہ میرے نامکمل جملے کے جواب میں جلدی سے بولا۔

''مجھے یہ ڈر تھا کہ جب آپ سرکاری تالا کھول کر دکان میرے حوالے کریں گے تو کہیں میری چوری پکڑی نہ جائے۔ دکان کے فرش پر جلی ہوئی تیلیاں نہ پائی گئیں تو آپ میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔'' پھر وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''مجھ سے غلطی ہوئی...... سخت غلطی ہوئی۔''

کریم ایک ٹیڑھی اینٹ تھا۔ ٹیڑھی اینٹ پر جس عمارت کی بنیاد رکھی جائے وہ ہمیشہ ٹیڑھی ہی رہتی ہے اور اس کا انجام بھی وہی ہوتا ہے جو کریم کا ہوا۔ جس طرح ایک ٹیڑھی اینٹ پوری عمارت کی غرقابی کا باعث بنتی ہے بالکل اسی طرح کریم اپنے خاندان کی تباہی و بربادی کا سبب بن گیا تھا۔

میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''برخوردار! ذہین سے ذہین مجرم بھی کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ضرور کرتا ہے۔ بس اس غلطی کو پکڑنے کی بات ہوتی ہے، اس کے بعد مجرم خود بہ خود پکڑا جاتا ہے ...... تم تو ایک اناڑی اور نو آموز مجرم ہو۔''

اس نے ندامت آمیز انداز میں گردن جھکا لی۔

☆☆☆

PDF LIBRARY 0333-7412793

میٹھی چھری

گلابی جاڑا جوبن پر تھا۔ فضا میں رومان پرور خوشگواریت رچی بسی تھی۔ دن بھر دھوپ میں گھومیں یا سائے میں ستانے بیٹھ جائیں، موسم کا ہر انداز بھلا لگتا تھا۔ دو روایتی موسموں کے بیچ کا عرصہ بڑا سنسنی خیز اور کیف آور ہوتا ہے۔ جذبات میں نئی اُمنگ اور ہلچل پیدا کرتا ہے۔ دلوں کو گرماتا اور کچھ کر گزرنے پر اُکساتا ہے۔ ایسے میں عموماً انسان بے اختیار ہو جاتا ہے۔

وہ بھی ایسے ہی گلابی موسم کی ایک چاندنی رات تھی۔

میں اس وقت اپنے کوارٹر کے مختصر صحن میں ٹہل رہا تھا۔ یہ ٹہلنا خلافِ معمول تھا۔ اس وقت رات کے دس بجے تھے۔ عام طور پر میں رات کا کھانا کھانے کے بعد عشاء کی نماز ادا کرتا اور پھر سونے کے لئے بستر پر لیٹ جایا کرتا تھا۔ ایسی بات نہیں کہ اس رات مجھے نیند نہ آ رہی ہو، نیند پورے طمطراق کے ساتھ آنکھوں میں موجود تھی مگر میں دانستہ صحن میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ چاندنی رات کی ایسی پُر لطف فضا سے منہ موڑ کر سرِ رات لمبی تان کر سو جانا میرے نزدیک کفرانِ نعمت تھا۔ سو میں قدرت کی نوازش سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔

صحن میں ایک سرے سے دوسرے سرے کی جانب ٹہلتے ہوئے اچانک میرے قدم رک گئے۔ کوارٹر کے بیرونی دروازے پر تیز دستک ابھری تو میں چونک کر اس طرف دیکھنے لگا۔ یقیناً تھانے میں کوئی ایمرجنسی پیش آ گئی تھی ورنہ میری طرف رجوع نہ کیا جاتا۔ چھوٹے موٹے معاملات کو شبینہ ڈیوٹی والے اہل کار خود ہی نمٹا لیا کرتے تھے۔

یہی سب سوچتے ہوئے میں دروازے کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس دوران میں دستک کے عمل کو دہرایا جا چکا تھا۔ میں نے کنڈی گرا کر کوارٹر کا دروازہ کھول دیا۔ سامنے حوالدار خیبر خان کھڑا تھا۔

''ملک صاحب! بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے...... آپ کو ابھی تھانے آنا ہو گا۔'' وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے اُلجھن زدہ انداز میں حوالدار کو دیکھا اور پوچھا۔ ''خیبر خان! کس قسم کی گڑبڑ ہو گئی؟''

''جناب! اغواء، قتل اور ڈکیتی کا معاملہ ہے۔'' حوالدار نے بتایا۔

''ٹھیک ہے......'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''تم چلو، میں دس منٹ میں آ رہا ہوں۔''

حوالدار خیبر خان کو دروازے پر سے رخصت کر کے میں اپنے کوارٹر کے اکلوتے کمرے میں پہنچا۔ میں نے ممکنہ تیزی سے یونیفارم زیب تن کی اور تھانے کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ میرا کوارٹر تھانے کی چوحدی کے اندر ہی عقبی جانب واقع تھا۔ ٹھیک سات منٹ بعد میں اپنے مخصوص کمرے میں موجود تھا۔ برآمدے سے گزرتے ہوئے میں نے درجن بھر افراد کو وہاں بیٹھے اور کھڑے دیکھ لیا تھا۔ حوالدار خیبر خان بھی ان سے ''مذاکرات'' میں مصروف تھا۔ وہ میرے پیچھے ہی کمرے میں چلا آیا اور نہایت ہی مختصر الفاظ میں اس نے مجھے تہرے جرم کی اس واردات کے بارے میں بتایا۔

اس کے مطابق ایک بارات چک بتیس سے واپس چک چوراسی کی طرف آ رہی تھی کہ راستے میں ڈاکوؤں کے ایک مسلح گروہ نے بارات پر حملہ کر دیا اور آناً فاناً میں اپنا کام کر کے اسی طرح گھنے جنگل کی تاریکی میں غائب ہو گئے جیسے اچانک نمودار ہوئے تھے۔ اس مختصر سی مجرمانہ کارروائی میں دُلہا جس کا نام عارف تھا، قتل ہو گیا۔ دُلہن اور زیورات کے صندوق کو ڈاکو اپنے ساتھ لے گئے۔ مزاحمت کی کوشش میں کئی باراتی شدید زخمی ہو گئے جنہیں ہسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔

چک چوراسی تھانے سے جنوب مشرق میں نصف میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ چک بتیس مغرب میں لگ بھگ سات میل دور واقع تھا۔ یہ دونوں گاؤں میرے تھانے کی حدود میں آتے تھے۔ دونوں چک کے درمیان چار پانچ میل کا علاقہ گھنے جنگل پر مشتمل تھا۔ دونوں گاؤں کو ملانے والا راستہ جنگل کے اندر سے ذرا ہٹ کر گزرتا تھا اور یہ تہرے جرم کی واردات راستے کے وسط میں عمل میں آئی تھی۔ جس میں مسلح حملہ آور ڈاکو دُلہا کو قتل کر کے دُلہن کو اٹھا لے گئے تھے اور جاتے جاتے طلائی زیورات والا صندوق بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

واقعات کے مطابق آج صبح چک چوراسی سے عارف کی بارات چک بتیس کے لئے

PDF LIBRARY 0333-7412793

روانہ ہوئی۔ دوپہر سے پہلے وہ لڑکی والوں کے گاؤں پہنچ گئے۔ نکاح اور دیگر رسموں سے فارغ ہوتے ہوتے شام ہوگئی۔ لڑکی والوں نے اصرار کیا کہ رات کا کھانا کھا کر جائیں لہٰذا چک بتیس سے بارات کی واپسی میں کافی دیر ہوگئی۔ رات کی تاریکی میں جب یہ لوگ جنگل سے گزرے تو ڈاکوؤں کو "سرگرمی" دکھانے کا موقع مل گیا ...... اور اب یہ متاثرہ افراد فریاد لے کر میرے پاس آئے تھے۔

برآمدے سے گزر کر اپنے کمرے کی طرف آتے ہوئے میں نے دیکھا تھا، فریادیوں میں مرد و زن دونوں شامل تھے۔ میں نے حوالدار کی بات توجہ سے سنی اور پوچھا۔

"خیبر خان! تم نے تو ان لوگوں کا اچھا خاصا انٹرویو کر لیا ہے۔ ان میں سے دو تین معقول افراد کو میرے پاس لاؤ تاکہ میں پوچھ گچھ کرسکوں۔"

حوالدار "لیس سر!" کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد چار افراد میرے سامنے حاضر ہوگئے۔ ان میں ایک مقتول دُلہا کا باپ خدا بخش تھا۔ خدا بخش کی عمر لگ بھگ پچپن سال رہی ہوگی۔ وہ بھاری جثے اور مضبوط ڈیل ڈول کا مالک تھا۔ لیکن اس اندوہناک واقعے نے اس کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ وہ بہت ہی گھبرایا ہوا اور خستہ حال دکھائی دیتا تھا۔

دوسرا شخص نذیر علی تھا۔ نذیر علی دُلہن کا پھوپھا تھا۔ وہ اپنی بیوی زاہدہ اور پانچ سالہ بچے سلیمان کے ساتھ چک بتیس سے بارات کے ساتھ شامل ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ایک شخص سکندر تھا۔ سکندر، دُلہن کی پھوپھی زاد بہن کا شوہر تھا۔ سکندر اور اس کی بیوی فرحت بھی دُلہن والوں کی طرف سے بارات کے ساتھ آئے تھے۔

چوتھا فرد ایک پندرہ سالہ لڑکا تھا۔ اس کا نام طارق معلوم ہوا۔ طارق دُلہا کا چھوٹا بھائی تھا۔ ان چار افراد نے ملتا جلتا بیان دیا جس کے مطابق وہ لوگ دُلہن کو لے کر چک بتیس سے چک چوراسی کی طرف آ رہے تھے کہ راستے میں مسلح ڈاکوؤں کے ایک جتھے نے ان پر حملہ کر دیا۔ تفصیل کچھ یوں تھی۔

اس بارات میں لگ بھگ پینتالیس افراد شامل تھے۔ سب سے آگے ایک گھڑ سوار شخص حبیب اللہ تھا۔ حبیب اللہ کے پاس ریوالور موجود تھا۔ حبیب اللہ کے پیچھے دو گھڑ سوار تھے۔ ایک دُلہا کا برادرِ خورد طارق اور دوسرا لیاقت۔ یہ دونوں غیر مسلح تھے۔ ان دونوں کے عقب میں تین گھڑ سوار تھے۔ درمیان میں دُلہا عارف اور دائیں بائیں اس کے دو دوست صفدر اور ہارون۔ ان چھ گھڑ سواروں کے پیچھے پانچ بیل گاڑیاں تھیں۔ پہلی بیل

گاڑی پر دُلہن والی ڈولی رکھی تھی۔ چک چوراسی کے قریب پہنچنے کے بعد ڈولی کو باقاعدہ اٹھا لیا جاتا۔ ڈولی والی بیل گاڑی پر دُلہا اور دُلہن کے گھر کی عورتیں بھی سوار تھیں۔ تحائف اور زیورات والا صندوق بھی اسی بیل گاڑی پر تھا۔

دوسری بیل گاڑی پر ملی جلی عورتیں، تیسری پر مرد حضرات سوار تھے۔ چوتھی اور پانچویں بیل گاڑی پر جہیز کا ساز و سامان لدا ہوا تھا۔ بیل گاڑیوں کے پیچھے آخر میں تین گھڑ سوار تھے جن میں سے دو، عمر دین اور رفیق کے پاس بندوقیں تھیں مگر بندوقوں کے استعمال سے پہلے ہی ڈاکوؤں نے انہیں بے بس کر کے شدید زخمی کر دیا۔ ریوالور بردار حبیب اللہ بھی شدید زخمی ہو کر عمر دین اور رفیق کے ساتھ ہی ہسپتال پہنچ گیا تھا۔ دیگر مردوں کے پاس کلہاڑیاں اور لاٹھیاں موجود تھیں لیکن ڈاکوؤں نے انہیں کسی قسم کی مزاحمت کا موقع ہی نہ دیا۔ انہوں نے مسلح باراتیوں کو شدید زخمی کیا، دُلہا کو قتل کیا اور زیورات والے ٹرنک کے ساتھ ہی دُلہن کو اٹھا کر لے گئے۔ زخمی افراد کو ہسپتال بھجوانے کے بعد یہ لوگ دُلہا کی لاش کو لے کر میرے پاس تھانے آ گئے تھے۔

میں نے گھما پھرا کر باری باری ان چاروں سے مختلف سوالات کئے لیکن واردات کی وقوع پذیری کے احوال میں کوئی خاص فرق نمودار نہ ہوا اور یہی صورتِ حال میرے لئے تشویش کا باعث تھی۔ اس باراتی قافلے میں کم و بیش چار درجن افراد شامل تھے جن میں غالب تعداد مردوں کی تھی۔ بعض ان میں مسلح بھی تھے اور اکثر کے پاس لاٹھیاں اور کلہاڑیاں وغیرہ بھی تھیں۔ یہ لوگ نصف درجن ڈاکوؤں کا بال بھی بیکا نہ کر سکے اور وہ لوگ بڑے مزے سے اپنا کام کر کے چلتے بنے۔ یہ ہضم ہونے والی بات نہیں تھی۔ مجھے تو یہ ایک گہری سازش کا شاخسانہ دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے تفصیلی پوچھ گچھ سے پہلے لاش کا معائنہ ضروری سمجھا۔ مبینہ طور پر قتل، ڈکیتی اور اغواء کی وہ واردات رات نو بجے کے قریب عمل میں آئی تھی۔ دُلہا عارف ایک سو ایک فیصد زندوں میں نہیں رہا تھا۔ اس کے جسم میں چار پانچ گولیاں اتاری گئی تھیں۔ لالٹین کی روشنی میں لاش کا حتمی معائنہ تو نہیں ہوسکتا تھا تاہم مجھے یہ اندازہ لگانے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ دل میں پیوست ہونے والی گولی نے اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا۔

میں نے مزید آدھے گھنٹے میں ضابطے کی کارروائی مکمل کی اور لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے ضلعی ہسپتال بھجوا دیا۔

جائے وقوعہ کا جائزہ لینا بہت ضروری تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ مقام تھانے

PDF LIBRARY 0333-7412793

سے مغرب میں کم و بیش ایک میل دور جنگل میں واقع تھا۔ میں نے چشم دید گواہوں کے سرسری بیان سے یہ اندازہ تو لگا لیا کہ واردات کے بعد گھڑ سوار ڈاکوؤں نے کس سمت کا رخ کیا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ لوگ واردات کے مقام سے جنوب کی طرف گئے تھے۔ اس جانب دو ڈھائی میل کے رقبے پر پھیلا ہوا گھنا جنگل تھا اور تین چار میل کے بعد سلطان پورہ نامی ایک قصبہ واقع تھا۔ اگر وہ لوگ باقاعدہ ڈاکو تھے تو ان کا تعلق اسی جنگل سے ہو سکتا تھا اور اگر وہ محض ڈاکوؤں کے بھیس میں تھے تو پھر وہ سلطان پورہ کے رہنے والے بھی ہو سکتے تھے۔

جائے وقوعہ کی جانب روانہ ہونے سے پہلے میں نے چار اہلکاروں پر مشتمل ایک پولیس پارٹی ترتیب دی۔ ان کے ساتھ مزید دو باراتی بھی شامل کر دیئے۔ پھر ان چھ افراد کو میں نے جنگل کے راستے سلطان پورہ کی جانب پیش قدمی کی ہدایت کر کے تھانے سے روانہ کر دیا۔

واردات کو اگرچہ ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا تھا مگر ڈاکوؤں کا تعاقب اور سراغ رسانی بہت ضروری تھی۔ ان لوگوں کے قبضے میں دُلہن تھی جو بدقسمتی سے کنواری بیوہ کا ٹائٹل حاصل کر چکی تھی۔ زیورات والے صندوق کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں مگر دُلہن کو ڈاکوؤں کے چنگل سے نکالنا فوری طور پر ضروری تھا۔ وہ سفاک لوگ پہلے ہی دُلہا کو قتل کر کے اپنے وحشی ہونے کا ثبوت فراہم کر چکے تھے۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں فریادیوں کی جانب متوجہ ہو گیا۔ مقتول دُلہا کے باپ خدا بخش کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ منت ریز لہجے میں بولا۔

”تھانے دار صاحب! پوچھ پرتیت تو بعد میں بھی ہوتی رہے گی، اس وقت آپ ہمیں گھر جانے دیں۔ شادی والا گھر ماتم کدے میں بدل چکا ہے۔ اس کی خبر لینا زیادہ ضروری ہے۔“

اس کی بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے ...... تم عورتوں کو لے کر گھر پہنچو۔ میں جائے واردات سے واپسی پر تمہارے پاس آؤں گا۔ باقی کارروائی تمہارے گھر میں بیٹھ کر ہی ہو گی۔“ ایک لمحے کے توقف سے اضافہ کرتے ہوئے میں نے کہا۔ ”میں دو تین بندوں کو ادھر ہی روک رہا ہوں۔ یہ میرے ساتھ جائے وقوعہ پر جائیں گے۔ یہ چشم دید گواہ ہیں۔ وہاں ان کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔“

خدا بخش نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ تھانے سے روانہ کرنے سے پہلے میں نے ان

درجن بھر مرد و زن کے ناموں کی ایک فہرست تیار کر لی تاکہ بعد میں بیانات لیتے وقت آسانی رہے۔ ان افراد میں دُلہا اور دُلہن، خاندان کے مرد اور عورتیں شامل تھیں۔ دُلہن کا نام رافعہ عرف رانی معلوم ہوا۔ مقتول دُلہا عارف، رانی کے چچا کا بیٹا تھا۔

جائے وقوعہ ایک اندازے کے مطابق تھانے سے لگ بھگ سوا میل دور تھی۔ جو صورتِ حال سامنے آئی اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا، وہاں اچھی خاصی فائرنگ ہوئی تھی لیکن حیرت انگیز طور پر میں نے ایسی کوئی آواز نہیں سنی تھی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ان دنوں مخالف رخ کی ہوائیں بڑے زور و شور سے چل رہی تھیں جن کے باعث موسم کی خنکی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔

میں نے اے ایس آئی ظاہر علی کو اپنے کمرے میں بلایا اور کہا۔ ”میں حوالدار خیبر خان کے ساتھ موقع واردات کا جائزہ لینے جا رہا ہوں۔ میری غیر موجودگی میں تم تھانے کو اپنے کنٹرول میں رکھنا۔“

”آپ بے فکر ہو جائیں ملک صاحب!“ وہ اعتماد سے بھرپور لہجے میں بولا۔ ”آپ کو کسی قسم کی شکایت نہیں ہو گی۔“

ظاہر علی بہت ہی ذمے دار اور فرض شناس اے ایس آئی تھا اور ظاہر ہے ان دنوں وہ شبینہ ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔ میں نے خیبر خان کے علاوہ ایک ہوشیار قسم کے کانسٹیبل کو ساتھ لیا اور جائے واردات کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہم تینوں پوری طرح مسلح تھے اور ہر نوعیت کی خوشگوار یا ناخوشگوار صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے ایک دم تیار۔ چاندنی رات میں گھوڑوں پر سوار ہو کر جنگل کی طرف رخ کرنا کسی سنسنی خیز تجربے سے کم نہیں ہوتا۔ میرا ذہن اس وقت مسلسل اس واردات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ دو باراتیوں کو بھی میں نے رہنمائی کے لئے ساتھ لے لیا۔ وہ دونوں ایک ہی گھوڑے پر سوار تھے۔ ان کے نام وزیر علی اور امداد حسین تھے۔ ان کا تعلق دُلہن کے گاؤں چک بتیس سے تھا۔

خدا بخش، سکندر، نذیر علی اور طارق نے مجھے بتایا تھا، ڈاکوؤں کا وہ جتھا اچانک ہی تاریکی سے نکل کر ان پر حملہ آور ہو گیا تھا اور پلک جھپکتے میں اپنا کام کر کے وہ تاریکی میں غائب ہو گئے۔ پتہ نہیں تاریکی سے ان کی مراد گھنا جنگل تھا یا وہاں کی خاموشی اور سناٹا۔ ورنہ وہ ایک چاندنی رات تھی۔ زیادہ دور نہ سہی مگر ایک حد تک تو ضرور دیکھا جا سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا وہ لوگ پریشانی کے عالم میں رات کی مناسبت سے بار بار تاریکی کا ذکر کر

PDF LIBRARY 0333-7412793

بیٹھے ہوں۔ بہرحال اس حوالے سے ابھی کئی سوال اپنے جواب حاصل کرنے کے منتظر تھے!

اب تک جو حالات میرے علم میں آئے تھے ان سے میں یہ نتیجہ اخذ کرنے میں تو کامیاب ہو گیا کہ ڈاکو اس باراتی قافلے کے ٹائم ٹیبل، واپسی میں ہونے والی تاخیر اور دیگر ہر نوعیت کی معلومات رکھتے تھے۔ انہیں یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ بارات میں شامل افراد میں سے صرف تین کے پاس آتشیں اسلحہ موجود ہے۔ حبیب اللہ، عمردین اور رفیق۔ انہوں نے ان تین افراد کو آناً فاناً شدید زخمی کر کے کسی مقابلے یا مزاحمت کے قابل نہیں چھوڑا۔ لاٹھی اور کلہاڑی بردار افراد کو وہ خاطر ہی میں نہیں لائے اور دلہن کے ساتھ ہی زیورات والے صندوق کو سمیٹ کر چلتے بنے۔

یہاں پر حیرت کا ایک اور پہلو بھی اجاگر ہوتا تھا اور وہ یہ کہ باراتیوں میں سے کسی نے ڈاکوؤں کا پیچھا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ یہ پہلو بھی ذہن کو بری طرح الجھا رہا تھا۔

اس جنگل کے حوالے سے ڈاکوؤں کی چھوٹی موٹی وارداتوں سے متعلق کہانیاں سننے میں آتی رہتی تھیں لیکن اس بارات کے ساتھ جس نوعیت کا واقعہ پیش آیا تھا، وہ کسی سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ معلوم ہوتا تھا۔ یہ ڈاکوؤں کی معمول کی واردات نہیں تھی بلکہ ایک بھرپور انتقامی کارروائی دکھائی دیتی تھی۔

اس انداز میں سوچتے ہوئے لامحالہ ذہن میں یہ سوال اُبھرا ...... ڈاکوؤں کا وہ گروہ کس سے انتقام لینا چاہتا تھا؟ دُلہا سے! دُلہن سے! یا پھر دونوں سے؟ تینوں صورتوں میں سے کچھ بھی ممکن ہو سکتا تھا۔ یہ ایک سیدھی سادھی، دشمنی پر مبنی انتقامی کارروائی نظر آتی تھی۔

حوالدار کی آواز نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”ملک صاحب! آپ کے ساتھ کام کرنا بہت مشکل ہے۔“

”تو پھر تم اپنا تبادلہ کسی اور تھانے میں کروا لو۔“ میں نے روا روی میں کہہ دیا۔ ”جب تک میں اس تھانے کا انچارج ہوں، یہ مشکل تو بہرحال رہے گی!“

”جناب! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔

”پھر کیا مطلب تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں تو آپ کی تعریف کر رہا تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ کی جگہ کوئی اور تھانے دار ہوتا تو آدھی رات کو یوں اٹھ کر جائے واردات کی طرف نہ چل پڑتا ...... اور

وہ بھی ایک سنسان، بیابان جنگل میں۔“

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”خیبر خان! میں اس وقت جو کچھ بھی کر رہا ہوں وہ میرے فرائض کا حصہ ہے اور میرا خیال ہے ہر تھانے دار کو اس موقع پر یہی طرزِ عمل اپنانا چاہئے۔“

”بے شک جناب!“ حوالدار نے تائیدی انداز میں کہا۔ ”آپ کے ساتھ کام کرتے ہوئے ہر لحہ عزم جوان رہتا ہے۔ جسم میں ایک کرنٹ سا دوڑتا رہتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ہر چیز کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ کسی بھی وجود کی زندگی اور صحت کے لئے اس کرنٹ کی اشد ضرورت ہے جو عزم کے بغیر ممکن نہیں۔ جو افسر خود کاہل الوجود ہوتے ہیں ان کے نیچے کا عملہ بھی سستی کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے۔ بالآخر ایک روز یہ آرام طلب مشینری زنگ آلود ہو کر ناکارہ ہو جاتی ہے۔ چوروں، ڈاکوؤں اور خطرناک مجرموں پر ہاتھ ڈالنا تو دور کی بات یہ لوگ اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر بٹوا تک نکالنے کے قابل نہیں رہتے۔“

وہ خاموشی سے میری باتیں سنتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ہم باراتیوں کی رہنمائی میں جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ اس جگہ پر اچھی خاصی افراتفری کے آثار نظر آ رہے تھے۔ دن کی روشنی میں اور بھی واضح طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔ میں گھوم پھر کر اس جگہ کا جائزہ لینے لگا۔

ایک بات تو طے تھی اور وہ یہ کہ کل صبح یہاں آ کر ایک مکمل سروے کرنے کی ضرورت تھی۔ آدھے گھنٹے تک میں وہاں موجود رہ کر مختلف اندازے قائم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

خدا بخش وغیرہ نے مجھے بتایا تھا، واردات کے بعد ڈاکو جنوبی سمت جنگل میں غائب ہوئے تھے۔ اس طرف دو ڈھائی میل تک گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا، پھر کوئی تین چار میل کے بعد موضع سلطان پورہ واقع تھا۔ سلطان پورہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔

میں نے تصدیق کی خاطر جنوب کی طرف اشارہ کیا اور وزیر علی اور امداد حسین کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ”کیا ڈاکو دُلہن اور صندوق کو لے کر اسی سمت گئے تھے؟“

انہوں نے جواب دینے سے پہلے معنی خیز نظر سے ایک دوسرے کو دیکھا اور باری باری سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ”جی ہاں ...... جی ہاں۔“

”کیا تمہیں ڈاکوؤں کے بارے میں کچھ اندازہ ہے؟“ میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟“

”ڈاکو تو جناب بس ڈاکو ہی ہوتے ہیں۔“ وزیر علی نے الجھن زدہ لہجے میں جواب دیا۔

PDF LIBRARY 0333-7412793

PDF LIBRARY
0333-7412793

ان کے بارے میں کیا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔''

امداد حسین نے کہا۔ ''یہ تو بہت برا ہوا جناب! وہ بدبخت سب کچھ لوٹ کر لے گئے۔ پتہ نہیں ایسے لوگوں کو قدرت نے ڈھیل کیوں دے رکھی ہے۔''

''یہ ڈھیل عارضی ہوتی ہے امداد حسین!'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''سمجھ لو ان ڈاکوؤں کو پکڑنے کا وقت آ گیا ہے۔ انہوں نے میرے تھانے کی حدود میں تہرا جرم کر کے اپنے حق میں اچھا نہیں کیا۔ میں انہیں پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالوں گا۔''

اسی وقت کانسٹیبل تقریباً دوڑتے ہوئے ہماری جانب آیا۔ مجھے باراتیوں کے ساتھ باتوں میں مصروف دیکھ کر وہ اِدھر اُدھر ہو گیا تھا۔ کانسٹیبل مشکور بے حد متجسس طبیعت کا مالک تھا۔ اسے ہر لمحے کسی نہ کسی شے کی کھوج لگی رہتی تھی اور یہ اس کے لئے بہت کارآمد بات تھی۔ وہ جس ڈیپارٹمنٹ میں کام کر رہا تھا اس میں تجسس کا مادہ بہت مفید ثابت ہوتا ہے!

مشکور نزدیک آیا تو میں اسے دیکھ کر چونک اٹھا۔ اس نے ہاتھ میں ایک سفید کپڑا پکڑ رکھا تھا۔ میں نے اس کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے اضطراری انداز میں استفسار کیا۔

''یہ کیا ہے مشکور علی؟''

''ململ کا دوپٹہ ہے جناب۔'' اس نے مذکورہ کپڑا میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے کپڑے کو ہاتھوں میں لے کر چیک کیا۔ وہ واقعی ململ کا ایک دوپٹہ تھا۔ یہ موسم ململ کے دوپٹے کا ہرگز نہیں تھا لہٰذا مجھے شدید حیرت ہوئی۔ میں نے کانسٹیبل سے پوچھ لیا۔

''یہ تمہیں کہاں سے ملا؟''

''ادھر ایک درخت کے تنے سے بندھا ہوا تھا۔'' اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے اس کے اشارے کی سمت نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ وہ جنگل کا شمالی حصہ تھا۔ اس طرف کسی درخت کے تنے سے ململ کے دوپٹے کا بندھا ہوا ملنا فکر انگیز اور تعجب خیز بات تھی۔ میری معلومات کے مطابق ڈاکو دلہن اور زیورات والے صندوق کو اٹھا کر جنگل کے جس حصے میں داخل ہوئے تھے وہ اس راستے سے جنوب کی سمت واقع تھا جب کہ مذکورہ سفید ململ کا دوپٹہ شمالی سمت والے حصے میں ایک درخت کے تنے سے بندھا ہوا ملا تھا۔

وہ جنگل کوئی تفریحی مقام نہیں تھا جو یہ سوچ لیا جاتا کہ کوئی پکنک پارٹی وہ دوپٹہ وہاں چھوڑ گئی ہو گی۔ اس دوپٹے کا تعلق ڈاکوؤں ہی سے ہو سکتا تھا۔ ممکن ہے انہوں نے کسی

نشانی کے طور پر اسے درخت سے باندھ رکھا ہو!

میں تھوڑی دیر تک اس دوپٹے کے بارے میں سوچتا رہا پھر دیگر امور کی جانب متوجہ ہو گیا۔ جائے وقوعہ کا تفصیلی نقشہ تیار کرنے کے لئے صبح اس طرف آنا نہایت ضروری تھا اور عین ممکن تھا دن کی روشنی میں ڈاکوؤں کا کوئی سراغ ہاتھ لگ جاتا۔

مزید چند منٹ وہاں رکنے کے بعد ہم نے واپسی کی راہ پکڑی کیونکہ لالٹینوں کی روشنی میں تلاش اور تفتیش جاری رکھنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوتا۔

ہم واپسی کے لئے پلٹے ہی تھے کہ وزیر علی نے کہا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ سے ایک چھوٹی سی درخواست ہے۔''

''ہاں کہو، کیا بات ہے؟'' میں رک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ بولا۔ ''اگر آپ کی اجازت ہو تو ہم چک بتیس کی طرف جانا چاہتے ہیں۔''

ان دونوں کا تعلق دلہن کے گاؤں یعنی چک بتیس سے تھا۔ میں نے چونک کر کہا۔ ''اس میں مجھ سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے...... اور یہ تمہیں بیچ جنگل میں اچانک ادھر جانے کا خیال کیوں آیا؟''

وزیر علی کی بات سن کر میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

''جناب! اب ہم چک چوراسی جا کر کیا کریں گے۔ دلہا قتل ہو گیا، دلہن کو ڈاکو اٹھا لے گئے۔ کم از کم ہم دلہن والوں کو اس افسوس ناک واقعے کی اطلاع تو دیں گے۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''آپ سے اجازت اس لئے لے رہے ہیں کہ ہم اکیلے ادھر نہیں جانا چاہتے۔ آپ لوگ کم از کم اس جنگل والے حصے میں ہمارے ساتھ چلیں۔ جب جنگل کی حد ختم ہو جائے تو آپ لوگ واپس آ جانا۔ آگے ہم خود ہی چلے جائیں گے۔''

بات ختم کرتے ہی اس نے تصدیقی نظر سے اپنے ساتھی امداد حسین کی طرف دیکھا۔ امداد حسین نے اس کی نظر کے جواب میں اثبات میں گردن ہلا کر تائید کر دی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے ان دونوں کا انداز کچھ مشکوک سا لگا۔ میں نے محسوس کیا جیسے وہ جلد از جلد مجھ سے جان چھڑانے کی کوشش میں ہوں۔ ان کی اس کوشش نے مجھے ان کی طرف سے ہوشیار کر دیا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے اور دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''اول تو یہ کہ میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں کہ میں تمہیں چھوڑنے کے لئے کہیں جاؤں۔ دوم چک بتیس والوں کو اطلاع

PDF LIBRARY 0333-7412793

دینے یا پہنچانے کی فکر نہ کرو۔ یہ کام میں خود زیادہ اچھے انداز میں کروا سکتا ہوں۔ اور سوم......"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا اور اضافہ کرتے ہوئے ایک لمحے کے بعد کہا۔ "ابھی میں نے تم لوگوں سے بھی پوچھ گچھ کرنا ہے۔ تم ایسے ہی سوکھے سوکھے تو نہیں جا سکتے نا!"

وہ عجیب سی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

میں نے حوالدار خیبر خان کو اشارہ کیا اور ہم واپسی کی راہ پر پلٹ پڑے۔ تاہم میں نے یہ احتیاط ضرور برتی کہ چک بتیس والے وہ دونوں افراد میری نظر میں رہیں۔ تھوڑا آگے آنے کے بعد میں نے وزیر علی سے پوچھا۔

"تم کس ملک کے وزیر ہو بھئی؟"

"جناب! آپ بھی کیسا مذاق کر رہے ہیں۔" وہ شرمندہ ہوتے ہوئے بولا۔ "میں تو محض نام کا وزیر ہوں۔ کام دھندا تو مزدوری ہے۔ میری قسمت ایسی کہاں کہ کسی ملک کا وزیر بن سکوں۔"

"تم کس قسم کی مزدوری کرتے ہو؟" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"میں کھیت مزدور ہوں جناب!" اس نے بتایا۔

"اور تمہارا یہ ساتھی کیا کرتا ہے؟"

"یہ بھی میرے ساتھ ہی ہوتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "تھوڑی دیر پہلے میں نے تم دونوں سے ایک سوال کیا تھا جس کا ابھی تک مجھے جواب نہیں ملا؟" پھر میں نے وزیر علی کو براہِ راست دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے محض یہ کہہ کر جان چھڑانے کی کوشش کی تھی کہ ...... ڈاکو تو جناب، بس ڈاکو ہی ہوتے ہیں۔" میں ایک لمحے کو رکا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس مرتبہ میرے استفسار میں اچھی خاصی درشتی شامل تھی۔

"صرف اس گول مول جواب سے کام نہیں چلے گا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں تم ڈاکوؤں کے بارے میں کیا سوچتے ہو۔ وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟"

امداد حسین نے کہا۔ "جناب! یہ تو بہت مشکل سوال ہے۔ ہم ڈاکوؤں کے بارے میں کیسے کچھ بتا سکتے ہیں؟ وہ تو کالی آندھی کی طرح جنگل سے برآمد ہوئے تھے اور اپنا کام کر کے واپس چلے گئے۔ ہمیں ان سے سوال جواب کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی اور نہ ہی انہوں نے اپنی زبان سے ایک لفظ ادا کیا۔"

"ایک بات تو تم لوگوں کو ماننا ہوگی۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "یہ ڈاکوؤں کی کوئی عام سی کارروائی نہیں ہے بلکہ صاف ظاہر ہو رہا ہے انہوں نے ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت گھات لگا کر بارات پر ہلا بولا ہے۔ یہ کسی گہری دشمنی اور انتقام کا نتیجہ ہے۔ بتاؤ، دُلہا اور دُلہن کے خلاف ایسی سازش کون کر سکتا ہے؟"

وزیر علی نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اب رانی بے چاری کی ڈاکوؤں سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ وہ تو خواہ مخواہ بدنصیب دُلہا کی مصیبت کا شکار ہو گئی۔ کیا قسمت پائی ہے اس نے بھی۔" اس کا انداز افسوس سے معمور تھا۔ "رانی کو تو ایک رات کی دُلہن بھی نہیں کہہ سکتے۔ اس سے پہلے ہی اس کا سہاگ اجڑ گیا۔" بات ختم کرتے ہی اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی۔

میں نے کرید جاری رکھی اور کہا۔ "ضروری نہیں کہ یہ واقعہ ڈاکوؤں کی دُلہن سے کسی دشمنی کا نتیجہ ہو۔ ہو سکتا ہے انہوں نے کسی اور زاویے کی دشمنی یہاں نکالی ہو!" میں نے تھوڑا توقف کر کے سنسنی خیز لہجے میں اضافہ کیا۔ "بعض اوقات والدین کے اعمال کا پھل بھی اولاد کے حصے میں آ جاتا ہے۔"

تھوڑی دیر تک ان کی طرف خاموشی رہی۔ شاید وہ دونوں میری بات کو سمجھ نہیں سکے تھے۔ پھر جب وزیر علی بولا تو مجھے اندازہ ہوا، میرا سوال بڑے مناسب طریقے سے اس کے پلے پڑ گیا تھا۔

"جناب! اللہ بخش صاحب تو بہت امن پسند انسان ہیں۔ ہم نے آج تک انہیں کسی شخص سے معمولی سا جھگڑا کرتے نہیں دیکھا، دشمنی تو بہت دور کی بات ہے ...... اور دشمنی بھی ڈاکوؤں کے گروہ سے! یہ بالکل ناممکن لگتا ہے۔"

اللہ بخش، خدا بخش کا بڑا بھائی تھا۔ دُلہن رافعہ عرف رانی اس کی بیٹی تھی۔ امداد حسین نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

"جناب! ساری گڑبڑ عارف کی طرف سے نظر آتی ہے۔ لگتا ہے اس کے کسی مخالف نے پرانی دشمنی نکالی ہے۔ یہ بھی بھیانک انتقام کا ایک طریقہ ہے کہ اپنے دشمن کو قتل کر کے اس کی بیوی کو اٹھا کر لے جاؤ۔"

"اور مالِ غنیمت میں زیورات سے بھرا ہوا صندوق بھی ساتھ لے جاؤ۔" حوالدار خیبر خان نے برجستہ کہا۔

وزیر علی اور امداد حسین کا تعلق چونکہ دُلہن کے گاؤں چک بتیس سے تھا اس لئے ان کی

PDF LIBRARY 0333-7412793

حمایت اور ہمدردی سراسر اللہ بخش وغیرہ کے ساتھ نظر آتی تھی۔ وہ سارے کا سارا الزام ڈلہا کی طرف ڈال رہے تھے۔ یہ واردات انہیں مقتول عارف کے کسی دیرینہ دشمن کا کارنامہ نظر آ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہم گھوڑوں پر سوار چک چوراسی پہنچ گئے۔

☆☆☆

خدا بخش کا گھر اس وقت ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔

وہ واقعہ ایسا نہیں تھا کہ لوگ لمبی تان کر سو جاتے۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ مگر ابھی تک تمام افراد جاگ رہے تھے۔ میں خدا بخش کے گھر کی بیٹھک میں جا بیٹھا۔ تھوڑی دیر بعد خدا بخش میرے پاس موجود تھا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اس اندوہناک واقعے پر اظہارِ افسوس کیا اور کہا۔

”خدا بخش! میں اپنے فرائض سے مجبور ہوں ورنہ اس وقت تمہیں ہرگز تکلیف نہ دیتا۔“

”آپ جو کچھ بھی کر رہے ہیں میری ہی بھلائی کے لئے کر رہے ہیں۔“ اس نے انتہائی معقول بات کی۔

میں باقی افراد کو دوسرے کمرے میں بھیج کر خدا بخش کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ سب سے پہلے میں نے اسے ململ کا سفید دوپٹہ دکھایا اور اس کے بارے میں استفسار کیا۔ اس نے دوپٹے سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے اسے پہچاننے سے صاف انکار کر دیا۔

”کم از کم یہ میرے گھر کی کسی عورت کا تو نہیں ہو سکتا۔“ وہ حتمی لہجے میں بولا۔ ”اس ٹھنڈے ٹھار موسم میں ایسے باریک دوپٹے کے استعمال کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آج کل تو گرم شالیں استعمال ہو رہی ہیں۔“

اس کی بات میں اچھا خاصا وزن تھا۔ میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ ڈاکوؤں نے وہ دوپٹہ کسی نشانی کے طور پر اس درخت سے باندھ رکھا تھا۔ سفید دوپٹے کو رات میں نسبتاً زیادہ آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا۔ ممکن ہے انہوں نے واردات کے لئے جو پلاننگ کی تھی، یہ دوپٹہ اسی کا ایک حصہ ہو!

میں نے خدا بخش سے ایک اہم سوال کیا۔ ”ڈاکو اپنے ساتھ تمہاری بہو رانی کے علاوہ ایک ٹرنک بھی اٹھا کر لے گئے ہیں۔ مجھے بتاؤ اس ٹرنک میں کیا کچھ بھرا ہوا تھا؟“

”سب سے زیادہ اہم تو زیورات ہی تھے۔“ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ پورے پچیس تولے سونا اور چالیس تولے چاندی کے زیورات تھے۔ اس کے

علاوہ چند قیمتی تحائف اور کامدار سوٹ بھی اس صندوق میں بھرے ہوئے تھے۔“

خدا بخش ایک آسودہ حال زمیندار تھا۔ اس کا گھر بھی معقول انداز میں بنا ہوا تھا۔ میں نے مسروقہ صندوق کی تفصیل پوچھی تو اس نے بتایا۔

”وہ چھوٹے سائز کا ایک جستی ٹرنک تھا۔ چوڑائی ڈیڑھ فٹ اور لمبائی ڈھائی فٹ رہی ہو گی۔ اس ٹرنک پر ایک مضبوط تالا بھی لگا ہوا تھا۔“

”ڈاکوؤں کے لئے تالے اور کنڈیاں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ صندوق پر لگے ہوئے تالے کو کھولنے کے بجائے توڑنا مناسب سمجھیں گے۔ یہ ان کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں ہو گا۔“

”صندوق اور وہ زیورات جائیں جہنم میں۔“ وہ شکستہ لہجے میں بولا۔ ”میں رانی کے لئے بہت فکرمند ہوں۔ پتہ نہیں ڈاکو اسے کہاں لے گئے ہیں اور اس کے ساتھ کیسا سلوک......“ وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر دکھی نظر سے مجھے دیکھنے لگا پھر بولا۔ ”میں بڑے بھائی کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ بڑے چاؤ سے میں اس کی بیٹی بیاہ کر لایا تھا لیکن رانی کو میرے گھر کی بہو بننا نصیب نہیں ہوا۔ پتہ نہیں کس دشمن کی نظر کھا گئی ہماری خوشیوں کو!“

بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی اور وہ خاموش ہو گیا۔ مجھے گفتگو کو آگے بڑھانے کے لئے ایک اشارہ مل گیا تھا۔ میں نے اس سرے کو پکڑ لیا اور خدا بخش سے پوچھا۔

”میں بھی تو اسی دشمن کی تلاش میں ہوں۔ تمہارے خیال میں تم لوگوں کی خوشیوں کو کس بدبخت کی نظر لگی ہو گی؟“

”آں......!“ اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور جلدی سے بولا۔ ”میں نے تو ایسے ہی ایک بات کہہ دی تھی۔ میرے ذہن میں کسی دشمن کا نام یا چہرہ نہیں ہے۔“

میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”تم نے ایسے ہی ایک بات کہہ دی تھی مگر میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں، اچھی طرح سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔ یہ ڈاکوؤں کی معمول کی کارروائی نہیں ہو سکتی۔ اس سازش کے پیچھے یقیناً تمہارے کسی دشمن کا ہاتھ ہے اور اس دشمن شخص تک تم مجھے پہنچاؤ گے۔“

”میں کسی ایسے شخص سے واقف نہیں جو اس حد تک مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کر سکتا ہو۔“ وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میرا جوان جہان بیٹا موت کے منہ میں چلا گیا۔ بھائی کی بیٹی کو ڈاکو اٹھا کر لے گئے۔ اللہ بخش نے کتنی مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے رانی کو میری بہو بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اوہ! سب کچھ تباہ ہو گیا۔“

PDF LIBRARY 0333-7412793

خدا بخش کے آخری جملے نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔ ”تم کن مشکلات کا ذکر کر رہے ہو؟“

وہ فوراً میرے سوال کی تہہ میں اتر گیا، ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”اللہ بخش کی بیوی یعنی رانی کی ماں اس رشتے کے لئے تیار نہیں تھی۔ مگر اللہ بخش نے اپنی بیوی خدیجہ کی ایک نہ سنی اور اپنی بات منوا کر دکھائی۔ لیکن شاید قدرت کو اللہ بخش کی یہ ضد اور زبردستی پسند نہیں آئی اور......“ وہ ایک مرتبہ پھر افسوس ناک انداز میں گردن جھٹکنے لگا۔

”افوہ...... سب کچھ الٹا ہو گیا۔ دونوں گھر اُجڑ گئے ...... میرا بیٹا اور اللہ بخش کی بیٹی بھی......“

اس نے ادھورے جملے پر اپنی بات کو اختتام دیا تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ”خدا بخش! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ایک بھائی اپنی بیٹی دوسرے بھائی کے بیٹے کو دے رہا تھا، اس میں خدیجہ کے اعتراض کا کون سا پہلو نکلتا ہے؟ وہ اس رشتے کی مخالفت کیوں کر رہی تھی؟ کیا وہ آپ لوگوں کو اپنا دشمن سمجھتی ہے؟“

”ایسی بات نہیں جناب!“ خدا بخش تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ”ہم اس کے دشمن ہیں اور نہ ہی وہ ہمیں اپنا دشمن سمجھتی ہے۔“

میں الجھ کر رہ گیا۔ ”پھر کیسی بات ہے خدا بخش؟“ میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

”اگر تمہاری بات کو درست مان لیا جائے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے، خدیجہ اس رشتے کی مخالفت کیوں کر رہی تھی؟“

”وہ...... وہ...... دراصل بات یہ ہے ...... جناب......“ خدا بخش نے اٹکتے ہوئے بتایا۔ ”خدیجہ چاہتی تھی کہ اپنی بیٹی رانی کی شادی بھائی کے بیٹے بشارت سے کرے مگر اللہ بخش کی نظر میں بشارت کوئی اچھا لڑکا نہیں۔ پھر اپنے سالے الیاس سے بھی اللہ بخش کے تعلقات خوشگوار نہیں ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کو بالکل پسند نہیں کرتے۔“

خدا بخش کے انکشاف نے مجھے بہت دور تک سوچنے کی راہ دکھا دی۔ مغوی رانی کی ماں اپنے بھتیجے بشارت سے اس کی شادی کرنا چاہتی تھی لیکن شوہر نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ اللہ بخش کے اپنے سالے الیاس سے اچھے تعلقات نہیں تھے اور وہ بشارت کو بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں ایک کردار بشارت کا نام ذہن میں چمکتا تھا۔ میں نے اس صورتِ حال کو واضح کرنے کے لئے خدا بخش سے پوچھ لیا۔

”کیا رانی کی شادی بشارت سے کرنے کی خواہش صرف خدیجہ کی تھی یا اس کا بھائی الیاس بھی اس رشتے سے دلچسپی رکھتا تھا؟“

اس نے بتایا۔ ”الیاس اگرچہ اللہ بخش کو زیادہ پسند نہیں کرتا لیکن وہ اس رشتے کی مخالفت میں بھی نہیں تھا۔ اگر اللہ بخش بیوی کی بات مان لیتا تو الیاس اپنی چھوٹی بہن کی خوشی کی خاطر اس رشتے سے انکار نہ کرتا۔“

”اور بشارت کے بارے میں کیا کہتے ہو؟“ میں نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔

”وہ بھی رانی کو پسند کرتا تھا۔“ خدا بخش نے بتایا۔

میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور پوچھا۔ ”الیاس کی رہائش کہاں پر ہے؟“

”چک بتیس میں۔“ خدا بخش نے جواب دیا۔

”اوہ!“ میں ایک مرتبہ پھر گہری سانس لے کر رہ گیا پھر استفسار کیا۔ ”کیا الیاس یا اس کے گھر کا کوئی فرد اس شادی میں شریک ہوا تھا؟“

”نہیں ...... انہوں نے اس شادی کا مکمل بائیکاٹ کیا ہے۔“ وہ بیزاری سے بولا۔ ”اور لگتا ہے اب ان دونوں خاندانوں میں فاصلے اور زیادہ بڑھ جائیں گے۔“

”الیاس کی براہِ راست تم سے تو کوئی دشمنی نہیں ہے نا؟“

”ہمارے درمیان کبھی میل جول نہیں رہا۔“ خدا بخش نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

”دوستی یا دشمنی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”لیکن تمہارے بیٹے کا قتل تو ایک خطرناک دشمنی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”آپ ...... آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

میں نے حالات کے اندھیرے میں اندازے کا ایک تیر پھینکا تھا۔ خدا بخش کے چونکنے نے مجھے مزید کھیلنے پر اُکسایا اور میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تم میری باتوں سے کیا سمجھ رہے ہو؟“

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ کے انداز سے یہ تاثر ملتا ہے کہ آپ الیاس کو اس واقعے کا ذمہ دار سمجھ رہے ہیں۔“

”الیاس یا بشارت...... ایک ہی بات ہے!“

”مم...... مگر وہ اتنا بڑا قدم کیسے اٹھا سکتے ہیں؟“ اس کی حیرت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ”میں حتمی طور پر کوئی فیصلہ صادر نہیں کر رہا ہوں۔ مگر حالات و واقعات اسی جانب اشارہ کر رہے ہیں۔“

وہ سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تھانے دار صاحب! مجھے اپنی قبر میں جانا

PDF LIBRARY 0333-7412793

ہے اور مرنے کے بعد خدا کو جواب بھی دینا ہے اس لئے میں بغیر ثبوت کے کسی پر شک ظاہر کر کے اپنی عاقبت کو خراب نہیں کرنا چاہتا۔"

"خدا بخش!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "شک ہمیشہ بغیر ثبوت کے ہی کیا جاتا ہے۔ اگر ثبوت ہاتھ لگ جائے تو پھر یہ شک یقین کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔"

وہ سہمی ہوئی خاموش نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ "خدا بخش! تمہارا جوان بیٹا قتل ہو گیا، تمہاری بہو کو زیورات والے صندوق سمیت ڈاکو اٹھا لے گئے۔ بارات میں موجود کسی مرد و زن کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا گیا، صرف ان افراد کو شدید زخمی کر کے مزاحمت کے قابل نہیں چھوڑا گیا جو مسلح تھے اور ڈاکوؤں کی کارروائی میں کوئی رخنہ ڈالنے کی طاقت رکھتے تھے۔ اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟" میں تھوڑی دیر کے لئے متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکو اس بارات اور اس میں شامل ہر شے سے بخوبی آگاہ تھے۔ انہوں نے باقاعدہ ایک طے شدہ منصوبے کے تحت یلغار کی اور اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان حالات و واقعات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکوؤں کو یہ شادی ہرگز ہرگز پسند نہیں آئی۔ تم کیا کہتے ہو؟"

وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ "میں آپ کی باتوں سے انکار نہیں کر سکتا۔ یہ وزن سے خالی نہیں ہیں۔ لیکن ڈاکوؤں کی یہ دشمنی سمجھ میں نہیں آ رہی۔ وہ میرے یا اللہ بخش سے کیوں انتقام لیں گے؟ ہم نے آخر ان کا کیا بگاڑا ہے؟"

اس کی سوچ کی حد کو دیکھتے ہوئے میں نے اس موضوع کو زیادہ پھیلانا ضروری نہ سمجھا اور کہا۔ "خدا بخش! تم فکر نہ کرو۔ میں جلد از جلد اس ڈاکو گروہ کو ڈھونڈ نکالوں گا اور انہیں عدالت سے عبرت ناک سزائیں دلواؤں گا۔ تمہیں اس سلسلے میں اگر کوئی اہم یا غیر اہم بات پتہ چلے تو فوراً مجھے بتانا۔ یقیناً تم بھی چاہو گے کہ تمہارے بیٹے کے قاتل اور بہو کو اغوا کرنے والے سلاخوں کے پیچھے نظر آئیں۔"

"جی ..... جی ہاں....." وہ تیزی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"خدا بخش کا جوان بیٹا قتل ہو گیا اور وہ بھی ایسے موقع پر کہ مقتول ابھی تک دُلہا کے روپ رنگ میں تھا۔ عارف نے بھی عجیب نصیب پایا تھا۔ وہ بیوی والا تو ہو گیا مگر بیوی پر کوئی بھی حق جتانے سے پہلے موت اپنا حق وصول کرنے اس کے سر پر آن پہنچی تھی۔

موت ایک سفاک اور سنگین حقیقت کا نام ہے۔ یہ اٹل ہے اور اس کے مقررہ وقت کا

ایک لمحہ بھی اِدھر سے اُدھر نہیں سرک سکتا۔ یہ اگر انسانوں کی خوشیوں کو دیکھنے اور مجبوریوں کو ناپنے بیٹھ جائے تو پھر اپنے کام کی نہیں رہتی۔ اسے تو ہر صورت میں اپنا فرض نبھانا ہوتا ہے اور بعض اوقات یہ خوشیوں کے میلے میں سے اپنے مطلوب کو اٹھا لے جاتی ہے۔ شاید اسی لئے شہنائی اور ماتم لازم و ملزوم سمجھے جاتے ہیں۔ انسانی زندگی غم و خوشی کا ایک مرقع ہے!

خدا بخش کو میں نے فارغ کر دیا۔ باقی باتیں بعد میں بھی پوچھی جا سکتی تھیں۔ ویسے اس کی فراہم کردہ اطلاعات نے میرے ذہن میں تفتیش کا ایک نیا دریچہ وا کر دیا تھا۔ میں بشارت اور اس کے والد الیاس کو کسی بھی صورت نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس شادی سے سب سے زیادہ تکلیف انہی کو پہنچی تھی۔ اگلی صبح میں نے انہیں چیک کرنے کا فیصلہ کیا اور دیگر لوگوں کے بیانات قلم بند کرنے میں مصروف ہو گیا۔

اس سلسلے میں حوالدار خیبر خان نے میری بھرپور مدد کی۔ ہم نے ایک گھنٹے میں ڈیڑھ درجن افراد کے بیان نوٹ کئے۔ ان میں مرد و زن سب شامل تھے۔ یہ تمام افراد بارات کے ساتھ تھے۔ اس عرق ریزی سے کوئی نئی بات سامنے نہیں آئی البتہ سلمیٰ نامی ایک عورت نے ایک خاص زاویے کی طرف میری توجہ مبذول کرائی۔

سلمیٰ خدیجہ کی چھوٹی بہن تھی اور بھانجی رانی کے ساتھ ہی چک بتیس سے چک چوراسی پہنچی تھی۔ سلمیٰ کے بارے میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ بیوہ تھی۔ اس کا اکلوتا بیٹا منظور بھی اس کے ہمراہ تھا۔ منظور کی عمر چودہ سال کے قریب تھی اور وہ ایک ایب نارمل لڑکا تھا۔ خاندان بھر میں وہ منظور جھلا کے نام سے مشہور تھا۔ سلمیٰ اپنے بیٹے کے ساتھ موضع شاہکوٹ میں رہتی تھی اور شادی میں شرکت کے لئے چک بتیس آئی تھی۔ سلمیٰ اپنی بھانجی رانی کے اغواء کی وجہ سے بہت پریشان نظر آتی تھی۔

میں نے بات خاص طور پر نوٹ کی اور وہ یہ کہ چک بتیس سے تعلق رکھنے والے افراد اس واردات کو دُلہا کے کسی دشمن کا کارنامہ قرار دے رہے تھے اور چک چوراسی والوں کا یہ خیال تھا کہ دُلہا پر یہ مصیبت دوسری طرف سے آئی تھی۔ تاہم کوئی بھی کسی واضح دشمن کی طرف اشارہ نہیں کر رہا تھا۔ اس سلسلے میں سلمیٰ نے ایک قدرے مختلف بات کی۔

"تھانے دار صاحب!" اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو یہ لگتا ہے، عارف کے کسی دشمن نے اسے چوٹ دی ہے۔"

"ایسی باتیں تو اور لوگ بھی کر رہے ہیں۔" میں نے اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

PDF LIBRARY 0333-7412793

"لیکن ایسا دشمن کون شخص ہوسکتا ہے، یہ کوئی نہیں بتاتا۔ یہ تو ایک چھوٹا سا بچہ بھی بتا سکتا ہے، کوئی دوست اس نوعیت کی لوٹ مار اور قتل و غارت گری نہیں کرسکتا۔ ڈاکوؤں کی صورت میں جو کوئی بھی تھا وہ دشمن ہی ہوسکتا تھا...... دُلہا کا دشمن ہو یا دُلہن کا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا!"

"میں جس شخص کے بارے میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں، ماضی میں عارف کے ساتھ اس کا جھگڑا بھی رہا ہے۔" سلمٰی نے دھیمے اور پُراسرار انداز میں انکشاف کیا۔

میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ سلمٰی کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ اسے بیوہ ہوئے لگ بھگ دس سال ہوئے تھے۔ اس عمر میں بھی وہ خاصی فٹ تھی۔ شکل و صورت اچھی ہو تو گزرے ہوئے ماہ و سال عورت کو زیادہ متاثر نہیں کرتے۔ کم اولاد کے باعث بھی اس کا رنگ روپ جوبن پر رہتا ہے۔ سلمٰی کو یہ تمام پلس پوائنٹ حاصل تھے۔

میں نے ایک لمحے میں اس کے سراپا کا بھرپور جائزہ لیا اور اگلے ہی لمحے سوال داغ دیا۔ "تم مجھے کس شخص کے بارے میں بتانا چاہتی ہو؟"

"اس کا نام مہر مشتاق ہے۔" وہ بدستور پُراسرار انداز میں بولی۔

"مشتاق؟" میں نے بے ساختہ دہرایا۔ "یہ شخص کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟"

"مہر مشتاق کا تعلق قصبہ سلطان پورہ سے ہے۔" اس نے بتایا۔

سلطان پورہ کے ذکر پر میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ یہ قصبہ جائے واردات سے جنوبی سمت واقع تھا۔ واردات کے چشم دید باراتیوں کے مطابق ڈاکو اسی جانب جنگل میں غائب ہوئے تھے۔ اس طرح لگ بھگ ڈھائی میل تک گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ جنگل سے نکلنے کے بعد تین، ساڑھے تین میل کے فاصلے پر قصبہ سلطان پورہ واقع تھا۔ ان واقعاتی حقائق کی روشنی میں سلمٰی کی بات سن کر میرا چونک جانا لازمی امر تھا۔ میں نے اضطراری انداز میں اس سے پوچھا۔

"سلمٰی! تم نے بتایا ہے، ماضی میں مہر مشتاق اور مقتول عارف کے درمیان کوئی جھگڑا وغیرہ بھی رہا ہے۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا، وہ جھگڑا کس نوعیت کا تھا اور اس کا سبب کیا تھا؟"

"زمینداروں کے بیچ لڑائی جھگڑے کی سب سے بڑی وجہ زمین ہی ہوتی ہے۔" وہ سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولی۔ "زیادہ تفصیل کا تو مجھے پتہ نہیں لیکن اُڑتی اُڑتی سنی تھی، مہر مشتاق اور عارف کے درمیان بھی کوئی زمینی تنازع ہی تھا۔" وہ ایک لمحے کو متوقف

ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بتانے لگی۔

"مہر مشتاق قصبہ سلطان پورہ کے ایک بڑے زمیندار مہر یوسف کا بیٹا ہے۔ وہ لوگ وہاں کے طاقتور افراد ہیں۔ مشتاق کے دادا کا نام سلطان تھا۔ وہ قصبہ مہر سلطان کے نام ہی سے مشہور ہے۔ اس سے آپ مہر خاندان کے اثر و رسوخ کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔"

سلمٰی کی باتیں توجہ طلب اور فکر انگیز تھیں۔ اگر واقعی مہر مشتاق اور عارف کے درمیان کوئی سنجیدہ دشمنی موجود تھی تو پھر اس واردات کو مشتاق کے ساتھ منسوب کرنے کا جواز بنتا تھا۔ مہر مشتاق، عارف سے ایک بھیانک انتقام لینے کے لئے خود یا پھر ڈاکوؤں کی مدد سے اس قسم کی کارروائی کروا سکتا تھا۔ اس دشمنی کی حقیقت کی تصدیق یا تردید خدا بخش کرسکتا تھا۔

میں نے مختلف زاویوں سے سلمٰی کو مزید گھنے کی کوشش کی لیکن مجھے اس سلسلے میں کوئی بڑی کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ اس نے یہ کہہ کر بات ہی ختم کر دی۔

"تھانے دار صاحب! مجھے جو کچھ معلوم تھا وہ میں نے آپ کو بتا دیا۔ یقین کریں یا نہ کریں، آپ کی مرضی ہے۔"

میں نے اس کی تسلی کی خاطر کہہ دیا۔ "تم فکر نہ کرو۔ میں اس کیس کی تفتیش کے دوران میں مہر مشتاق اور اس کے باپ مہر یوسف کو چیک کروں گا۔ تم نے ایک مفید اشارہ دیا ہے۔ قانون سے اس تعاون کے لئے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔" پھر تھوڑا توقف کر کے میں نے اس سے پوچھا۔

"تم موضع شامکوٹ میں کس طرف رہتی ہو؟"

اس نے مجھے اپنے گھر کی لوکیشن تفصیل سے بتا دی۔ سردار علی کی وفات کے بعد اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی اور بیوگی کا یہ تمام تر عرصہ اپنے ایب نارمل بیٹے منظور جھلا کے ساتھ گزار دیا تھا۔ سردار علی اپنے پیچھے اچھی خاصی زمین چھوڑ گیا تھا لہٰذا وہ کسی قسم کے مالی یا معاشی مسائل کا شکار نہیں ہوئی۔ سلمٰی منظور جھلا کے ساتھ بڑے مزے اور آسانی سے زندگی گزار رہی تھی۔ میں نے اسے فارغ کرنے کے بعد دوبارہ خدا بخش سے بات کی۔

"خدا بخش! مجھے پتہ چلا ہے، تمہارے مقتول بیٹے کا کسی مہر مشتاق سے کوئی پھڈا رہا ہے؟"

"یہ بات آپ کو کس نے بتائی ہے؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

"کسی نے بھی بتائی ہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے کہا۔ "تم میرے سوال

PDF LIBRARY 0333-7412793

کا جواب دو۔"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ "بات بہت معمولی سی تھی مگر جوان خون اور جوش سے بھرے ہوئے دماغوں نے اسے جھگڑے کا رنگ دے دیا۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے تفصیل بیان کرتے ہوئے بتایا۔ "زمینداروں کے بیچ ایسے چھوٹے موٹے تنازعات تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ ہمارے درمیان بھی نہری پانی کی ترسیل اور تقسیم کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مہر مشتاق اور عارف دونوں اُبھرتے ہوئے جوان تھے۔ ان کے درمیان تلخ کلامی ہو گئی۔ بعد ازاں یہ تلخ کلامی مختلف قسم کی دھمکیوں تک جا پہنچی تھی، بہرحال!

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک گہری سانس لی اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"میں نے مہر یوسف کے ساتھ مل کر سارے معاملات طے کر لئے اور یہ فتنہ اسی طرح بیٹھ گیا جیسے اچانک کھڑا ہو گیا تھا۔ اب تو اس واقعے کو کئی ماہ گزر چکے ہیں۔ میں تو اس تنازع کی ساری تلخی کو بھول گیا ہوں۔"

میں نے اس کی وضاحت پوری توجہ سے سنی اور اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ "خدا بخش! تم تو اس تلخی کو فراموش کر بیٹھے ہو لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے، مہر یوسف اور اس کے بیٹے مشتاق نے بھی تمہاری طرف سے اپنے دل صاف کر لئے ہوں؟"

"تھانے دار صاحب! دلوں کے حال تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔" خدا بخش نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "اس سلسلے میں کوئی گارنٹی کیسے دی جا سکتی ہے۔ ویسے میرا خیال ہے وہ لوگ بھی اس جھگڑے کو بھلا بیٹھے ہوں گے ورنہ اس دوران میں کوئی نہ کوئی ناخوشگوار واقعہ ضرور دیکھنے یا سننے میں آتا۔"

"ڈاکوؤں کی اس واردات کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔

"میں سمجھا نہیں، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"میں نے کوئی بھی مشکل یا اُلجھی ہوئی بات نہیں کی۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ڈاکوؤں والی کارروائی کے پیچھے مہر خاندان کا ہاتھ بھی تو ہو سکتا ہے!"

"سوہنا خدا ہی بہتر جانتا ہے تھانے دار صاحب!" وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میں جوان بیٹے کی اندوہناک موت اور بہو کے اغوا کی وجہ سے سخت پریشان ہوں۔ سچ پوچھیں تو میرا دماغ کام نہیں کر رہا۔ میں نے آپ کو تمام حالات تفصیل سے بتا دیئے ہیں۔ آپ چاہے جیسے بھی تفتیش کو آگے بڑھائیں، میں تو یہ چاہتا ہوں، رانی کو جلد از جلد

ڈاکوؤں کے چنگل سے آزاد کرا دیں اور میرے عارف کے قاتلوں کو بھیانک سزائیں دلوائیں۔ اگر ...... اگر......" وہ کچھ کہتے کہتے اٹکا پھر تھوڑے توقف کے بعد بات پوری کرتے ہوئے بولا۔

"اگر رانی ڈاکوؤں کے قبضے سے واپس نہ لائی گئی تو میں اللہ بخش سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکوں گا۔ رانی کا نکاح تو عارف سے ہوا تھا مگر اللہ بخش نے بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا تھا...... میں رانی کو تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔ اب تم ہی اس کی حفاظت کرنا...... اور میں اس کی حفاظت نہیں کر سکا۔ افسوس......"

اس کا گلا رندھ گیا۔ میں نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا۔ "تم فکر نہ کرو خدا بخش! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تمہارے مقتول بیٹے کو تو واپس نہیں لا سکتا لیکن وعدہ کرتا ہوں تمہاری بہو کو ضرور ڈاکوؤں کے قبضے سے نکال لاؤں گا۔ تمہیں اپنے بڑے بھائی کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا۔" پھر میں نے اس کی دل گرفتگی کو کم کرنے کی خاطر قدرے شگفتہ لہجے میں کہا۔

"ویسے تم دونوں بھائیوں کے ناموں میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ یہ بڑے ہم وزن اور ہم معنی ہیں۔"

وہ آنکھوں میں اتر آنے والی نمی کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے بولا۔

"ہمارے ابا مرحوم کو سوہنا رب کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، وہ کہا کرتے تھے، اس کائنات میں پائی جانے والی تمام چیزیں اسی قادرِ مطلق کی ہیں۔ لہٰذا ان کے نام کے انتخاب کے سلسلے میں اس تعلق کو ضرور ذہن میں رکھنا چاہیئے۔"

ایک سیدھے سادھے ان پڑھ دیہاتی نے بڑے پتے کی بات کی تھی۔ اگر اس نکتے کو ہم ذہن نشین کر لیں تو فائدہ ہی فائدہ ہے۔ خالق اور مخلوق کے درمیان تعلق کی ڈوری کو قائم اور سلامت رہنا چاہیئے۔ چاہے یہ تعلق معانی کے اعتبار سے ہو یا کسی اور وصف کے طفیل ...... کل اور جز کا رشتہ بہرصورت استوار رہنا چاہیئے۔"

میں نے خدا بخش کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور تشفی آمیز انداز میں کہا۔ "زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر تم ہی ہوش و حواس کھو بیٹھے تو تمہاری بیوی کو کون سنبھالے گا۔ جوان بیٹے کی موت نے ماں کے سینے میں جو قیامت برپا کی ہو گی اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔"

"نصیباں اپنے حواس کھو بیٹھی ہے۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ نصیباں بی بی

PDF LIBRARY 0333-7412793

مقتول دُلہا کی ماں کا نام تھا۔ ''وہ تھوڑی دیر کے لئے ہوش میں آتی ہے اور پوچھتی ہے میری بہو کہاں ہے؟ پھر عارف کو پکارتی ہے، وے پتر! اپنی ووہٹی کو تو میرے پاس لاؤ۔ اس کے بعد سینہ کوبی کرتے ہوئے دوبارہ غشی کی حالت میں چلی جاتی ہے۔''

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''اسی لئے تو کہہ رہا ہوں، تم خود پر قابو رکھو تا کہ دوسروں کو سنبھال سکو۔ مجھے قانونی کارروائی کے لئے دو راستے مل گئے ہیں۔ انشاء اللہ انہی راستوں پر چلتے ہوئے میں بہت جلد منزل پر بھی پہنچ ہی جاؤں گا۔''

''کون سے دو راستے؟'' خدا بخش نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

میں نے مختصر الفاظ میں اسے مہر مشتاق اینڈ کمپنی اور بشارت اینڈ کو کے بارے میں بتا دیا۔

وہ بولا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ اپنے کام کو زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ میں کسی کو الزام نہیں دوں گا۔''

''خدا بخش! پولیس کی تفتیش جس گاڑی میں آگے بڑھتی ہے وہ شک کے ایندھن سے چلتی ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے لئے شک کو بنیاد بنانا پڑتا ہے اور فی الحال اس واردات کے حوالے سے یہی دونوں پارٹیاں مشکوک ٹھہرتی ہیں۔'' میں نے سانس لینے کے لئے ذرا سی خاموشی اختیار کی اور مزید کہا۔ ''خاص طور پر سلطان پورہ کا رہائشی مہر مشتاق میرا خصوصی نشانہ ہے کیونکہ عینی شاہدین کے مطابق ڈاکو واردات کے بعد جنوبی سمت میں فرار ہوئے تھے اور تم جانتے ہو اس طرف جنگل کے پار موضع سلطان پورہ واقع ہے۔''

وہ خالی نظر سے مجھے تکتے ہوئے اثبات میں سر ہلانے لگا۔

میں اس کے گھر سے نکل کر تھانے کی طرف روانہ ہو گیا۔

✲✫✲

اصول تو یہ ہے کہ اگر رات کو سونے میں تاخیر ہو جائے تو اگلی صبح آنکھ دیر سے کھلتی ہے۔ مگر یہ اصول اس بات کا متقاضی ہے کہ بستر پر جاتے وقت آپ کا ذہن روزمرہ کے جنجال کو نمٹا چکا ہو۔ میرے ساتھ ایسی کوئی سہولت نہیں تھی۔ میں ایک بے حد الجھی ہوئی صورتِ حال کو ذہن میں بٹھا کر سویا تھا لہٰذا آئندہ صبح معمول سے بھی پہلے ہی میری آنکھ کھل گئی۔

میں نے اپنی عادت کے مطابق نہا دھو کر نمازِ فجر ادا کی اور ناشتے وغیرہ سے نمٹ کر تیار ہو گیا۔ رات تھانے سے اپنے کوارٹر کی طرف آتے ہوئے میں نے کانسٹیبل مشکور علی کی ڈیوٹی لگا دی تھی کہ وہ علی الصباح دین محمد کو لانے کے لئے روانہ ہو جائے۔

دین محمد عرف بابا دینا ایک تجربہ کار کھوجی تھا۔ میں اس سے مختلف مواقع پر نہایت ہی مفید اور نتیجہ خیز کام لے چکا تھا۔ کھوجی بابا دینا کو میں اپنے ساتھ جائے وقوعہ پر لے جانا چاہتا تھا تا کہ ڈاکوؤں کا سراغ لگانے کے لئے ان کا کھرا اٹھایا جا سکے۔ دین محمد کو اپنے پیشے میں بے حد مہارت حاصل تھی۔

میں یونیفارم پہن کر قبل از وقت تھانے پہنچا تو مجھے معلوم ہوا، مشکور علی میری ہدایات کی تکمیل کے لئے علی الصباح تھانے سے نکل گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر تھانے کا عملہ اٹین شن ہو گیا۔ رات کو جو پارٹی میں نے ڈاکوؤں کی تلاش میں جنگل کی طرف بھیجی تھی، وہ واپس آ چکی تھی۔ پارٹی کے لیڈر نے مجھے بتایا کہ وہ ڈاکوؤں کے کسی گروہ کا سراغ لگانے میں ناکام رہے تھے۔

''تم نے جنگل کے کس کس حصے میں ڈاکوؤں کو تلاش کیا؟'' میں نے پولیس پارٹی کے سرکردہ اہل کار سے دریافت کیا۔

اس نے بتایا۔ ''ملک صاحب! ہم نے اس جنگل کے جنوبی حصے کو کھنگال ڈالا ہے لیکن کہیں بھی ہمیں ڈاکو یا ان کے آثار نظر نہیں آئے۔''

''کیا تم لوگوں نے جنگل کے شمالی حصے کو بھی چیک کیا؟'' میں نے پوچھا۔

جنگل کے شمالی اور جنوبی حصے سے مراد وہ علاقہ تھا جو گزرگاہ کے شمال اور جنوب میں واقع تھا۔ یہ راستہ تقریباً جنگل کے درمیان سے گزرتا تھا۔ مذکورہ جنگل کا رقبہ کم و بیش چار ضرب ساڑھے چار میل پر پھیلا ہوا تھا۔ اس راہ گزر سے شمال میں تین میل اور جنوب میں لگ بھگ ڈھائی میل، مشرق سے مغرب کی سمت اس کی طوالت چار میل کے قریب تھی۔

پارٹی لیڈر نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''ملک صاحب! ڈاکوؤں نے واردات کے بعد چونکہ جنگل کی جنوبی سمت رخ کیا تھا اس لئے ہم اسی حصے کی خاک چھانتے رہے۔ شمال والے حصے میں ہم نہیں گئے۔''

یہ پارٹی مجھ سے کافی پہلے اس طرف روانہ ہوئی تھی۔ اگر وہ لوگ جنگل کے شمالی حصے میں داخل ہوتے تو یقیناً ململ کا سفید دوپٹہ ان کی نظر سے اوجھل نہ رہتا جو کانسٹیبل نے ایک درخت کے تنے سے کھولا تھا۔ میں نے آئندہ پندرہ منٹ میں دو تین نہایت ہی اہم

PDF LIBRARY 0333-7412793

کام انجام دیئے۔

سب سے پہلے میں نے اے ایس آئی ظاہر کو تھانے سے روانہ کیا۔ ظاہر علی کو کئی کام کرنا تھے۔ اسے علاقے کے ایس پی کو اس واردات کی اطلاع دینے کے بعد سیدھا چک بتیس پہنچنا تھا۔ چک بتیس میں دُلہن رافعہ عرف رانی کے گھر والوں کو اس واقعے سے باخبر کرنے کے ساتھ ساتھ اسے الیاس اور بشارت کی سن گن بھی لینا تھی۔ میں نے اس حوالے سے ظاہر علی کو بریف کر دیا۔ اسے متعلقہ افراد کو چُھ کئے بغیر ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھیں۔ میں الیاس اوز بشارت کی بے خبری میں ان پر ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا۔ اگر ان لوگوں کا اس واردات سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی تعلق تھا تو پھر وہ کسی بھی سرگرمی سے فوراً محتاط ہو جاتے اور یہی میں نہیں چاہتا تھا۔ ہوشیار اور محتاط شکار کو دام میں لانا بہت مشکل ہوتا ہے!

ظاہر علی تھانے سے روانہ ہو گیا تو میں نے دو کانسٹیبلز کو اپنے کمرے میں بلا لیا اور خصوصی ہدایات دینے کے بعد انہیں سلطان پورہ کی جانب روانہ کر دیا۔ ان میں ایک تو مشکور علی تھا اور دوسرا آفتاب احمد۔ ان دونوں کو سادہ لباس میں رہتے ہوئے سلطان پورہ میں مہر مشتاق وغیرہ کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھنا تھی اور جیسے ہی وہ کوئی غیر معمولی بات نوٹ کرتے، ان میں سے ایک تھانے آ کر فوراً مجھے مطلع کر دیتا۔ اگر مہر خاندان کا اس واردات میں ہاتھ تھا تو کوئی نہ کوئی ”مفید“ بات جلد ہی منظر عام پر آ جاتی ...... اور جیسے ہی یہ مفید بات میرے عِلم میں آتی، میں فوراً حرکت میں آ جاتا۔ یہی پلاننگ ظاہر علی کے حوالے سے بھی تھی۔

میں اس کام سے فارغ ہوا تو کھوجی بابا کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ تھوڑی دیر پہلے مشکور علی اسے اپنے ساتھ تھانے لایا تھا۔ وہ میرے کمرے میں آتے ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”جی تھانے دار صاحب! کیا حکم ہے؟ میں نے آپ کے بھیجے ہوئے سپاہی کو بہت کریدا ہے لیکن اس نے کوئی سرا نہیں پکڑایا۔ شاید اس سلسلے میں آپ نے خصوصی تاکید کر رکھی تھی۔ ویسے آپ کا سپاہی بڑا پکا بندہ ہے!“

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔ ”تم ایک سِرے کی بات کرتے ہو بابا، میں تو پورا معاملہ ہی تمہارے سامنے کھول رہا ہوں۔“

”جی حکم سرکار!“ وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

میں نے پوچھا۔ ”تمہیں پتہ تو چل گیا ہو گا کہ پچھلی رات ادھر جنگل میں ایک واردات ہو گئی ہے؟“

”جی سرکار!“ اس نے پُرمعنی انداز میں اپنی گردن کو جنبش دی۔ ”میں نے اس واقعے کے بارے میں سنا ہے۔ ڈاکوؤں کے کسی گروہ نے ایک بارات پر ہلّا بول کر بڑی تباہی مچائی ہے اور جاتے ہوئے دُلہن کو بھی اغوا کر لیا ہے۔ دُلہا کو وہ گولیوں سے بھون کر وہیں پھینک گئے ہیں۔“

”تم نے بالکل ٹھیک سنا ہے بابا دین۔“ میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ”ہمیں ڈاکوؤں کے اسی گروہ کا سراغ لگانا ہے تاکہ ان کے قبضے سے دُلہن کو چھڑایا جا سکے۔ اس سلسلے میں مجھے تمہارے ماہرانہ تعاون کی ضرورت ہے۔ ہم ابھی جائے وقوعہ کی طرف روانہ ہونے والے ہیں۔ تم ڈاکوؤں کا کھرا اٹھاؤ گے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو گے کہ وہ کہاں سے آئے تھے اور کہاں گئے ہیں۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟“

اس نے سر کو اثباتی جنبش دی اور بولا۔ ”بڑی چنگی طراں سمجھ رہا ہوں حضور۔“

”تو پھر تم دس منٹ کے اندر ضروری تیاری کر لو۔“ میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

اس کے بعد میں نے حوالدار خیبر خان کو اپنے پاس بلا لیا اور اسے ضروری ہدایات دینے لگا۔ میری غیر موجودگی میں اسے تھانے کا نظام سنبھالنا تھا اور وہ اس کا اہل تھا۔

لگ بھگ آٹھ بجے ہم تھانے سے روانہ ہوئے۔ یہ خاصا جلدی تھا۔ ان دنوں میں نو بجے تھانے پہنچتا تھا، اس کے بعد ہی تھانے داری شروع ہوتی تھی۔ موسم خوشگوار سے چار ہاتھ آگے بڑھ کر اچھا خاصا ٹھنڈا تھا۔ چند روز بعد موسم سرما کا آغاز ہونے والا تھا۔ ہم اس وقت گھوڑوں پر سوار تھے اور موسم کی مناسبت سے ہم نے مناسب لباس زیب تن کر رکھے تھے۔ میں نے قدیر نامی ایک کانسٹیبل کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔

ہمارے گھوڑے سبک رفتاری سے چلتے ہوئے جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ میں گزشتہ رات بھی یہاں کا ”دورہ“ کر کے جا چکا تھا لیکن وہ جائے واردات کا سرسری اور ادھورا جائزہ تھا اور اب میں مکمل کارروائی کے لئے وہاں پہنچا تھا۔ ہم نے اپنے گھوڑوں کو درختوں سے باندھ دیا اور اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

ٹھیک آدھے گھنٹے بعد میں نے جائے وقوعہ پر ضابطہ کی کارروائی مکمل کر لی۔ مشیر نامہ تیار کرنے میں کانسٹیبل قدیر نے میری بھرپور مدد کی۔ اس کارروائی کے دوران میں، میں نے اس درخت کا بھی تنقیدی جائزہ لیا جس کے تنے سے گزشتہ رات ململ کا سفید دوپٹہ

PDF LIBRARY 0333-7412793

بندھا ہوا ملا تھا۔ میں نے رات موقع واردات سے روانہ ہوتے وقت مذکورہ درخت کے تنے کے ساتھ زمین پر ایک بڑا پتھر رکھ دیا تا کہ نشان رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔

الغرض اس تمام تر کارروائی کے نتیجے میں، میں ڈاکوؤں تک رسائی حاصل کرنے کے لئے کوئی مفید سراغ حاصل نہ کر سکا۔ کھوجی بابا دین محمد میرے پاس آیا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔

''ملک صاحب! اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اپنا کام شروع کر دوں؟''

اس کے انداز میں بڑا واضح جوش پایا جاتا تھا۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا اور تیز لہجے میں کہا۔ ''یہ کام تو تم اجازت حاصل کئے بغیر ہی شروع کر چکے ہو!''

وہ ٹھٹک کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں اپنی کارروائی کے دوران میں مسلسل دین محمد پر بھی نگاہ رکھے ہوئے تھا اور میں نے اس عرصے میں اسے مصروفِ عمل پایا تھا۔ وہ راہ گزر کی شمالی اور جنوبی دونوں سمت اپنی مہارت کو آزمانے میں لگا رہا تھا اور اس وقت میں اس کے چہرے پر جو رنگ دیکھ رہا تھا، اس سے ظاہر ہوتا تھا، وہ کوئی اہم بات جاننے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

''لگتا ہے تم نے کوئی خاص نکتہ پکڑ لیا ہے!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفساریہ لہجے میں کہا۔

وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ دین محمد عرف بابا دینا نے ڈاکوؤں کے گھوڑوں کا کھرا تلاش کر لیا تھا۔ وہ راہ گزر کی جنوبی سمت جنگل کی زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''دیکھیں، یہاں سے بارہ گھڑ سوار جنگل کے اس حصے میں داخل ہوئے ہیں۔''

''بارہ گھڑ سوار؟'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں دہرایا۔

''جی ہاں، میں بارہ گھوڑوں کے سموں کے نشانات کو جنگل کے اس حصے کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔'' وہ پُر وثوق انداز میں بولا۔ ''میرا برسوں کا تجربہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا سرکار۔''

''دین محمد!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کوئی چار درجن باراتیوں نے چھ گھڑ سوار ڈاکوؤں کی گواہی دی ہے۔ تعداد کے سلسلے میں ان سب کا بیان تضاد سے پاک ہے۔ اور تم ......'' میں اپنی بات نامکمل چھوڑ کر تھوڑا متوقف ہوا پھر مزید کہا۔

''تم بارہ گھڑ سواروں کی نئی کہانی سنا رہے ہو۔ کہیں ساٹھ کا ہندسہ عبور کرنے کے بعد تم سٹھیا تو نہیں گئے؟''

دین محمد کھوجی کی عمر پینسٹھ سے متجاوز تھی تاہم اس کی نگاہ اور قویٰ ابھی تک درست حالت میں کام کرتے تھے۔ میں نے سٹھیانے والی بات اس کے فتوے کے پیش نظر بے ساختہ کہی تھی۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''مائی باپ! میں سٹھیایا ہوں اور نہ ہی میرا ہنر کوئی غلط رہنمائی کر رہا ہے۔ میری گناہ گار آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں اور ناقص بدھی جو نتیجہ اخذ کر رہی ہے، میں تو اس کے مطابق بول رہا ہوں۔ یقین کرنا یا نہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے۔''

اس کی سنجیدگی نے مجھے متاثر کیا۔ میں نے اپنی توجہ اس کی جانب مبذول کرتے ہوئے کہا۔ ''اچھا، ٹھیک ہے ...... آگے بتاؤ تمہارا تجربہ اور تجزیہ کیا کہتا ہے؟''

وہ خاموشی کے ساتھ جنگل کے جنوبی حصے میں چند قدم آگے بڑھا اور حتمی لہجے میں بولا۔ ''یہ جگہ دیکھ رہے ہیں آپ!'' اس نے کچی زمین کی جانب اشارہ کیا اور مزید کہا۔ ''اس مقام سے ان بارہ گھڑ سواروں کی دو ٹولیاں بن گئی ہیں۔ چھ گھڑ سوار ادھر گئے ہیں اور باقی چھ گھڑ سوار ادھر۔'' بات ختم کرتے ہی اس نے ''اِدھر'' اور ''اُدھر'' کی نشاندہی بھی کر دی۔ دونوں سمتوں میں لگ بھگ پندرہ ڈگری کا زاویہ حائل تھا۔

میں کھوجی کی ماہرانہ پیش گوئی نما بات پر غور کر ہی رہا تھا کہ ذہن مین روشنی کا ایک تیز جھماکا ہوا۔ مجھے یاد آ گیا کہ گزشتہ رات میں نے چھ افراد پر مشتمل ایک گھڑ سوار پارٹی کو ڈاکوؤں کی تلاش میں تھانے سے روانہ کیا تھا اور انہیں ہدایت کی تھی کہ وہ جائے وقوعہ سے جنوب کی سمت جنگل میں داخل ہوں۔ ان چھ گھڑ سوار افراد میں چار میرے عملے کے آدمی تھے اور دو باراتی رہنمائی کے لئے ان کے ساتھ کر دیئے تھے۔ غالب امکان اس بات کا تھا کہ کھوجی بابا نے جو دیگر چھ گھڑ سواروں کا سراغ لگایا ہے، وہ پولیس کی متلاشی پارٹی ہی ہو!

میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''بابا دینا! اِدھر اُدھر جانے والے گھڑ سواروں میں تمہیں کوئی واضح فرق بھی دکھائی دے رہا ہے؟''

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ ''تھانے دار صاحب! گھوڑوں کا کھرا بتاتا ہے کہ ایک پارٹی میں شامل چھ گھوڑوں پر تو صرف ایک ایک آدمی سوار تھا جبکہ دوسری پارٹی میں شامل چھ گھوڑوں پر آٹھ افراد سوار تھے۔ میرے تجربے کے مطابق چار گھوڑوں پر ایک ایک سوار اور باقی گھوڑوں پر دو دو آدمی سوار تھے۔ گھوڑوں کے سموں کا دباؤ اور اس دباؤ کے نتیجے میں زمین پر بننے والا پھیلا ہوا کھرا اس حقیقت کو کھول کھول کر

PDF LIBRARY 0333-7412793

بیان کر رہا ہے۔ اور گستاخی معاف حضور!'' اس نے معافی چاہنے والے انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ دیئے پھر چٹانی لہجے میں گویا ہوا۔

''یہ تو میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، میرا علم مجھے دھوکا نہیں دے رہا۔''

میں پہلے بھی کھوج کے کئی کیسوں میں دین محمد کی مہارت اور تجربے کو آزما چکا تھا اور میں نے ہمیشہ اسے پرفیکٹ پایا تھا لیکن اس وقت اپنے علم کے اس جید نے آٹھ اور چھ گھڑ سواروں کی جو کہانی سنائی تھی اس نے میری سوچ میں ہلچل مچا دی تھی۔ میں ایک سنسنی خیزی کی کیفیت سے دوچار تھا۔ صورتِ حال روزِ روشن کی مانند مجھ پر عیاں ہو چکی تھی۔ بابا دینا کا تجربہ جھوٹا نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کہ ڈاکوؤں نے بارات پر شب خون مارنے کے بعد دُلہن اور زیورات و قیمتی تحائف سے بھرے ہوئے جستی صندوق کو بھی اُڑا لیا تھا۔ ظاہر ہے دُلہن رانی اور مذکورہ صندوق کو بھی گھوڑوں پر ہی لادا گیا تھا۔ لٰہذا کم و بیش دو افراد کا وزن بڑھ گیا اور یقیناً دو گھوڑوں پر اس وزن کو تقسیم کر کے لادا گیا ہو گا۔ ایک گھڑ سوار ڈاکو نے دُلہن کو سنبھالا ہو گا اور دوسرے نے قیمتی ملبوسات اور زیورات سے بھرے ہوئے صندوق کو۔ اس حساب سے اگر دیکھا جاتا تو کھوجی دین محمد سو فیصد درست نتائج اخذ کر رہا تھا۔

میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔ ''بابا دینا! ہم اس کھرّے کا تعاقب کریں گے جس میں چھ گھوڑوں پر آٹھ افراد سوار تھے!''

دین محمد نے کوئی سوال نہ کیا اور اپنے کام میں جت گیا۔ تاہم تھوڑی دیر بعد میں نے خود ہی اپنے اس فیصلے کی وضاحت کر دی۔

''مجھے اندازہ ہو گیا تھا!'' کھوجی نے پُر اعتماد لہجے میں تبصرہ کیا۔

ہم لگ بھگ آدھے گھنٹے تک گھنے جنگل میں جنوب کی سمت بڑھتے رہے۔ اس دوران میں کبھی ہم گھوڑوں پر سوار ہو جاتے اور کبھی گھوڑوں کی لگام تھام کر ساتھ ساتھ پیدل چلنے لگتے۔ کھوجی دین محمد ہم سے چند قدم آگے ہمارا راہنما بنا چل رہا تھا۔ میں اور کانسٹیبل قدیر اس کی ہدایت اور مشورے کے مطابق رُکتے اور آگے بڑھتے تھے۔ ہم اس وقت جس فن اور ہنر کی روشنی میں سفر کر رہے تھے اس کا ماہر اور عالم بہرحال دین محمد کھوجی ہی تھا۔ لٰہذا اس کی پیروی ہم پر لازم تھی!

کم و بیش نصف میل جنگل کے اندر آنے کے بعد دین محمد رک گیا۔ مجبوراً ہمیں بھی رکنا پڑا۔ کھوجی نے دس گز کے دائرے میں بہ غور جنگلی زمین کا جائزہ لیا اور حتمی لہجے میں

یہ فتویٰ صادر کر دیا۔

''اس مقام پر گھڑ سواروں نے قیام کیا ہے۔ میں یہاں گھوڑوں کے کھرّے کے علاوہ سات بندوں کا کھرّا بھی دیکھ رہا ہوں اور......'' وہ ایک لمحے کو ڈرامائی انداز میں خاموش ہوا پھر بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''اور...... ان سات بندوں کے کھرّے میں ایک عورت کا کھرّا بھی شامل ہے۔ یعنی یہاں پر چھ مردوں اور ایک عورت کے قدموں کا کھرّا موجود ہے۔''

اب اس بات میں کسی شک و شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ چھ ڈاکوؤں اور مغوی رانی نے اس مقام پر عارضی پڑاؤ ڈالا تھا۔ عارضی اس لئے کہ اب وہ وہاں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں نے سنسنی خیز لہجے میں دین محمد سے استفسار کیا۔

''تم جن چھ مردوں اور ایک عورت کے کھرّے کی بات کر رہے ہو، وہ ساتوں اب یہاں موجود نہیں ہیں۔ ذرا یہ بھی تو پتہ چلاؤ، وہ آگے کس طرف گئے ہیں؟''

''ابھی لیں جناب۔'' کھوجی یہ کہتے ہوئے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

دس منٹ بعد اس نے واپس آ کر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''جناب! میں یہ تو نہیں بتا سکتا، ان لوگوں نے یہاں کتنا قیام کیا ہے مگر ایک بات کا مجھے وثوق ہے، وہ یہاں سے واپس راہ گزر کی طرف گئے ہیں۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو دین محمد؟'' اس کی بات سن کر میں اچھل پڑا۔

''میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں سرکار۔'' وہ اٹل لہجے میں بولا۔

''لیکن...... وہ واپس کیسے جا سکتے ہیں؟'' اس کی بات ہضم ہونے والی نہیں تھی۔

وہ اپنی دھن میں بولتا چلا گیا۔ ''تھانے دار صاحب! تھوڑے فاصلے پر میں نے پھر چھ گھوڑوں کے سموں کا کھرّا ڈھونڈ لیا ہے۔ لگتا ہے، ساتویں عورت کو انہوں نے دوبارہ کسی گھوڑے پر سوار کر لیا تھا۔ ان چھ گھوڑوں کے کھرّوں میں دو کھرّے وہی بات ظاہر کر رہے ہیں، یعنی ایک ایک گھوڑے پر دو دو سوار۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا۔ ''یا یوں کہہ لیں، ان دو گھوڑوں میں سے ایک پر ڈاکو کے ساتھ دُلہن اور دوسرے پر ڈاکو کے ساتھ زیورات والا صندوق لدا ہوا تھا۔''

کھوجی کے ماہرانہ تجزیے سے ظاہر ہوتا تھا، ڈاکوؤں نے رانی سمیت کچھ وقت اس مقام پر گزارا تھا، پھر واپسی کی راہ لی تھی۔ واپسی والی صورت اگرچہ ناقابلِ ہضم تھی تاہم میں نے ایک دوسرے زاویے سے کھوجی سے پوچھا۔

PDF LIBRARY 0333-7412793

"دین محمد! اس مقام پر تم نے جن چھ مردوں اور ایک عورت کا کھرّا نکالا ہے، اس سے کسی افراتفری کا بھی اندازہ ہوتا ہے یا یہاں قیام کے دوران ان میں صلح صفائی ہی نظر آ رہی ہے؟"

وہ چھ ڈاکو ایک دُلہن کو بھری بارات سے اٹھا لائے تھے۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ رانی اس زیادتی کے خلاف مزاحمت نہ کرتی۔ اس نے خود کو چھڑانے اور ڈاکوؤں کے چنگل سے نکالنے کے لئے تھوڑی بہت جدوجہد تو کی ہو گی ...... اور یہ مدافعتی تگ و دو اس کے قدموں کے نشانات کی صورت میں وہاں ضرور ثبت ہونی چاہئے تھی۔ لیکن کھوجی کے جواب نے میرے تمام اندازوں کی نفی کر دی۔

"جناب! میرا ہنر اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس جگہ پر قیام کرنے والے سات افراد میں کسی قسم کی چھینا جھپٹی یا کھینچا تانی نہیں ہوئی۔ وہ لوگ امن و امان سے یہاں رکے اور پھر آگے بڑھ گئے۔ یعنی واپسی کی راہ پر گامزن ہو گئے۔"

پہلی بات کی طرح کھوجی کی یہ دوسری بات بھی میرے لئے ناقابلِ یقین تھی۔ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "کیا تم یہ ثابت کرنا چاہتے ہو، دُلہن راضی خوشی ڈاکوؤں کے ہاتھوں اغواء ہوئی ہے؟"

"جناب! میں تو اپنے تجربے کی روشنی میں کھرّے کے نتائج آپ کو بتا رہا ہوں۔" وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ "میں اپنے طور پر تو کچھ بھی ثابت کرنے یا توڑنے کی کوشش نہیں کر رہا۔"

ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے اس سے کہا۔ "ٹھیک ہے دین محمد! اب ہم اس کھرّے کا تعاقب کریں گے جو یہاں سے واپسی کی راہ دکھا رہا ہے۔ تم آگے آگے چلو گے۔"

وہ تھوڑی دیر تک سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر گردن جھکا کر بولا۔ "جو حکم سرکار! آ جائیں میرے پیچھے پیچھے۔"

دس پندرہ قدم ایک نیم بیضوی دائرے میں چلنے کے بعد ہم دوبارہ جنگل سے شمال کے رخ راہ گزر کی سمت بڑھنے لگے۔ تاہم اس مرتبہ زاویے میں تھوڑی تبدیلی آ گئی تھی۔ یہ وہ راستہ نہیں تھا جس پر چل کر ہم یہاں تک پہنچے تھے۔ ہم واپس راہ گزر کی جانب تو جا رہے تھے مگر با انداز دگر!

تھوڑی ہی دیر میں مجھے اندازہ ہو گیا، ہم قدرے مختلف راستے سے راہ گزر کی جانب

بڑھ رہے تھے۔ اس صورت میں بھی ہم مذکورہ راہ گزر تک پہنچ جاتے لیکن یہ وہ مقام نہ ہوتا جہاں گزشتہ رات تہرے جرم کی ایک لرزہ خیز واردات ہوئی تھی۔

اس وقت میرے ذہن میں تیز آندھیاں شور مچا رہی تھیں اور ان آندھیوں کا سبب وہ سوال تھا جو تھوڑی دیر پہلے میں نے بے ساختہ کھوجی دین محمد سے پوچھا تھا...... "کیا تم یہ ثابت کرنا چاہتے ہو، دُلہن راضی خوشی ڈاکوؤں کے ہاتھوں اغواء ہوئی ہے!"

میں نے کسی ذہنی الجھن کے باعث بے اختیار یہ سوال کر تو دیا تھا لیکن اب سوچ رہا تھا، ایسا ہونا ناممکنات میں سے تو نہیں۔ پھر رہ رہ کر اس واقعے کے مختلف پہلو میری سوچ میں اجاگر ہونے لگے۔ ڈاکوؤں کی نپی تلی لحاتی کارروائی، دُلہا کا قتل، قیمتی سامان سمیت دُلہن کا اغواء اور ڈاکوؤں کا محض ان افراد کو شدید زخمی کر کے ناکارہ بنانا جو مسلح تھے اور ان کے راستے کی رکاوٹ بن سکتے تھے۔ کیا ایسا تھا کہ ڈاکوؤں نے دُلہن کے ایما پر اسے اغواء کیا ہو؟

یہ بہت ہی خطرناک سوال تھا لیکن حالات و واقعات کی روشنی میں قرین قیاس لگتا تھا۔ اگر واقعی ایسا ہوا تھا تو پھر یہ بات بھی یقینی تھی کہ دُلہن عارف کی منکوحہ بن کر زندگی نہیں گزارنا چاہتی تھی۔ وہ کسی اور کو چاہتی تھی اور اسی شخص نے خود یا ڈاکوؤں کے توسط سے اغوا کر لیا تھا اور اس دھواں دھار انداز میں اغوا کیا تھا کہ اس علاقے کی ایک خونریز تاریخ مرتب ہو گئی تھی!

بہرحال، یہ سب امکانی باتیں تھیں اور یکسر غلط بھی ہو سکتی تھیں۔ ذہن کا کام ہے مسلسل سوچنا اور کسی خاص انداز میں سوچنے کے لئے اسے بس ایک معمولی سا اشارہ چاہئے ہوتا ہے۔ میں بھی اسی حوالے سے ایک مخصوص ڈگر پر رخشِ خیال کو دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ حقیقت کیا تھی، یہ تو آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا۔ اور بے شک وقت بہت بڑا معلم ہے۔

کچھ دیر بعد ہم اس راستے پر پہنچ گئے جو چک بتیس کو چک چوراسی سے ملاتا تھا اور اسی راستے پر گزشتہ رات ایک ناقابلِ فراموش واردات ہوئی تھی۔ تاہم حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ہم جس مقام پر نکلے تھے، وہ جائے وقوعہ سے لگ بھگ نصف میل کے فاصلے پر مغرب میں، چک بتیس کی سمت واقع تھا۔ پتہ نہیں وہ عجیب و غریب ڈاکو چند گھنٹوں کی دُلہن کو کہاں لے جانا چاہتے تھے!

میں نے سوالیہ نظر سے کھوجی دین محمد کو دیکھا اور کہا۔ "اب کہاں کا رخ کرنا ہے بابا

PDF LIBRARY 0333-7412793

دینا؟"

"جدھر کھرا لے جائے جناب!" وہ بدستور سنجیدہ لہجے میں بولا۔

ایک مرتبہ پھر ہمارا سفر شروع ہوگیا۔ اب ہم اس راستے سے شمال میں واقع گھنے جنگل میں آگے بڑھ رہے تھے۔ ڈاکو بہت ہی شاطر اور چالاک ثابت ہو رہے تھے۔ پہلے انہوں نے واردات کے فوراً بعد جنگل کے جنوبی حصے کی راہ اختیار کی چنانچہ لامحالہ میرا ذہن سلطان پور کی طرف چلا گیا۔ اب ان کا کھرا شمالی جنگل کی جانب بڑھ رہا تھا۔ پتہ نہیں حالات کا اونٹ کس کروٹ بیٹھنے کا ارادہ کئے ہوئے تھا۔ جب تک اس کھرے کے سہارے میں کسی واضح منزل تک نہ پہنچ جاتا، حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اور مجھے یقین تھا، بہت جلد میری یہ تگ و دو منزل کو ابھار کر سامنے لے آئے گی۔

انسان کا یقین اس کائنات کا طاقتور ترین جذبہ ہے۔ اس کے بل بوتے پر ناممکن کو ممکن بنایا جا سکتا ہے۔ خالق اور مخلوق کا تعلق بھی اسی جذبے پر استوار ہے ورنہ وہ ذات پاک انسان کے عملی تجربے میں آنے والی نہیں!

جلد ہی میرا یقین رنگ لے آیا اور ہم ڈاکوؤں کا کھرا پکڑتے ہوئے ایک متروک کنوئیں تک جا پہنچے۔ یہ مقام جنگل کے اختتام پر واقع تھا۔ کھوجی نے متروک کنوئیں کے پاس رکتے ہوئے کہا۔

"یہاں پر بھی ان لوگوں نے رک کر کچھ وقت گزارا ہے۔"

ہم گھوڑوں سے اتر آئے اور اس مقام کا جائزہ لینے لگے۔ کھوجی ایک مرتبہ پھر کھوج کے کام میں مصروف ہوگیا۔ وہ وہاں کی زمین کو اپنے تجربے کی کسوٹی پر پرکھ رہا تھا۔ میں اور کانسٹیبل گھوم پھر کر کچھ تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ کیا؟ یہ ذہن میں واضح نہیں تھا۔ بس ہم کچھ نہ کچھ ڈھونڈ نکالنے کی تگ و دو میں تھے۔

وہ جنگل کا اختتام تھا۔ اگر وہاں سے سیدھا شمال میں مزید سفر جاری رکھا جاتا تو لگ بھگ پانچ میل بعد موضع شاہکوٹ واقع تھا۔ شاہکوٹ سے ایک راستہ چک بتیس کی طرف بھی آتا تھا۔ یہ تمام گاؤں دیہات میرے تھانے کی حدود میں آتے تھے اور میرے دیکھے بھالے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں بہت کم تھانے ہوا کرتے تھے۔ بعض تھانوں کی حدود تو پچیس تیس میل سے بھی تجاوز کر جاتی تھی۔ آج کل کی طرح آسانیاں حاصل نہیں تھیں۔ تاہم ایک بات میں افسوس کے ساتھ ضرور کہوں گا اور وہ یہ کہ وقت کے ساتھ ساتھ ہم نے بہت ترقی کی ہے مگر اکثر شعبوں میں یہ ترقی معکوس کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارے زمانے

میں جرائم کی بیخ کنی کا تناسب آج سے بہت زیادہ تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد میری تلاش نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ میں ایک جستی صندوق تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس صندوق کا سائز لگ بھگ ڈیڑھ ضرب ڈھائی فٹ رہا ہوگا۔ صندوق گھنے درختوں کے درمیان کھلا اور الٹا پڑا تھا۔ ایک نظر دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا، صندوق کا تالا توڑ کر اسے کھولا گیا تھا۔

میں نے اس صندوق کو سیدھا کیا تو یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ وہ خالی تھا۔ اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں تھی کہ یہ وہی جستی صندوق تھا جسے بارات سے دُلہن کے ساتھ ہی اُڑا لیا گیا تھا۔ اب وہاں دُلہن کہیں نظر آ رہی تھی اور نہ ہی صندوق کا قیمتی سامان کہیں دکھائی دے رہا تھا۔ بادی النظر میں یہی محسوس ہوتا تھا ڈاکوؤں نے صندوق کا سامان سمیٹ کر ایک پوٹلی بنا لی ہوگی اور وزنی صندوق سے نجات حاصل کر کے آگے بڑھ گئے ہوں گے۔

آگے کہاں؟ کس طرف؟ ان سوالات کے جوابات کھوجی ہی دے سکتا تھا!

تھوڑی دیر بعد دین محمد ہمارے قریب آ گیا۔ میں نے اسے جستی صندوق کے بارے میں بتایا۔ اس نے میرے اندازے سے اتفاق کیا اور بولا۔

"مجھے بھی یہی لگتا ہے جناب! وہ لوگ صندوق کا سامان سمیٹ کر آگے بڑھ گئے ہیں۔"

میں نے جلدی سے پوچھا۔ "آگے کہاں دین محمد؟"

وہ اپنی پیشانی کو مسلتے ہوئے بولا۔ "یہاں سے وہ دو مختلف سمتوں میں روانہ ہوئے ہیں۔ ایک گھوڑے کا کھرا شمال کی نشاندہی کر رہا ہے۔ اس گھوڑے پر سوار افراد کی تعداد دو ہے۔ باقی پانچ گھوڑوں کے سموں کا کھرا واپس جنگل کی طرف جاتا دکھائی دیتا ہے۔"

یہ ایک اُلجھی ہوئی صورتِ حال تھی۔ میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ مجھے خاموش دیکھ کر دین محمد نے پوچھا۔ "اب کس طرف چلنے کا حکم ہے سرکار؟"

میں نے ایک لمحہ غور کیا۔ شمال کی سمت دور دور تک کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ کھیتوں کے درمیان سے ایک تنگ سا کچا راستہ شاہکوٹ جاتا تھا جو وہاں سے کم و بیش پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ ہمارے عقب میں وہی گھنا جنگل تھا جس سے گزر کر ہم یہاں تک پہنچے تھے۔ ایک فیصلے پر پہنچنے کے بعد میں نے کھوجی سے کہا۔

"پہلے جنگل کو چیک کر لیتے ہیں۔ پھر شمالی رخ کو بھی دیکھ لیں گے۔"

PDF LIBRARY 0333-7412793

"جو حکم آپ کا۔" وہ فرمانبرداری سے بولا۔

کھوجی نے اپنا کام شروع کر دیا۔ میں اور کانسٹیبل قدیر اس کی پیروی میں آگے بڑھنے لگے۔ ہم جس سمت سے چلتے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے، واپس جاتے ہوئے اس سمت میں اچھا خاصا فرق آ گیا تھا۔ اس تبدیل شدہ زاویے پر سفر کرتے ہوئے ہم آگے بڑھ رہے تھے کہ موسم کے تیور بدلنے لگے۔

کھوجی نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اللہ خیر کرے ...... اس وقت بارش نہیں ہونی چاہئے ورنہ ساری محنت ضائع ہو جائے گی۔"

ہم اس وقت گھنے جنگل میں سے گزر رہے تھے۔ جہاں کہیں سے آسمان نظر آ رہا تھا وہاں سے آسمان کے ارادے بڑے خطرناک دکھائی دے رہے تھے۔ گلابی جاڑے کا آغاز تھا۔ موسمِ سرما کے آغاز سے پہلے ایک آدھ بارش ہو جایا کرتی تھی جس سے درجۂ حرارت میں بڑی حد تک کمی واقع ہو جاتی تھی۔ یہ ایک طرح سے موسمِ سرما کا ٹریلر ہوا کرتا تھا۔

میں بھی اس وقت دل سے بارش کی مخالفت میں تھا۔ ہم ڈاکوؤں کا کھرا پکڑ کر کسی نتیجے پر پہنچنے والے تھے۔ اس موقع پر واقعی بارش رنگ میں بھنگ ڈال دیتی۔ ہم سدِ راہ کھو بیٹھتے اور ایک مرتبہ پھر وہیں کھڑے ہوتے جہاں سے چلے تھے۔

میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "دین محمد! دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں۔ انشاء اللہ کچھ نہیں ہو گا ...... تم اپنے کام کی رفتار کو بڑھا دو۔"

"وہ تو میں آپ کے حکم سے پہلے ہی بڑھا چکا ہوں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

ہم تیز رفتاری سے اپنا کام کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے اور مزید ایک گھنٹے کی "عرق ریزی" کے بعد ہم اس راستے پر نکل آئے جس پر وہ سنگین واردات وقوع پذیر ہوئی تھی۔ لیکن اس مرتبہ ہم ایک نئے مقام پر کھڑے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق یہ مقام جائے وقوعہ سے کافی فاصلے پر مغربی حصہ تھا۔

میں نے نگاہ اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ میں نے نیلے جاودانی آسمان کو اس وقت گہرے سرمئی بادلوں سے ڈھکا ہوا پایا۔ حالانکہ جب صبح ہم تھانے سے روانہ ہوئے تھے تو مطلع صاف و شفاف تھا۔ ہماری جنگل نوردی کے دوران ہی میں آسمان کا مزاج بدلا تھا۔ شاید ایسے ہی موقع کے لئے کہا جاتا ہے، بدلتا ہے رنگِ آسماں کیسے کیسے!

میں نے کھوجی کو زمین کے ساتھ مصروف پایا تو اس کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "موسم کے تیور تم بھی دیکھ چکے ہو دین محمد! جو بھی کرنا ہے جلدی

جلدی کر لو۔ ورنہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ ابھی ہمیں واپس متروک کنوئیں کی طرف بھی جانا ہے۔"

"جناب! میں نے پانچ گھوڑوں کے سموں کا کھرا نکال لیا ہے۔" وہ پُر وثوق انداز میں بولا۔ "وہ لوگ اسی راستے پر چلتے ہوئے مغرب کی طرف گئے ہیں۔ آپ کا حکم ہو تو میں آگے بڑھوں؟"

دین محمد کے انکشاف نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ مغرب کی جانب چک بتیس واقع تھا۔ مغوی دُلہن رافعہ عرف رانی کا تعلق اسی چک سے تھا۔ میرے چونکنے کا سبب رانی نہیں بلکہ بشارت اینڈ کمپنی تھا۔ رانی کا ماموں الیاس اور اس کا بیٹا بشارت اسی گاؤں میں رہتے تھے اور یہ لوگ مشکوک افراد کی فہرست میں ٹاپ پر تھے۔ میں برق رفتاری سے ان کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

مقتول عارف کے باپ خدا بخش کا کہا ہوا ایک ایک لفظ میرے ذہن میں تازہ تھا۔ اس کے بیان کے مطابق رانی کی ماں خدیجہ اپنی بیٹی کی شادی، بھائی الیاس کے بیٹے سے کرنا چاہتی تھی۔ الیاس کا بیٹا بشارت بھی رانی کو چاہتا تھا لیکن رانی کا باپ اللہ بخش اپنے سالے اور اس کے بیٹے کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ لہٰذا اس نے بیوی کی ہزار مخالفت کے باوجود بھی بیٹی کی شادی چھوٹے بھائی کے بیٹے عارف سے کر دی جس کے نتیجے میں بشارت اور الیاس وغیرہ نے اس شادی کا مکمل بائیکاٹ کر دیا تھا۔

ڈاکوؤں کے قدموں کے آثار چک بتیس کی جانب بڑھنے لگے تو میرا ذہن لامحالہ منفی زاویے پر الیاس اور اس کے بیٹے بشارت کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں نے دین محمد سے کہا۔

"نیک کام میں تاخیر مناسب نہیں ہوتی دین محمد۔ بسم اللہ کرو۔"

میری بات ختم ہوئی تھی کہ آسمان کے آنسو نکل آئے۔ پتہ نہیں یہ خوشی کے آنسو تھے یا ماتم کے! دیکھتے ہی دیکھتے ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ اس لمحے میرے ذہن میں یہ حقیقت تازہ ہو گئی ...... تدبیر کند بندہ، تقدیر زند خندہ!

"لو جی، ہو گیا کام!" کھوجی نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے مایوسی سے کہا۔

میں نے امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور قدرے مضبوط لہجے میں کہا۔ "دین محمد! دل ہارنے کی ضرورت نہیں ...... تم آگے بڑھتے رہو۔ مجھے لگتا ہے جلد ہی یہ بوندا باندی رُک جائے گی۔"

PDF LIBRARY 0333-7412793

آسمان شاید میری آواز پر کان لگائے بیٹھا تھا۔ ادھر میں نے بات پوری کی، ادھر بارش کی رفتار میں اضافہ ہو گیا۔ اب باقاعدہ مینہ برس رہا تھا، اسے بوندا باندی کہنا سخت حماقت ہوتی۔ دین محمد نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

''ملک صاحب! ڈاکوؤں کا کھرا تو سمجھیں گیا ہاتھ سے۔ اب ہمیں خود کو بھیگنے سے بچانا ہوگا۔ اگر یہ پالا (ٹھنڈ) میری بوڑھی ہڈیوں میں اتر گیا تو بڑی آفت مچ جائے گی۔''

دین محمد اگرچہ پینسٹھ کے قریب تھا لیکن اس کی صحت کو قابلِ رشک کہا جا سکتا تھا۔ یہ معمولی سی سردی اس کی ہڈیوں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ بہرحال اس نے بھیگنے سے بچنے والی بات بڑی معقول اور بروقت کی تھی۔

یہ ایک آزمودہ حقیقت ہے کہ کسی بھی موسم کی ابتدائی شدت اور سختی انسانی صحت کے لئے زیادہ تکلیف کا باعث ہوتی ہے۔ اس میں بیماریاں منہ کھولے اور پَر پھیلائے چاروں جانب منڈلا رہی ہوتی ہیں۔ اس کی نسبت جاتے ہوئے موسم کی شدت اور سختی ہمیشہ فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔

اس بات کے آثار نہیں تھے کہ بارش ہو جائے گی لہٰذا ہم نے تھانے سے روانہ ہوتے وقت بارش سے بچاؤ کا کوئی بندوبست بھی نہیں کیا تھا۔ ہمارے جسموں پر مناسب گرم لباس موجود تھا لیکن اگر یہ لباس بارش میں شرابور ہو جاتا تو اس کی ساری گرمی ایک طرف رہ جاتی، الٹا یہ ہمارے لئے جی کا جنجال بن کر رہ جاتا۔ اس اچانک شروع ہو جانے والی بارش نے موسم سرما کو باقاعدہ آغاز دے دیا تھا۔ میں نے دین محمد کھوجی کی بات کے جواب میں کہا۔

''دین محمد! تم عمر کے لحاظ سے لاکھ بڈھے سہی لیکن تمہاری ہڈیاں ہم جوانوں سے زیادہ برداشت کی مالک ہیں۔ یہ ہلکی پھلکی بارش تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ بہرحال، اس سے بچنا بھی ضروری ہے۔'' میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس وقت بارش کے خلاف سب سے محفوظ پناہ گاہ یہ گھنا جنگل ہی ہے ...... آؤ اس طرف چلتے ہیں۔''

پھر ہم گھوڑوں پر سوار ہو کر آگے پیچھے جنگل میں داخل ہو گئے۔ جلد ہی ہم ایک ایسے مقام تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جہاں تین درختوں کے بالائی حصے آپس میں خلط ملط ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کی چوٹیاں باہم پیوست ہو کر ایک بلند و بالا چھتری کی صورت اختیار کر چکی تھیں۔ پتے دار گھنی شاخوں میں سے چھن کر بارش کا پانی نیچے تک نہیں

پہنچ پا رہا تھا۔ گویا ہم وہاں پناہ لے کر بارش سے واقعی محفوظ ہو گئے تھے!

دین محمد کھوجی نے چہرہ اٹھا کر اوپر دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''بس جی، خدا کی قدرت ہے۔''

اس کے اس مبہم سے جملے نے مجھے اُکسایا اور میں نے پوچھ لیا۔ ''دین محمد! تمہیں اس ہنگامی پناہ گاہ میں خدا کی کون سی قدرت نظر آئی ...... ذرا مجھے بھی تو بتاؤ؟''

''جناب! خدا ہر جگہ موجود ہے اس لئے اس کی قدرت بھی ہر جگہ پائی جاتی ہے۔'' وہ کسی فلسفی کے سے انداز میں بولا۔ ''ویسے میں اس وقت اس نیلی اور ہری چھتری کی بات کر رہا تھا۔''

''نیلی اور ہری چھتری؟'' میں نے چونک کر سوال کیا۔

وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ادھر باہر راہ گزر پر نیلی چھتری ہمیں بھگونے پر تلی ہوئی تھی اور یہاں ہری چھتری نے ہمیں بھیگنے سے محفوظ کر رکھا ہے۔ اندر بھی خدا کی قدرت، باہر بھی اس کی قدرت!''

میں پلک جھپکتے میں سمجھ گیا، نیلی اور ہری چھتری سے اس کی مراد بالترتیب آسمان اور درختوں کا جھنڈ تھی۔ بعض اوقات ایک سیدھا سادھا اَن پڑھ شخص بھی اتنی گہری بات کر جاتا ہے کہ ہزاروں لاکھوں کتابیں اپنے ذہنوں میں اتارے ہوئے بھی عش عش کر اٹھتے ہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اَن پڑھ کو کبھی جاہل نہیں سمجھنا چاہئے۔ سمجھ داری اور بردباری کا تعلق علم سے نہیں بلکہ عمل اور تجربے سے، مشاہدے سے اور غور و فکر سے ہے ...... اور یہ تمام تر کام کسی کتاب کو ہاتھ لگائے بغیر بھی کئے جا سکتے ہیں!

ہم نے گھنے درختوں کے اس جھنڈ میں بمشکل بیس پچیس منٹ گزارے ہوں گے کہ بارش تھم گئی۔ میں نے دین محمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''چلو باہر نکل کر راستے کا جائزہ لیتے ہیں۔''

''ہاں جناب! اب تو راستے کا جائزہ ہی لیا جا سکتا ہے۔ یہ بے چارہ کہیں نہیں جاتا۔ حالانکہ ازل سے انسان کہتا چلا آ رہا ہے اور ابد تک کہتا رہے گا کہ فلاں راستہ فلاں جگہ جاتا ہے۔ ان اللہ کے بندوں سے کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ ایسی باتیں کیوں کرتے ہو۔ بھئی، راستہ تو اپنی جگہ رہتا ہے لیکن اس پر سفر کرنے والے اِدھر اُدھر ہو جاتے ہیں جیسے اپنے یہ ڈاکو ...... اور ان کے گھوڑوں کے سموں کے نشان۔''

دین محمد کی تجربہ کاری نے ڈھکے چھپے انداز میں مجھے باور کرا دیا کہ ہم ڈاکوؤں کے

PDF LIBRARY 0333-7412793

کھرے سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ جب ہم گھنے جنگل میں سے نکل کر کچے راستے پر پہنچے تو اس کی بات سچ ثابت ہوگئی۔ درختوں کی آڑ میں رہتے ہوئے ہمیں اندازہ نہیں ہوا تھا، باہر بارش نے کیا کیا کارنامے سرانجام دے ڈالے تھے۔ اب جو دیکھا تو پتہ چلا، دوسرے برساتی مسائل تو رہے ایک طرف، ڈاکوؤں کا کھرا ناپید ہو چکا تھا۔ ہماری اب تک کی ساری محنت اکارت ہوگئی تھی۔

میں نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ بہت برا ہوا!''

''خدا کو یہی منظور تھا جناب!'' دین محمد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس کے اظہار کا انداز ایسا تھا جیسے کسی کی موت پر گہرے غم کے ساتھ ساتھ وہ ایک ازلی حقیقت کو بھی بیان کر رہا ہو۔

میں نے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، ادھر متروک کنوئیں کی جانب جانے کا کوئی فائدہ ہوگا؟''

''مجھے یقین ہے، کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' وہ اٹل لہجے میں بولا۔ ''اس طرف کنوئیں سے آگے کھیتوں کا ایک طویل سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ اس بارش کے بعد ادھر کسی کا کھرا نکالنا ممکن نہیں رہا۔ لیکن اگر آپ کا حکم ہو تو میں چلنے کو تیار ہوں۔''

دین محمد ایک وزنی اور معقول بات کر رہا تھا۔ متروک کنوئیں سے آگے کا علاقہ میں نے بھی دیکھا تھا۔ لہلہاتے سرسبز کھیتوں کے بیچ میں سے ایک تنگ سا کچا راستہ شاہکوٹ کی طرف جاتا تھا۔ وہ راستہ اس راہ گزر سے کہیں زیادہ مخدوش تھا جس پر گزشتہ رات ڈاکوؤں نے وحشیانہ پن کا مظاہرہ کیا تھا۔ جب راہ گزر پر ڈاکوؤں کا کھرا ناپید ہو چکا تھا تو پھر کھیتوں کے بیچ سے کھرا اٹھانے کی کوشش کرنا وقت ضائع کرنے کے مترادف تھا۔

لمحاتی سوچ بچار کے بعد میں اس فیصلے پر پہنچا کہ ہمیں واپسی کا رخ کرنا چاہئے۔ میرے حکم پر قدیر اور دین محمد نے اپنے گھوڑے موڑ لئے اور ہم تھانے کی جانب روانہ ہو گئے۔

لگ بھگ پانچ گھنٹے کی اس بھاگ دوڑ میں انتہائی کام کی دو باتیں معلوم ہوئی تھیں۔

اول، ایک گھوڑے پر سوار دو افراد جنگل کے اختتام پر شمال کی سمت بڑھے تھے۔ وہ شاہکوٹ گئے تھے یا کہیں اور، اس بارے میں سردست کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ دوم، پانچ گھوڑوں پر سوار باقی ڈاکوؤں نے چک بتیس کا رخ کیا تھا۔ یہ بھی حتمی نہیں تھا کہ وہ چک بتیس پہنچے تھے یا کسی اور سمت نکل گئے تھے۔ اگر ہم ان کا کھرا کھو نہ دیتے تو ہماری منزل

آسان ہو جاتی۔

ڈاکوؤں کا کھرا بارش کے سبب غائب ہوا تھا جو ایک قدرتی عمل ہے۔ قدرت کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے، انسان اس کو سمجھے یا نہ سمجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا!

☆☆☆

تھانے میں ایک ہجوم لگا ہوا تھا۔

ان میں زیادہ تعداد چک بتیس والوں کی تھی۔ دُلہن کا باپ اللہ بخش، اس کی بیوی خدیجہ اور دیگر کئی رشتے دار وہاں پہنچے تھے۔ ظاہر علی نے جیسے ہی یہ اندوہناک خبر وہاں پہنچائی، وہ لوگ روتے دھوتے اور گرتے پڑتے میرے پاس آ گئے تھے۔ ان میں چک چوراسی کے چند افراد بھی شامل تھے۔ اللہ بخش کا چھوٹا بھائی خدا بخش بھی ایک طرف سر جھکائے آزردہ بیٹھا تھا۔ ان سب کی آنکھوں میں ایک ہی سوال تھا...... ڈاکوؤں کا سراغ ملا کہ نہیں؟

میں سب کو ایک ساتھ اپنے کمرے میں بلا کر مچھلی بازار گرم نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا دو انتہائی متعلقہ افراد کو اندر بلا لیا، یعنی دُلہن اور دُلہا کے باپ اللہ بخش اور خدا بخش کو۔

''تھانے دار صاحب! آپ کے علاقے میں یہ کیا قیامت گزر گئی؟'' اللہ بخش دل گرفتہ لہجے میں بولا۔

میں اس کی دلی کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ پہلے تو میں نے نہایت ہی مختصر اور مؤثر الفاظ میں اس واقعے پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے اپنے تعاون کا بھرپور یقین دلایا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اس قیامت کو برپا کرنے کے ذمے دار افراد کو میں جس قیامت سے گزاروں گا اسے بھی دنیا دیکھے گی۔ آپ لوگ حوصلہ رکھیں۔ میں گزرے ہوئے وقت کو تو پیچھے نہیں لا سکتا البتہ ڈاکوؤں کی گرفتاری اور دُلہن کی بازیابی کے لئے میں حتیٰ المقدور کوشش کر رہا ہوں۔''

خدا بخش نے پوچھا۔ ''آپ آج صبح سے جائے وقوعہ کی طرف گئے ہوئے تھے۔ کوئی کامیابی حاصل ہوئی؟''

''ہاں، جزوی کامیابی ہاتھ آئی ہے۔'' میں نے پُر سوچ انداز میں کہا۔ پھر انہیں اس بھاگ دوڑ کے نتائج سے آگاہ کر دیا۔

اللہ بخش نے کہا۔ ''یہ تو بہت ہی اُلجھی ہوئی صورتِ حال ہے۔ دو ڈاکو متروک کنوئیں

PDF LIBRARY 0333-7412793

سے کھیتوں کی جانب بڑھ گئے، باقی ڈاکوؤں نے چک بتیس کا رخ کیا۔ یہ کیسے پتہ چلے گا وہ لوگ میری رانی کو کہاں لے گئے ہیں؟''

''یہ پتہ تو تمہارے تعاون سے چل سکتا ہے اللہ بخش!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ جلدی سے بولا۔''میں تو ہر قسم کے تعاون کے لئے تیار ہوں۔ آپ حکم کریں۔''

میں چند لمحات تک گہری نظر سے باری باری ان دونوں بھائیوں کو دیکھتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔''دیکھو بھائی! یہ تو ظاہر ہے ڈاکوؤں کی کارروائی کسی بھیانک انتقام کا نتیجہ ہے۔ یہ تم دونوں میں سے کسی کے دشمن کا بھی کارنامہ ہوسکتا ہے۔ یہ دشمنی عارف یا رافعہ سے بھی ممکن ہے۔ ڈاکوؤں نے بھری پری بارات پر شب خون مار کر دُلہا کو قتل کیا اور دُلہن کو زیورات کے صندوق سمیت اٹھا کر لے گئے۔ صندوق کا قصہ میں تم لوگوں کو سنا چکا ہوں۔ تم دونوں نے صندوق کو شناخت بھی کرلیا ہے۔''

میں نے تھوڑا توقف کر کے ان کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لیا۔

جنگل سے واپسی پر تالا ٹوٹا ہوا وہ خالی صندوق ہم اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ اللہ بخش اور خدا بخش کو وہ صندوق دکھا کر میں نے تصدیق کر لی کہ یہ وہی صندوق تھا جس میں دُلہن کے زیورات، عروسی ملبوسات اور دیگر قیمتی تحائف رکھے ہوئے تھے۔ میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''جہاں تک میں ڈاکوؤں کا کھرا اُٹھوانے میں کامیاب ہوا ہوں اس کے مطابق دُلہن رانی کو یا تو شاہکوٹ کی طرف لے جایا گیا ہے یا پھر اسے چک بتیس پہنچایا گیا ہے۔ اب تم مجھے بتاؤ گے، ان دو مقامات پر تم لوگوں کا کون دشمن ہوسکتا ہے؟''

اللہ بخش نے کہا۔''شاہکوٹ میں تو میری چھوٹی سالی سلمٰی رہتی ہے۔ وہ بے چاری بیوہ ہے اور اپنے جھلّے بیٹے کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔ سلمٰی کا ہمارے گھر میں آنا جانا ہے۔ ہمارے درمیان بہت خوشگوار تعلقات ہیں۔ اس کی طرف سے کسی قسم کی دشمنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سلمٰی تو بڑی دھوم دھام سے شادی کی تمام تقریبات اور رسموں میں شامل رہی ہے۔ وہ آٹھ دس دن سے اپنے بیٹے کے ساتھ ہمارے گھر میں ٹھہری ہوئی ہے اور بارات کے ساتھ وہ بھی چک چوراسی کی طرف آئی ہے۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر دل گیر لہجے میں بولا۔

''رانی، سلمٰی کے ساتھ بہت گھلی ملی ہوئی ہے۔ اسی لئے رانی کی ضد پر وہ اسے سسرال

پہنچانے ساتھ چلی آئی تھی۔ میں ابھی تک سلمٰی سے نہیں مل سکا۔ پتہ نہیں، اس بے چاری کا کیا حال ہوگا۔ چک چوراسی پہنچتے ہی ہم سیدھے تھانے چلے آئے ہیں۔''

''میں کل رات تمہاری سالی سلمٰی سے مل چکا ہوں۔'' میں نے اللہ بخش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''وہ رانی کو پیش آنے والے واقعے کی وجہ سے بہت پریشان ہے۔ میں نے اسے کافی تسلی دی ہے۔ وہ خاصی سمجھدار عورت ہے۔ اس نے مجھے ایک راہ بھی سجھائی تھی۔ میں نے اس کی دکھائی ہوئی راہ پر چند قدم بڑھائے ہیں لیکن تازہ ترین حالات سے لگتا ہے سلمٰی کی فراہم کردہ معلومات سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔''

خدا بخش نے چونک کر مجھے دیکھا اور پوچھا۔''سلمٰی سے آپ کی ملاقات میرے گھر میں ہوئی تھی۔ آپ نے مجھ سے تو ذکر نہیں کیا، اس نے آپ کو کیا راہ سجھائی تھی؟''

''میں نے تم سے ذکر کیا تھا خدا بخش!'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔''شاید پریشانی میں تمہارے ذہن سے نکل گیا ہے۔ ویسے اس میں تمہارا کچھ زیادہ قصور بھی نہیں ہے۔ میں نے تم سے بات کرتے ہوئے معلومات فراہم کرنے والے یعنی سلمٰی کا نام چھپا لیا تھا۔''

''وہ بات کیا تھی ملک صاحب؟'' اللہ بخش نے تجسّس بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

''ہاں، ہاں ...... بتائیں!'' خدا بخش اضطراری انداز میں بولا۔

میں نے بتایا۔''وہ مہر مشتاق اور عارف کے جھگڑے والی بات بھول گئے ہو؟''

''اوہ .....'' خدا بخش گہری سانس لے کر رہ گیا۔

میں نے کہا۔''میں نے جب تم سے اس جھگڑے کے بارے میں دریافت کیا تو تم نے پوچھا تھا، یہ بات مجھے کس نے بتائی؟ میں نے سلمٰی کا نام ظاہر کئے بغیر تم سے سارا احوال لے لیا تھا!''

''ہاں ...... یہ سارا واقعہ تو مجھے یاد ہے۔'' وہ جلدی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔''آپ نے کہا تھا کہ رانی کی تلاش میں آپ سلطان پورہ کے مہر خاندان کو بھی چیک کریں گے لیکن......'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر متوقف ہوا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اب آپ بتا رہے ہیں اس سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ ایسا کیوں ہے؟''

''فوری طور پر تو میں کوئی حتمی بات نہیں کرسکتا۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔''مگر جو حالات سامنے آرہے ہیں ان کے حساب سے ڈاکوؤں نے یا تو چک بتیس کا رخ کیا ہے یا پھر وہ شاہکوٹ کی طرف گئے ہیں۔ شاہکوٹ کا امکان اللہ بخش نے رد کر دیا۔ وہاں اس کا کوئی دشمن نہیں بستا۔'' پھر میں نے خدا بخش کی آنکھوں میں دیکھتے

PDF LIBRARY 0333-7412793

ہوئے پوچھا۔
''کیا تمہارا کوئی دشمن شاکوٹ سے تعلق رکھتا ہے؟''
''نہ کوئی دوست اور نہ ہی کوئی دشمن!'' وہ قطعیت سے بولا۔ ''اس طرف کبھی میرا جانا نہیں ہوا۔''
میں نے کہا۔ ''پھر زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ شاکوٹ کی جانب بڑھنے والے دو گھڑ سوار، یعنی ایک گھوڑے پر سوار دو افراد آگے جا کر کہیں اور مڑ گئے ہوں گے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے وہ تھوڑا فاصلہ رکھ کر جنگل کے ساتھ ساتھ مغرب کی جانب بڑھ رہے ہوں اور بالآخر کسی مقام پر وہ اپنے ساتھیوں سے جا ملے ہوں۔ اس قسم کی چکر بازی وہ جنگل کے جنوبی حصے میں کر چکے ہیں۔ پولیس یا پیچھا کرنے والوں کو گمراہ کرنے کے لئے وہ اس قسم کی چال چل سکتے ہیں، دشمن کو کبھی بے وقوف نہیں سمجھنا چاہئے۔''
میں نے ایک لمحے کا توقف کر کے باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لیا اور کہا۔ ''اگر اچانک بارش نہ ہو جاتی تو میں ڈاکوؤں کی حتمی منزل تک بھی پہنچ ہی جاتا، پھر مغوی دُلہن کا سراغ لگانا چنداں مشکل نہ ہوتا۔ لیکن بارش کو روکنا میرے بس میں نہیں تھا۔''
اللہ بخش بڑی توجہ سے میری بات سن رہا تھا۔ میں خاموش ہوا تو اس نے شکستہ لہجے میں سوال کیا۔ ''آپ کا مطلب ہے اب میری بیٹی کا کوئی سراغ نہیں مل سکتا؟''
اس کے لہجے سے ایک مجبور، ٹوٹے پھوٹے اور چکنا چور باپ کی شکست و ریخت جھلکتی تھی۔ میں نے توانا آواز میں کہا۔ ''میں نے ایسی مایوسی والی تو کوئی بات نہیں کی اللہ بخش!''
وہ امید افزا نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔
میں نے مزید کہا۔ ''تمہاری بیٹی تک رسائی حاصل کرنے کے لئے سراغ تو اب اور بھی واضح ہوگیا ہے۔ ہم اگر چک بتیس پر توجہ مرکوز کر دیں تو ہمیں کامیابی مل سکتی ہے۔''
''چک بتیس؟'' اللہ بخش اچھل پڑا۔ ''یہ تو میرا ہی چک ہے۔ رانی کو بارات میں سے اغوا کر کے وہاں کون اور کیوں پہنچا سکتا ہے؟''
''کیوں کا جواب تو بعد میں بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن کون کا سیدھا سیدھا مطلب ہے تمہارا دشمن!''
''چک بتیس میں مجھ سے ایسی بھیانک دشمنی کون کرے گا؟''
''یہ تو تم ہی بتاؤ گے اللہ بخش!'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''پتہ نہیں آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟'' اس کی الجھن میں اضافہ ہوگیا۔
میں نے اسے خدا بخش، بشارت اور الیاس سے متعلق حاصل ہونے والی رنجشی معلومات سے آگاہ کیا اور آخر میں کہا۔ ''یہ بھی تو ہوسکتا ہے، اس خونی واردات کے پیچھے بشارت یا الیاس کا کوئی ہاتھ ہو۔ اس امکان کو نظر انداز تو نہیں کیا جا سکتا!''
وہ حیرت اور اُلجھن کے ملے جلے تاثرات چہرے پر سجائے خاموش نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا تو میں نے استفسار کیا۔ ''اس سلسلے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''
وہ متاملانہ انداز میں بولا۔ ''تھانے دار صاحب! یہ سچ ہے کہ میں ان باپ بیٹے کو قطعی پسند نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے جب خدیجہ نے رانی اور بشارت کے رشتے کی بات کی تو میں نے صاف انکار کر دیا۔ اس پر خدیجہ کافی دنوں تک مجھ سے ناراض بھی رہی۔ بہر حال میں اپنی ضد پر قائم رہا اور رانی کی شادی اپنے بھتیجے عارف سے کر دی۔''
وہ چند لمحات کے لئے سانس ہموار کرنے کی خاطر رکا پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''رشتے کے اس معاملے پر ظاہر ہے الیاس کو بھی میری ضد سے اچھی خاصی تکلیف پہنچی ہوگی۔ لیکن اس نے کسی قابل ذکر ردِ عمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ہمارے درمیان پہلے بھی علیک سلیک نہیں تھی اس لئے بھی مجھے اس کی ناراضگی کا احساس نہیں ہوا۔ خدیجہ نے الیاس کو رانی کی شادی میں شرکت کی دعوت دی تھی لیکن اس گھر سے ایک بچہ بھی ہماری خوشی میں شریک نہیں ہوا۔ الیاس کا غصہ اور ناراضگی اپنی جگہ لیکن میرا خیال ہے، رشتے کی اس معمولی ''نہ'' پر الیاس یا بشارت اتنا انتہائی قدم نہیں اٹھا سکتے۔''
میں نے اپنے ذہن کی پھانس کے زیر اثر کرید جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''بعض اوقات رشتے ناتوں کے سلسلے میں کوئی معمولی سی بات بھی کسی بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتی ہے۔ اولاد کا معاملہ بہت نازک ہوتا ہے۔ ناک اور انا کے چکر میں خونریز اور سنگین واقعات کو جنم لیتے مَیں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''
اس نے اس حوالے سے الیاس وغیرہ پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔
میں نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔ ''میرا اندازہ ہے، رانی کے رشتے سے انکار کی وجہ سے الیاس کی نسبت بشارت کو زیادہ دکھ اور تکلیف پہنچی ہوگی!''
وہ جز بز ہوا اور ہراساں نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکا!''

PDF LIBRARY 0333-7412793

"مجھے پتہ چلا ہے، بشارت رانی کو پسند کرتا تھا؟" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اس اوباش کا کیا ہے۔" اللہ بخش پھٹ پڑا۔"وہ تو پتہ نہیں رانی کے علاوہ بھی چک کی کتنی لڑکیوں کو گندی نظر سے دیکھتا ہے۔ اسے پسند کرنا تو نہیں کہتے۔" وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر زہریلے انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"بشارت کی ایسی ہی اوچھی حرکتوں کی وجہ سے میں اس سے نفرت کرتا ہوں۔ بیٹی کا رشتہ دینا تو دور کی بات ہے، میں تو ان باپ بیٹے کی شکل تک دیکھنے کا روادار نہیں ہوں۔"

بات کے اختتام پر اس نے ایسا منہ بنایا جیسے اس کے حلق سے کوئی کڑوی کسیلی شے نیچے اتر گئی ہو۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر ہو گیا کہ وہ الیاس اور بشارت کے لئے اپنے دل و دماغ میں کس قدر ناپسندیدگی اور غصہ رکھتا تھا۔

میں نے نہایت ہی محتاط الفاظ میں ایک حساس سوال کیا۔"میری بات کا برا نہیں منانا اللہ بخش! یہ بات میں اس حوالے سے پوچھ رہا ہوں کہ تمہاری بیوی کی خواہش تھی کہ اپنی بیٹی کی شادی بھتیجے سے کر دے۔ اس سلسلے میں ظاہر ہے رانی سے بھی اس کی بات چیت ہوتی ہوگی۔" میں نے تھوڑا توقف کیا پھر نہایت ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں دریافت کیا۔

"کیا رانی بھی بشارت کو پسند کرتی تھی؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" وہ چیخ کر بولا۔ یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے اللہ بخش کے جبڑوں نے ایسے زاویے سے حرکت کی تھی جیسے وہ بشارت کو کچا چبا رہا ہو، پھنکار سے مشابہ آواز میں اس نے کہا۔"میں اپنی بیٹی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ اس قسم کی حماقت کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ بشارت کا کردار کسی سے چھپا ہوا نہیں۔"

میں نے اس کے دعوے کو چیلنج نہیں کیا۔ وہ اس وقت غم و اندوہ کی جس لہر کی لپیٹ میں تھا، وہ اس بات کی متقاضی تھی کہ اللہ بخش کے جذبات اور احساسات کو کم سے کم ٹچ کیا جائے۔ ویسے میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ اولاد کے اس نوعیت کے معاملات کے بارے میں اکثر والدین اندازہ لگانے میں غلطی کر بیٹھتے ہیں اور بعد ازاں ان کا دعویٰ جھوٹا پڑ جاتا ہے۔ خدا ہر صاحب اولاد خصوصاً بیٹیوں والوں کو درست اندازے قائم کرنے کی توفیق عطا فرمائے!

میں نے بات چیت کے زاویے کو تھوڑا تبدیل کرتے ہوئے کہا۔"اللہ بخش! حالات و واقعات اس وقت جو نقشہ ترتیب دے رہے ہیں اس کی حدود و قیود کا تقاضا ہے کہ الیاس

اور بشارت کو اچھی طرح چیک کیا جائے۔"

"آپ چاہے جس کو بھی چیک کریں۔" وہ روہانسی آواز میں بولا۔"کچھ بھی کریں تھانے دار صاحب! لیکن خدارا، کسی طرح میری رانو مجھے واپس لا دیں۔ میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا......"

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں نے اس کے ہاتھ پکڑ لئے اور تسلی آمیز لہجے میں کہا۔"تم فکر نہ کرو اللہ بخش! میں بہت جلد تمہاری بیٹی کو بازیاب کرا لوں گا۔"

پھر میں خدا بخش سے مخاطب ہوا اور کہا۔"تمہارا غم اپنی جگہ لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، تمہارے جوان جہان بیٹے کا قاتل جلد ہی میری گرفت میں ہوگا۔ پھر کوئی اسے سخت ترین سزا سے بچا نہیں سکے گا۔ تم دونوں باہمی تسلی دلاسے سے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔"

وہ منت ریز الفاظ میں بار بار میرا شکریہ ادا کرنے لگے۔

"اللہ بخش!" میں نے دُلہن کے باپ کو مخاطب کرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔"تم واپس جاؤ اور چک بتیس میں رہتے ہوئے اپنی آنکھوں اور کانوں کو کھلا رکھو۔ اگر تمہیں الیاس یا بشارت کے بارے میں کوئی بھی اہم بات معلوم ہو تو فوراً مجھے اطلاع دینا۔ ویسے میں پہلی فرصت میں ادھر کا چکر لگانے والا ہوں۔"

میں نے لحاتی توقف کیا پھر پوچھا۔"کیا وہ دونوں باپ بیٹا اس وقت چک بتیس ہی میں ہیں نا؟"

"مجھے ان کے بارے میں کچھ پتہ نہیں جناب۔" وہ بیزاری سے بولا۔"ان سے میرا میل جول نہیں۔ جس گاؤں نہ جانا ہو، اس کے کوس گننے کا کیا فائدہ!"

میں نے بڑی رسانیت سے کہا۔"اگر تم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تو جاننے کی کوشش کرو۔ اس طرح کوئی مفید بات نکل کر سامنے آئے گی۔ انشاء اللہ جلد ہی چک بتیس میں ہماری ملاقات ہوگی۔"

"میں ذرا چک چوراسی جا کر پہلے اپنی بھابی سے تعزیت کر لوں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔"سلمیٰ کی خیر خیریت بھی دریافت کرنا ہے۔ میں شام تک ہی واپس جا سکوں گا۔"

"اچھی بات ہے......" میں نے یہ کہتے ہوئے انہیں کمرے سے رخصت کر دیا۔

پھر میں نے حوالدار خیبر خان کو اپنے پاس بلایا اور اسے ہدایت کی کہ چک بتیس اور چک چوراسی سے تعلق رکھنے والے جو افراد اس وقت تھانے میں موجود ہیں ان میں سے

PDF LIBRARY 0333-7412793

چھانٹ کر دو چار افراد سے وہ پوچھ گچھ کرے...... اللہ بخش اور خدا بخش کو چھوڑ کر۔ ہوسکتا ہے، کوئی اہم نکتہ ہاتھ آ جائے!

شام سے تھوڑی دیر پہلے اے ایس آئی ظاہر علی واپس آ گیا۔ اس نے چک بتیس کی جو رپورٹ پیش کی اس کے مطابق الیاس اپنے گھر میں موجود تھا مگر بشارت کو پورے چک میں کہیں نہیں دیکھا گیا۔ اس نے مختلف لوگوں سے بشارت کے بارے میں جو معلومات اکٹھا کیں ان کی رو سے بشارت دس اکتوبر کی صبح چک بتیس سے نکل گیا تھا۔ ایک دو افراد نے یہ شک بھی ظاہر کیا کہ بشارت دوپہر میں انہیں چک میں دکھائی دیا تھا تاہم اس سے ان کی بات چیت نہیں ہوئی۔ ظاہر علی نے الیاس کو چھیڑنے کی کوشش نہیں کی تھی اور یہ میری ہی ہدایت کا نتیجہ تھا۔ میں دیکھ بھال کر ان لوگوں پر پکا ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا۔ اگر وہ واقعی ان جرائم میں ملوث تھے تو کچا ہاتھ ڈالنے سے کسی چکنی مچھلی کے مانند ہاتھ سے پھسل بھی سکتے تھے!

دس اکتوبر وہی تاریخ تھی جب چک بتیس میں عارف اور رافعہ کا نکاح ہوا تھا۔ آج گیارہ اکتوبر کا دن تھا۔ عین شادی کے روز بشارت کا کہیں سے چلے جانا ذہن میں بہت سے سوالات کو جنم دیتا تھا۔ یہ بات بھی خاصی چونکا دینے والی تھی کہ آج دوپہر میں وہ چند افراد کو چک میں نظر بھی آیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں میرا فوراً چک بتیس میں جا کر الیاس کو "ٹٹولنا" ضروری ہو گیا۔

اس وقت رات ہو رہی تھی۔ میں نے اگلی صبح ادھر روانہ ہونے کا فیصلہ کیا اور تھانے کے دیگر کاموں میں مصروف ہو گیا۔ سلطان پورہ کی طرف سے کوئی اچھی بری اطلاع ابھی تک موصول نہیں ہوئی تھی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا، وہاں پر "امن و امان" قائم تھا۔ میں نے کانسٹیبل مشکور علی کو ہدایت کر رکھی تھی کہ اگر وہ مہر خاندان کی طرف کوئی خاص سرگرمی دیکھیں تو مجھے مطلع کریں ورنہ اپنے کام سے لگے رہیں۔ ویسے ڈاکوؤں کا جنگل کے جنوبی حصے کی طرف بڑھنا اپنی حقیقت کھول چکا تھا۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگر کل شام تک سلطان پورہ سے اس واردات سے متعلق کوئی سراغ نہیں ملتا تو میں اپنے بندوں کو وہاں سے ہٹا لوں گا۔

٭☆٭

اگلی صبح خاصی مصروف اور ہنگامہ خیز ثابت ہوئی۔

میں معمول کے مطابق تیار ہو کر تھانے پہنچا تو ہسپتال سے مقتول عارف کی پوسٹ

مارٹم شدہ لاش آ گئی۔ لاش کے ساتھ ہی رپورٹ بھی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول دلہا کی موت دس اکتوبر کی رات آٹھ اور دس بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ موت کا سبب دل میں پیوست ہونے والی گولی کو قرار دیا گیا تھا۔ قتل، ڈکیتی اور اغوا والی واردات لگ بھگ نو بجے رات عمل میں آئی تھی۔ دل میں اترنے والی گولی انسان کو زیادہ سانسوں کی مہلت نہیں دیتی۔ میرے اندازے کے مطابق، عارف گولی کھانے کے بعد پانچ دس منٹ میں ٹھنڈا ہو گیا تھا۔

میں نے ضروری کاغذی کارروائی کے بعد دلہا کی لاش ورثا کے حوالے کر دی۔ شادی والا گھر تو پہلے ہی ماتم خانہ بنا ہوا تھا۔ لاش وہاں پہنچی تو ایک کہرام برپا ہو گیا۔ اس بات میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہوسکتی تھی کہ تدفین وغیرہ میں چک بتیس کے لوگ خصوصاً اللہ بخش ضرور شرکت کرنے آئے گا۔ میری معلومات کے مطابق عصر کے بعد جنازہ اٹھایا جاتا۔

میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور حوالدار خیبر خان کے ساتھ چک بتیس روانہ ہو گیا۔

ایک بات کا ذکر کرنا شاید میں بھول گیا ہوں۔ مجھے ہسپتال جا کر ان لوگوں کے بیانات قلم بند کرنے کا موقع بھی ملا جو اس واردات کے نتیجے میں شدید زخمی ہو گئے تھے۔

ان کی ضروری مرہم پٹی کر دی گئی تھی اور اب ان کی حالت خطرے سے باہر تھی۔

حبیب اللہ، عمر دین اور رفیق نے تقریباً ملتا جلتا بیان دیا۔ ان کے مطابق ڈاکو اچانک ہی گھنے جنگل سے برآمد ہو کر بارات پر حملہ آور ہو گئے۔ وہ سب کے سب مسلح تھے۔ کسی نے ان کی آواز سنی اور نہ ہی چہرہ دیکھا۔ انہوں نے سیاہ لباس پہن رکھے تھے اور چہروں پر بھی سیاہ ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے زبان سے ایک لفظ ادا نہ کیا اور بارات پر ہلا بولتے ہی دھواں دھار انداز میں فائرنگ شروع کر دی۔ چند سیکنڈ بعد وہ اپنا کام کر کے گھنے تاریک جنگل میں غائب ہو چکے تھے۔ بارات والوں پر وہ افتاد اتنی اچانک نازل ہوئی کہ ان کی مت ہی ماری گئی تھی۔ جب باراتیوں کے ہوش بجا ہوئے تو صورت حال ان پر آشکار ہوئی مگر اب وقت ان کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔

تینوں زخمیوں سے ایسی کوئی بات پتہ نہ چل سکی جو ڈاکوؤں کی شناخت یا ان تک رسائی کا سبب بن سکتی۔ میں نے خاص طور پر باری باری ان سے یہ سوال کیا کہ ڈاکوؤں نے صرف ان تینوں مسلح افراد کو ہی شدید زخمی کیوں کیا۔ ان کے پاس میرے اس سوال کا جواب نہیں تھا تاہم انہوں نے میری اس بات سے اتفاق ضرور کیا کہ ڈاکوؤں کو یہ

PDF LIBRARY 0333-7412793

اطلاعات تھیں کہ باراتیوں میں کس کس کے پاس آتشیں اسلحہ موجود ہے، زیورات والا صندوق کس بیل گاڑی پر رکھا گیا ہے اور دلہا کس گھوڑے پر، بارات میں کس جگہ موجود ہو گا۔

ان تینوں کے بیانات سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ یہ واردات ایک سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ تھی۔ مجھے اس سازش کے مرکزی کردار تک پہنچنا تھا۔ اگر وہ میرے ہتھے چڑھ جاتا تو پھر دُلہا کا قاتل مجھ سے دور رہتا اور نہ ہی میں دلہن سے دور!

ہم دوپہر سے پہلے چک بتیس پہنچ گئے۔ سب سے پہلے ہم نے اللہ بخش کے گھر کا رخ کیا۔ گزشتہ روز تھانے میں اللہ بخش نے مجھے بتایا تھا، وہ رات تک گھر پہنچ جائے گا۔ قوی امید یہی تھی کہ وہ ہمیں گھر پر مل جائے گا لیکن بعض اوقات قوی امیدیں بھی پانی کا بلبلہ ثابت ہوتی ہیں۔ چک بتیس میں اللہ بخش کے گھر سے معلوم ہوا کہ وہ رات چک چوراسی سے واپس نہیں آیا۔ آج عصر کے بعد عارف کی تدفین تھی لہٰذا آج بھی اس کی واپسی ممکن نظر نہیں آتی تھی۔

میں حوالدار کے ساتھ الیاس کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ الیاس بھی چک بتیس کا رہائشی تھا۔ اس کا گھر تلاش کرنے میں ہمیں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس وقت الیاس اپنے گھر میں موجود تھا۔ اس نے ہمیں گھر کی کشادہ بیٹھک میں بٹھایا۔

اس بیٹھک کی سجاوٹ اور وہاں پر رکھے ہوئے سامان سے اندازہ ہوتا تھا کہ الیاس ایک کھاتا پیتا اور خوشحال شخص تھا۔ منقش کرسیوں کے علاوہ ایک صوفہ سیٹ بھی وہاں رکھا نظر آ رہا تھا۔ دیواروں پر خاندانی بزرگوں کی فریم شدہ تصاویر آویزاں تھیں۔ مغربی دیوار پر کسی شیر یا چیتے کی کھال کو پھیلا کر لٹکایا گیا تھا جس کے نیچے دو شکاری رائفلیں ضرب کا نشان بنا رہی تھیں۔ پتہ نہیں وہ درندہ الیاس کا شکار کردہ تھا یا اس کے آباؤ اجداد میں سے کسی نے یہ کارنامہ انجام دے رکھا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا، دیوار پر آویزاں وہ کھال محض بھرم بازی کا کوئی شاہکار نمونہ ہو۔

ہم اس وقت سرکاری وردی میں تھے لہٰذا الیاس کا ماتھا شکن آلود تھا۔ وہ ہمیں بڑی شرافت سے بیٹھک میں لے آیا تھا مگر اس کے چہرے پر سوالات کا ایک جال سا پھیلا ہوا تھا۔ میں نے اس کی تکلیف دور کرنے کی خاطر اپنا تعارف کروا دیا۔

''میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔ میں اس علاقے کا تھانہ انچارج ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''چک چوراسی، چک بتیس، سلطان پورہ اور شاہکوٹ وغیرہ

میرے تھانے کی حدود ہی میں آتے ہیں۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے خیبر خان کی طرف اشارہ کیا اور کہا ''یہ حوالدار خیبر خان ہے۔''

الیاس نے اٹھ کر ایک مرتبہ پھر مجھ سے مصافحہ کیا لیکن اس کے مصافحے میں وہ گرم جوشی موجود نہیں تھی حالات جس کے متقاضی تھے۔ وہ گونج دار آواز میں بولا۔

''میں نے آپ کا نام تو سن رکھا ہے لیکن روبرو ملاقات پہلی مرتبہ ہو رہی ہے۔'' تھوڑا رک کر اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ بڑے کڑک تھانے دار ہیں!''

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''تم نے ٹھیک ہی سنا ہے۔ میں اصولوں پر سودے بازی نہیں کرتا۔ اپنے فرائض کی بجا آوری میں، میں بڑا سخت ہوں۔''

وہ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ ''بالکل، بالکل ...... یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ایک تھانے دار کو ایسا ہی اصول پرست اور فرض شناس ہونا چاہیے۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔''

اس کا آخری جملہ بالکل کھوکھلا اور بھرتی کا تھا۔ اس کی ادا، کسی تیور سے خوشدلی کا اشارہ نہیں ملتا تھا۔ میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''الیاس! ممکن ہے، اس ملاقات کے آخر میں تمہیں اپنے بیان کو تبدیل کرنا پڑے۔''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ''میں سمجھا نہیں، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''ہو سکتا ہے۔'' میں نے اسے سمجھایا ''جب تمہیں ہماری آمد کی غرض و غایت کا پتہ لگے تو تم یہ کہنے کی توفیق سے محروم ہو چکے ہو...... آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے!''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا تاہم خود کو مضبوط ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''ملک صاحب! آپ بہت الجھی ہوئی اور ڈرانے والی باتیں کر رہے ہیں۔''

''الجھی ہوئی ہر بات کی تو میں وضاحت کر دوں گا۔'' میں نے بدستور اس کے چہرے پر نگاہ جمائے رکھی۔ ''لیکن اگر تم نے کوئی غلط نہیں کی تو پھر مجھ سے ڈرنے کی قطعی ضرورت نہیں۔ میں صرف مجرموں کے ساتھ سختی برتتا ہوں۔ شریف النفس اور امن پسند لوگوں کے ساتھ میں محبت اور نرمی کا برتاؤ کرتا ہوں اور اگر ان میں سے کوئی تھانے آ جائے تو میں بصد احترام اسے بیٹھنے کے لئے کرسی بھی پیش کرتا ہوں۔''

PDF LIBRARY 0333-7412793

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔ ایک لمحے کے لئے اس نے متاملانہ انداز میں مجھے دیکھا پھر اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ لوگوں کے لئے چائے پانی کا بندوبست کرتا ہوں۔ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔“

”اس بندوبست کی کوئی ضرورت نہیں الیاس!“ میں نے قدرے بلند اور حتمی لہجے میں کہا۔ ”ہم یہاں تم سے خاطر تواضع کرانے نہیں بلکہ تم سے دوٹوک بات کرنے آئے ہیں لہٰذا چپ چاپ بیٹھے رہو اور میں جو سوال کروں اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دو۔“

میرے لہجے میں ٹپکتی سنگینی کو اس نے پوری وضاحت سے محسوس کیا۔ وہ کھٹک سے وہیں بیٹھ گیا جہاں سے اٹھا تھا پھر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے برہمی سے بولا۔

”جی فرمائیں تھانے دار صاحب! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

میں نے فی الفور اندازہ لگایا، اسے میرا اسٹائل پسند نہیں آیا تھا لیکن مجھے اس کی پسند یا ناپسند کی قطعی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ میں نے نہایت ہی مختصر، موثر اور پائیدار الفاظ میں اسے اپنی آمد کے مقصد سے آگاہ کر دیا۔ پوری بات سنتے ہی وہ بھڑک اٹھا۔

”کیا...... آپ ......ہمیں اس واردات کا ...... ذمے دار ٹھہرا رہے ہیں؟“

”میں نے وہ حقیقت بیان کی ہے، حالات جس سمت اشارہ کر رہے ہیں۔“ میں نے خالص تھانے دارانہ انداز میں کہا۔ ”اللہ بخش اور تمہارے درمیان پائی جانے والی رنجش کسی سے ڈھکی چھپی نہیں پھر رانی کے رشتے سے انکار کے بعد تو اللہ بخش کے لئے تمارے دل میں موجود نفرت اور بھی بڑھ گئی ہو گی لہٰذا............“

”سب بکواس ہے۔“ وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی طیش کے عالم میں بولا۔ ”انکار تو اس وقت ہوتا اگر میں اس گھر میں اپنے بیٹے کا رشتہ لگاتا۔ وہ تو میری معصوم بہن کی ایک خواہش تھی جسے اس سنگ دل شخص نے اپنے قدموں تلے روند ڈالا۔“

سنگ دل شخص سے اس کی مراد اللہ بخش تھی۔ اللہ بخش کے لئے اس کے ایک ایک لفظ سے زہر کی بوندیں ٹپکتی تھیں۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ وہ اللہ بخش سے شدید نفرت کرتا تھا۔ اس کا ذکر سنتے ہی وہ جس طرح چراغ پا ہوا وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا غیظ و غضب بقول اس کے، ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔

”آپ خواہ مخواہ مجھے اور میرے بیٹے کو ایک جھوٹے کیس میں پھنسانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ وہ پاؤں پٹختے ہوئے بولا۔ ”عارف کے قتل یا رافعہ کے اغوا سے ہمارا کوئی تعلق واسطہ نہیں بلکہ......“ وہ لمحے بھر کو خاموش ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بھاری آواز

میں بولا۔

”بلکہ مجھے اس واقعے کا دلی افسوس ہوا ہے۔ اللہ بخش سے اختلافات رہے ایک طرف مگر یہ میری بہن کی بیٹی کا بھی معاملہ ہے۔ میری خواہش ہے، رانی جلد از جلد بازیاب ہو جائے۔ بشارت اسی سلسلے میں گھر سے نکلا ہوا ہے۔“

الیاس کے آخری جملے نے مجھے اچھلنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اضطراری انداز میں سوال کیا۔ ”بشارت کہاں گیا ہوا ہے؟“

”میں نے بتایا ہے نا، وہ رانی کی تلاش میں نکلا ہوا ہے۔“

”کب ...... کدھر......؟“ بے ساختہ میری زبان سے خارج ہوا۔

الیاس نے جواب دیا۔ ”کدھر کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ یہ ضرور بتا سکتا ہوں وہ گیارہ اکتوبر کی دوپہر کو یہاں سے روانہ ہوا ہے اور آج بارہ اکتوبر ہے۔ اسے گئے ہوئے لگ بھگ چوبیس گھنٹے گزر گئے ہیں۔ اب تو مجھے اس کی طرف سے بھی فکر ہونے لگی ہے۔ وہ گلے میں بندوق لٹکا کر اور گھوڑے پر سوار ہو کر گھر سے نکلا تھا۔ اللہ اسے محفوظ رکھے۔“

ایک لمحے کو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے الیاس مجھے چکر دینے کی کوشش کر رہا ہو۔ اے ایس آئی نے مجھے بشارت کے بارے میں جو رپورٹ دی تھی اس کے مطابق وہ دس اکتوبر کی صبح چک بتیس سے نکلا تھا پھر گیارہ اکتوبر کی دوپہر اسے دوبارہ مذکورہ چک میں دیکھا گیا۔ اس کے بعد سے وہ اب تک غائب تھا۔ میں نے الیاس کو گھسنے کے لئے نکیلے لہجے میں دریافت کیا۔

”تمہارے بیان کے مطابق وہ گزشتہ روز دوپہر کے وقت رانی کو ڈھونڈنے کے لئے گھوڑے پر سوار ہو کر گھر سے نکلا تھا۔ اس سے پہلے وہ کہاں تھا؟“

”اس سے پہلے؟“ وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، اس سے پہلے؟ میری معلومات کے مطابق تمہارا بیٹا بشارت دس اکتوبر کی صبح چک بتیس سے نکلا تھا اور اس کی واپسی گیارہ اکتوبر کی دوپہر کو ہوئی تھی۔ بتاؤ اس دوران میں وہ چک سے باہر کیوں رہا؟“

”اوہ! آپ یہ پوچھ رہے ہیں۔“ وہ ایک طویل اور اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ اقبال نگر گیا تھا ایک دن کے لئے۔“

اقبال نگر چک بتیس سے کوئی پندرہ سولہ میل دور مغرب میں واقع تھا۔ یہ علاقہ میرے

PDF LIBRARY 0333-7412793

تھانے کی حدود سے باہر تھا۔ میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اپنے سامنے بیٹھے الیاس کو دیکھا اور سنسناتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''بشارت، اقبال نگر کیا لینے گیا تھا؟''

''وہاں میری بڑی بیٹی رہتی ہے۔'' الیاس نے بتایا ''وہ اپنی آپا سے ملنے گیا تھا۔ کل دوپہر کو جب وہ واپس آیا تو اسے بارات کو پیش آنے والے واقعے کی خبر ہوئی۔ اس کی سانس چڑھ گئی اور دماغ سنسنانے لگا۔ مجھ سے بولا ''ابا! رشتہ جڑنا اور ٹوٹنا تو نصیب کی بات ہے۔ اگر رانی کی شادی مجھ سے نہیں ہو سکی تو کیا ہوا وہ میری پھوپی کی بیٹی تو ہے نا۔ ڈاکو زبردستی اسے بیوہ کر کے اٹھالے گئے ہیں۔ میں چوڑیاں پہن کر گھر میں نہیں بیٹھ سکتا۔ ابا! آپ کا اور پھوپھا کا جو جھگڑا ہے وہ آپ بعد میں نمٹاتے رہنا۔ میں تو چلا۔'' یہاں تک پہنچ کر اس نے لمحے بھر کی خاموشی اختیار کی پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فخریہ لہجے میں بولا۔

''میں نے بشارت کو جانے سے نہیں روکا۔ اس کے جذبے نے مجھے متاثر کیا تھا۔ جوانی میں، میں بھی ایسا ہی نڈر، ولولہ انگیز اور پرعزم ہوا کرتا تھا۔'' اس نے ایک نظر دیوار پر ٹنگی چیتے کی کھال اور رائفلوں کو دیکھا اور بولا۔ ''بہادری اور شجاعت ہمارا خاندانی طرۂ امتیاز ہے۔ اللہ میرے بیٹے کی حفاظت کرے۔''

الیاس نے بشارت کے حوالے سے جو کچھ بتایا تھا اگر وہ مبنی برحقیقت تھا تو واقعی اس نوجوان کا جذبہ قابل صد ستائش تھا۔ میں چند لمحات تک کھوجتی ہوئی نظر سے اسے دیکھتا رہا پھر نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''الیاس! تم یہ نہ سمجھنا میں آنکھیں بند کر کے تمہاری کہانی پر یقین کر لوں گا۔''

وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''خیر سے بشارت گھر آ جائے آپ خود اس کی زبانی یہ کہانی سن لینا۔''

''وہ تو میں سنوں گا ہی۔'' میں نے کہا ''لیکن بشارت کی واپسی سے پہلے میں اقبال نگر جا کر اس بات کی تصدیق ضرور کروں گا کہ تمہارا بیٹا وہاں اپنی آپا سے ملنے گیا تھا یا نہیں اور اپنی بیٹی اور داماد کا نام پتا تم مجھے دو گے؟''

''ضرور...... ضرور۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور میری مطلوبہ معلومات فراہم کر دیں۔

الیاس کی بڑی بیٹی نازو اور اس کا شوہر طفیل اقبال نگر کے مشرقی حصے میں رہائش پذیر

میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا۔'' وہ بے ساختہ بولا۔

میں نے کہا۔ ''الیاس! تم اچھے بھلے سیانے، سمجھدار آدمی ہو۔ ہم دوسروں کی کہی ہوئی بات کو بغیر پرکھے سچ نہیں مان سکتے۔ قانون کے اپنے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ ہمیں کاغذات کا پیٹ بھرنے کے علاوہ اوپر بھی جواب دینا ہوتا ہے۔''

میں یہ تمام تر باتیں ایک خاص منصوبے کے تحت کر رہا تھا۔ یہ گویا شکار کی ہوئی مچھلی کو تلنے سے پہلے مصالحہ لگانے کے مترادف تھا۔ میں نے اس کی باتوں سے یہ اندازہ تو لگا لیا کہ وہ بیٹے کے جھوٹ سے واقف نہیں تھا۔ بشارت نے اسے یہی بتایا ہو گا کہ دس اکتوبر کو اقبال نگر جا رہا تھا۔ وہ اس جھوٹ کی آڑ میں کیا کیا تماشے دکھاتا رہا تھا یہ جاننے کے

اسے مطمئن کرنا بھی ضروری تھا تاکہ بنا بنایا کھیل کسی مرحلے پر بگڑ نہ جائے۔

سے باہر نکل
ری معروضات کے جواب میں کہا۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں ملک صاحب!

''ملک صاحب
مجبوریوں کو سمجھ سکتا ہوں۔ آپ ہماری طرف سے بے فکر ہو جائیں۔

آتے ہوئے کہا۔
۔ میری دلی خواہش ہے کہ رانی جلد از جلد بازیاب ہو جائے۔

''اقبال نگر!'' میں
والے یا پولیس، اس سے کیا فرق پڑتا ہے!''

ٹھیک دس منٹ بعد ہم
تا۔'' میں نے اس کی سوچ پر بے خبری کے اطمینان کی ایک

مغرب میں اقبال نگر کو لے جا
بشارت واپس آ جائے تو تم فوراً اسے میرے پاس لے

فاصلہ حائل تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم
اور تلاش ہماری تفتیش کے لئے معاون ثابت ہو!''

میں سیدھا اس علاقے کے تھانے
گیا تو میں اس سے پُر جوش مصافحہ کرنے کے بعد

ساتھ صورت حال سے آگاہ کیا۔ تھانہ انچا
واپسی کے راستے میں دور کر دی تو وہ شانت

اچھی یاد اللہ تھی۔

وہ بولا۔ ''ڈاکوؤں والی اس واردات کے بارے
نگ کی ہے!'' وہ تعریفی نظر سے میری

سن گن تو ملی تھی مگر تفصیل آپ نے بتائی ہے تو اس
سے جو کچھ ہو سکا وہ ضرور کروں گا ملک صاحب! آپ
ی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

''راجپوت صاحب! شرمندہ نہ کریں۔'' میں
کاروں پر مشتمل تین پولیس پارٹیاں

جواب میں عاجزی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''بس میں
قے میں پھیل جانے کا حکم دیا۔ اگر

بشارت دس اکتوبر کو اقبال نگر میں اپنی بہن کے گھر آیا تھا
کے بارے میں جانتا تھا اور یہ

وہ معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ ک
ڑا جائے۔ میں نے اگلی صبح اسے

نہیں۔ میں اپنے عملے کے ایک ہوشیار اہلکار سے آپ ک

PDF LIBRARY 0333-7412793

تھانے کی حدود سے باہر تھا۔ میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اپنے سامنے بیٹھے الیاس کو دیکھا اور سنسناتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''بشارت، اقبال نگر کیا لینے گیا تھا؟''

''وہاں میری بڑی بیٹی رہتی ہے۔'' الیاس نے بتایا ''وہ اپنی آپا سے ملنے گیا تھا۔ کل دوپہر کو جب وہ واپس آیا تو اسے بارات کو پیش آنے والے واقعے کی خبر ہوئی۔ اس کی سانس چڑھ گئی اور دماغ سنسنانے لگا۔ مجھ سے بولا ''ابا! رشتہ جڑنا اور ٹوٹنا تو نصیب کی بات ہے۔ اگر رانی کی شادی مجھ سے نہیں ہوسکی تو کیا ہوا وہ میری پھوپی کی بیٹی تو ہے نا۔ ڈاکو زبردستی اسے بیوہ کر کے اٹھا لے گئے ہیں۔ میں چوڑیاں پہن کر گھر میں نہیں بیٹھ سکتا۔ ابا! آپ کا اور پھوپھا کا جو جھگڑا ہے وہ آپ بعد میں نمٹاتے رہنا۔ میں تو چلا۔'' ما ل کر کے پہنچ کر اس نے لمحے بھر کی خاموشی اختیار کی پھر بات کو آگے بڑھاتے ہو ن تیز تھیں۔ بشارت بولا۔

''میں نے بشارت کو جانے سے نہیں روکا۔ اس کے جذبے نے اطلاع لانے والے جوانی میں، میں بھی ایسا ہی نڈر، ولولہ انگیز اور پرعزم ہوا کرتا تھ
پر ٹنگی چیتے کی کھال اور رائفلوں کو دیکھا اور بولا۔ ''بہادری ہ آنے جناب!''
امتیاز ہے۔ اللہ میرے بیٹے کی حفاظت کرے۔'' ہ ہے اس بشارت نامی بندے کا اس
الیاس نے بشارت کے حوالے سے جو کچھ بتایا تھ
نوجوان کا جذبہ قابل صد ستائش تھا۔ میں چند لمحوں کا جھوٹ پکڑے جانے کے بعد میرا شک
پھر نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ن ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس وقت ذہن تیز
''الیاس! تم یہ نہ سمجھنا میں آنکھیں بند میں مصروف تھا۔
وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''خیر سے ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں تو لڑکی برآمد کرائی جا
سن لینا۔'' رے ہوئے بامعنی انداز میں کہا۔
''وہ تو میں سنوں گا ہی۔'' میں ۔صاحب!'' یہ کہتے ہوئے میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
جا کر اس بات کی تصدیق ضرور کرپی کے سفر کے لئے تھانے سے رخصت ہو رہے تھے۔
اور اپنی بیٹی اور داماد کا نام پتا تم مجزار تھا، ہمیں واپس چک بتیس جا کر الیاس کو اس جھوٹ پر
''ضرور ...... ضرور۔'' اس ۔ ، میں قدرے مختلف انداز میں سوچ رہا تھا۔ ہم چک بتیس گئے
دیں۔ دوستانہ انداز میں الیاس کو جا کر بتایا کہ اقبال نگر سے میں نے
الیاس کی بڑی بیٹی نازو اور لی ہے۔

میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا۔'' وہ بے ساختہ بولا۔

میں نے کہا۔ ''الیاس! تم اچھے بھلے سیانے، سمجھدار آدمی ہو۔ ہم دوسروں کی کہی ہوئی بات کو بغیر پرکھے سچ نہیں مان سکتے۔ قانون کے اپنے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ ہمیں کاغذات کا پیٹ بھرنے کے علاوہ اوپر بھی جواب دینا ہوتا ہے۔''

میں یہ تمام تر باتیں ایک خاص منصوبے کے تحت کر رہا تھا۔ یہ گویا شکار کی ہوئی مچھلی کو تلنے سے پہلے مصالحہ لگانے کے مترادف تھا۔ میں نے اس کی باتوں سے یہ اندازہ تو لگا لیا کہ وہ بیٹے کے جھوٹ سے واقف نہیں تھا۔ بشارت نے اسے یہی بتایا ہوگا کہ دس اکتوبر کو وہ اقبال نگر جا رہا تھا۔ وہ اس جھوٹ کی آڑ میں کیا کیا تماشے دکھاتا رہا تھا یہ جاننے کے لئے الیاس کو مطمئن کرنا بھی ضروری تھا تاکہ بنا بنایا کھیل کسی مرحلے پر بگڑ نہ جائے۔

اس نے میری معروضات کے جواب میں کہا۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں ملک صاحب! میں آپ کی محکمہ جاتی مجبوریوں کو سمجھ سکتا ہوں۔ آپ ہماری طرف سے بے فکر ہو جائیں۔ ہمارے ہاتھ صاف ہیں۔ میری دلی خواہش ہے کہ رانی جلد از جلد بازیاب ہو جائے۔ چاہے بشارت اسے ڈھونڈ نکالے یا پولیس، اس سے کیا فرق پڑتا ہے!''

''واقعی، کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' میں نے اس کی سوچ پر بے خبری کے اطمینان کی ایک اور تہہ چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اگر بشارت واپس آ جائے تو تم فوراً اسے میرے پاس لے آنا۔ ہوسکتا ہے، اس کی جنگل نوردی اور تلاش ہماری تفتیش کے لئے معاون ثابت ہو!''

وہ پوری طرح میرے شیشے میں اتر گیا تو میں اس سے پُرجوش مصافحہ کرنے کے بعد وہاں سے چلا آیا۔ حوالدار کی اُلجھن میں نے واپسی کے راستے میں دور کر دی تو وہ شانت ہو گیا۔

''ملک صاحب! آپ نے بڑی زبردست پلاننگ کی ہے!'' وہ تعریفی نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے جواب میں کچھ نہ کہا۔ اس وقت میں گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

اسی شام واپس تھانے پہنچ کر میں نے چار چار اہلکاروں پر مشتمل تین پولیس پارٹیاں ترتیب دیں اور انہیں بشارت کی تلاش میں پورے علاقے میں پھیل جانے کا حکم دیا۔ اگر ڈاکوؤں والی واردات میں بشارت ملوث تھا تو پھر وہ رانی کے بارے میں جانتا تھا اور یہ بھی ضروری تھا کہ اسے علاقے سے باہر نکل کر بھی ڈھونڈا جائے۔ میں نے اگلی صبح اسے ڈھونڈنے کا انتظام کر لیا۔

PDF LIBRARY 0333-7412793

تیرہ اکتوبر کا پورا دن کسی اچھی خبر کے انتظار میں گزر گیا۔ بشارت اور رانی کا کوئی سراغ ہاتھ نہ آیا۔ گزشتہ روز عصر کے بعد عارف کی تدفین ہو گئی تھی اور چک بتیس والوں میں سے اکثر کل شام اور کچھ آج صبح واپس چلے گئے تھے۔ جاتے وقت اللہ بخش تھانے آ کر مجھ سے ملا تھا۔ میں نے اقبال نگر والے معاملے سے اسے بے خبر رکھتے ہوئے تسلی تشفی دے کر رخصت کر دیا۔

آئندہ روز یعنی چودہ اکتوبر کو ایک حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین خبر سننے کو ملی۔ میں اس وقت اپنے کمرے میں بیٹھا رانی کے اغوا کی ڈور کو سوچ بچار کی انگلیوں سے سلجھانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ حوالدار نے اندر آ کر اطلاع کی۔

''ملک صاحب! چک بتیس سے الیاس اور اس کا بیٹا بشارت آپ سے ملنے آئے ہیں۔''

حوالدار کے انداز سے دبا دبا جوش جھلکتا تھا۔ میں اسے اپنی پلاننگ سے اچھی طرح آگاہ کر چکا تھا لہٰذا کسی بریفنگ کی مزید ضرورت نہیں تھی۔ میں نے آنکھ دبا کر مخصوص انداز میں اشارہ دیا اور کہا۔ ''ٹھیک ہے...... انہیں میرے پاس بھیج دو۔''

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں باپ بیٹا میرے سامنے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ حوالدار خیبر انہیں کمرے میں پہنچانے کے بعد بشارت کے عقب میں مستعد کھڑا ہو گیا تو میں ان کی طرف متوجہ ہوا۔

الیاس نے بڑے فخریہ انداز میں مجھے اپنے بیٹے کے کارنامے سے آگاہ کیا جس کے مطابق بشارت تلاش بسیار کے بعد رانی کو ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ معلومات انکشاف انگیز ہونے کے ساتھ ہی تہلکہ خیز بھی تھیں لیکن میں نے اپنی حرکات و سکنات سے کسی قسم کا اضطرار ظاہر نہ ہونے دیا اور گمبھیر لہجے میں بشارت سے پوچھا۔

''رانی اب کہاں ہے؟''

وہ توقع کر رہے ہوں گے، میں ان سے دریافت کروں گا رانی اسے کہاں سے ملی۔ میرے اس غیر متوقع سوال نے بشارت کو گڑبڑا دیا۔ وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔ ''وہ...... وہ اپنے گھر میں ہے۔ میرا مطلب ہے، پھپھو خدیجہ کے پاس ہے......''

میں اس دوران میں گہری نظر سے بشارت کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی عمر چھبیس سال کے قریب رہی ہو گی۔ آنکھوں سے مکاری مترشح تھی۔ صحت قابلِ رشک اور انداز لفنگوں جیسا۔ وہ بڑی سرعت سے آنکھیں گھمانے کا عادی تھا۔

میں نے سہلانے والے انداز میں کہا۔ ''برخوردار! ڈاکوؤں کے چنگل سے رانی کو چھڑانے کے لئے تمہیں اپنی جان کو جوکھوں میں ڈالنا پڑا ہو گا۔ تمہیں زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں؟''

''نہیں جناب! آپ کی دعا سے میں صحیح سلامت یہاں بیٹھا ہوں۔'' وہ عیاری سے بولا۔ ''ڈاکو بہت بزدل ثابت ہوئے۔ میں نے ہوائی فائرنگ کر کے انہیں ایسا دہشت زدہ کیا کہ وہ جدھر منہ اٹھا، فرار ہو گئے۔ میں رانی کو اپنے گھوڑے پر بٹھا کر چک بتیس لے آیا ہوں۔ خدیجہ پھپھو اور پھوپھا اللہ بخش بہت خوش ہیں۔''

میں نے اس کی فریبی باتوں کے جواب میں سخت لہجے میں کہا۔ ''تم ڈاکوؤں کے پاس سے تو صحیح سلامت لوٹ آئے ہو لیکن یہاں جو کچھ تمہارے ساتھ ہونے والا ہے، مجھے نہیں امید کہ اس کے بعد تم سلامت رہ سکو...... کیونکہ یہاں ہوائی نہیں بلکہ بالکل اوریجنل چھترول ہو گی۔''

''یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب؟'' الیاس جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ کو تو چاہیے، بشارت کو کوئی انعام شام دیں مگر......''

''مجھے تھانے داری سکھانے کی کوشش مت کرو الیاس!'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی گرج کر کہا۔ ''تم خاموش بیٹھو، ورنہ اس بدمعاش کے ساتھ تم بھی سوکھے رگڑے جاؤ گے۔''

باپ کی توہین ہوتے دیکھ کر بشارت تلملا اٹھا۔ ''آپ نے ہمیں سمجھ کیا رکھا ہے؟''

''ابھی بتاتا ہوں......'' اتنا کہہ کر میں نے حوالدار کو اشارہ کر دیا۔

خیبر خان بشارت کے عقب میں چھا کر کھڑا ہو گیا۔ اس صورتِ حال اور میرے بدلے ہوئے تیوروں نے اسے بتا دیا کہ کوئی بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ وہ چوکنا نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا انداز فرار ہونے والا تھا مگر اس کے عقب میں موجود حوالدار نے پلک جھپکتے میں آگے بڑھ کر اس کی گردن میں اپنے بازو کی قینچی ڈال دی۔

میں نے کڑک کر کہا۔ ''یہیں کھڑے کھڑے شرافت سے سچ اُگلو گے یا تمہیں ٹرائل روم کی سیر کرائی جائے؟''

''مم...... میں نے کون سا جھوٹ بولا ہے؟'' وہ منمنایا۔ حوالدار کے بازو کی گرفت کسی شکنجے سے کم نہیں تھی۔

PDF LIBRARY 0333-7412793

میں نے رعب دار آواز میں پوچھا۔ ''تم نے جو بھی جھوٹ بولا ہے اسے نبھانا نہیں آیا۔ بتاؤ، دس اکتوبر کی صبح سے لے کر گیارہ اکتوبر کی دوپہر تک تم کہاں تھے؟'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اسی درشتی سے اضافہ کیا۔ ''گیارہ اکتوبر کی دوپہر سے اب تک کے ایڈونچر کا حساب کتاب بعد میں کریں گے۔''

''آپ میری بات کا یقین کریں......'' وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ ''مم...... میں اقبال نگر......'' اس سے آگے وہ کچھ نہ بول سکا۔ خیبر خان نے اپنی فولادی گرفت میں مزید سختی بھر دی تھی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''خیبر خان! یہ شرافت کی زبان نہیں سمجھے گا۔ ٹرائل دینے یہ یہاں تک آ ہی گیا ہے تو ذرا اس کا آڈیشن بھی لے لو۔ اسے پوری طرح پتہ چلنا چاہئے، ہمارے ٹرائل روم میں کسی شے کی کمی نہیں۔ یہ ایک ایسا اسٹوڈیو ہے، جہاں آڈیشن کے شوقین افراد کی خاص اور کچے چمڑے کے، نو بائی چار سائز چھتر سے کیسی دھلائی کی جاتی ہے۔ یہ ہوائی فائرنگ سے ڈاکوؤں کے گروہ کو دہشت زدہ کر کے آیا ہے۔ ذرا بتاؤ اسے، اصلی دہشت کس پرندے کا نام ہے۔ اس ہیرو کا شاندار استقبال ہونا چاہئے۔ کیا سمجھے؟''

''سمجھ گیا سرکار!'' حوالدار معنی خیز انداز میں مسکرایا اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے وہ بشارت کو اپنے ساتھ لے گیا۔

اس کے جانے کے بعد الیاس کسی چھلاوے کی طرح اچھلنے لگا۔ وہ غصیلے انداز میں بار بار ایک ہی جملے کی تکرار کر رہا تھا۔ ''آپ نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا ہے...... جھوٹ بول کر ہمیں پھنسایا ہے۔''

''زیادہ شور مچانے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے اسے ایک دبکا مارا۔ ''جھوٹ میں نے نہیں بلکہ تمہارے اس بدبخت بیٹے نے بولا ہے...... نہ صرف قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی بلکہ تم سے بھی غلط بیانی کی ہے۔ یہ مردود دس اکتوبر کو اقبال نگر ہرگز ہرگز نہیں گیا۔ اس نے تو پچھلے ایک ماہ سے ادھر کا رخ بھی نہیں کیا۔ آئی سمجھ میں بات؟ میں نے بڑی پکی تصدیق کر لی ہے!''

''لیکن اس نے تو مجھے بتایا تھا......'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر پریشان نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

''اس نے تم سے جھوٹ بولا ہے...... بکواس کی ہے۔'' میں نے تیز آواز میں کہا۔

وہ ہونقوں کی طرح میرا منہ تکنے لگا۔ ''اگر بشارت اقبال نگر نہیں گیا تو پھر کہاں غائب

تھا؟''

''اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے ہی تو میں نے اسے ٹرائل روم میں بھیجا ہے!'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''تمہیں یہ معلوم ہی ہو گا، وہاں تو پتھر بھی بولنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔''

سوڈا واٹر کی طرح اُبلنے والا الیاس پلک جھپکتے میں جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس کی ساری اکڑفوں غائب ہو گئی۔ میرے الفاظ کی سنگینی نے اسے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

بشارت کی زبان کھلوانے کے لئے حوالدار کو اچھی خاصی محنت کرنا پڑی لیکن بہرحال یہ محنت ''رنگ'' لے آئی اور اگلی صبح طلوع ہونے سے پہلے اس نے اپنے کارنامے کا احوال تفصیل سے بیان کر دیا۔

واردات کا اصل ذمہ دار بشارت ہی تھا۔ تاہم کچھ اور کریکٹرز بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ اس نے رانی کو حاصل کرنے کے لئے ایک انوکھی راہ اپنائی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لیکن سیدھی راہ سے ان کا ملاپ ممکن نظر نہیں آتا تھا لہٰذا انہوں نے ایک تیسرے کردار کی مدد سے بھرپور ڈرامہ رچایا۔ مذکورہ تیسرا کردار تھا، رانی کی چھوٹی خالہ اور بشارت کی پھوپھی سلمٰی۔

سلمٰی نے ان کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔ پھر تینوں کے درمیان لائحہ عمل تیار ہوا۔ اس منصوبے کو نہایت ہی خفیہ رکھا گیا۔ سلمٰی شاہکوٹ میں اپنے ایب نارمل بیٹے منظور جھلا کے ساتھ رہتی تھی۔ شادی کے سلسلے میں وہ دس دن پہلے ہی چک بتیس آ گئی اور گھر کی چابیاں بشارت کو دے دیں کہ وہ ایک دو روز رانی کو وہاں ٹھہرائے، بعد میں اس کی تلاش میں نکلے اور اسے برآمد کر کے سامنے لے آئے۔ اس کا یہ کارنامہ سب کو متاثر کرے گا۔ خصوصاً اس کے بڑے اللہ بخش کا دل ضرور پگھلے گا اور وہ ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔ سلمٰی کو چونکہ شادی کے بعد بھی چند روز چک بتیس میں رکنا تھا اس لئے یہ منصوبہ نبھ جاتا۔

اب مسئلہ رانی کو بھری بارات میں سے نکالنا تھا۔ بشارت نے اس سلسلے میں پانچ ڈاکوؤں کی خدمات حاصل کیں، چھٹا وہ خود ان میں شامل ہو گیا۔ ڈاکوؤں کو اس نے چار ہزار روپے اور زیورات وغیرہ پر راضی کیا۔ اس زمانے میں چار ہزار روپے کی بڑی اہمیت ہوتی تھی۔ اسّی نوے روپے تولہ سونا مل جاتا تھا۔ بشارت کا منصوبہ تکمیل کے آخری مراحل میں تھا کہ اقبال نگر والا اس کا جھوٹ پکڑے جانے سے سب کچھ خاک میں مل گیا۔

PDF LIBRARY 0333-7412793

میرے ایک سوال کے جواب میں اس نے بتایا کہ دُلہا کا قتل ان کے پروگرام کا حصہ نہیں تھا مگر ایک ڈاکو کی جلد بازی سے وہ مارا گیا۔ عارف کے قتل کا الزام اس نے ایک ڈاکو کے سر ڈال دیا۔ میں نے ڈاکوؤں کی گرفتاری کے سلسلے میں اس پر دباؤ ڈالا تو وہ کوئی رہنمائی نہ کر سکا۔ اس سازش میں بشارت، رانی اور سلمٰی برابر کی شریک تھیں لیکن تینوں کے جرائم کی نوعیت مختلف تھی لہٰذا میں نے ضابطے کی کارروائی مکمل کر کے انہیں حوالۂ عدالت کر دیا۔

کچھ عرصے تک ان پر کیس چلتا رہا اور پھر عدالت نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ میں آپ کو یہ نہیں بتاؤں گا کہ عدالت نے اس کیس میں انہیں کیا سزا سنائی۔ آپ اپنے ذہن کو زحمت دیں اور عدالتی فیصلے تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ مجھے امید ہے، آپ کامیاب ہو جائیں گے۔

مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ دلوں میں پسندیدگی کے جذبات رکھنے [illegible] اپنے لیے کوئی ایسی منفی راہ نہیں اپنانی چاہیۓ کہ بھیانک انجام سے دوچار ہونا پڑے۔ کیونکہ ایسی تاریک راہ میں کوئی میٹھی چھری بڑے غیر محسوس انداز میں اپنا کردار ادا کر کے پچھتاوے کے عمیق غار میں پھینک کر چلی جاتی ہے۔

رانی اور بشارت کے کیس میں سلمٰی نے میٹھی چھری کا کردار ادا کیا تھا۔

(ختم شد)

PDF LIBRARY 0333-7412793